رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۱۱ [illegible]

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم، بی - اے

جلد (۵۳) جولائی سنہ ۱۹۲۹ء نمبر (۱)

فہرست مضامین

تصاویر: مسٹر رامسے میکڈانلڈ وزیر اعظم انگلستان۔ مسٹر ویجوڈ بن وزیر ہند - لارڈ اروِن وائسرائے ہند جسٹس گوکرن ناتھ مرحوم مہاراجہ رامیشر سنگھ صاحب مرحوم والی ریاست دربھنگا۔

۱۔ عرب کے علوم و فنون
از مولانا عبدالرزاق صاحب کانپوری ۱

۲۔ جنگ کربلا
از مسٹر ہری کرشن۔ سی۔ ٹی۔ آر۔ اے ۲۱

۳۔ محب
از سید احمد اللہ قادری (حیدرآبادی) ۳۰

۴۔ حضرت قائم چاندپوری
از جناب راز چاندپوری ۳۶

۵۔ کرشن کی مایا (افسانہ)
از منشی بھگوت سروپ ۴۰

۶۔ رباعیات
از مولانا صفی لکھنوی .. .. .. [illegible]

۷۔ آزادئ ادب .. ..
از ابوالکمال سید عبدالودود بریلوی مرحوم .. [illegible]

۸۔ کرمک شب تاب
از منشی شیام سنگھ بجنوری .. .. [illegible]

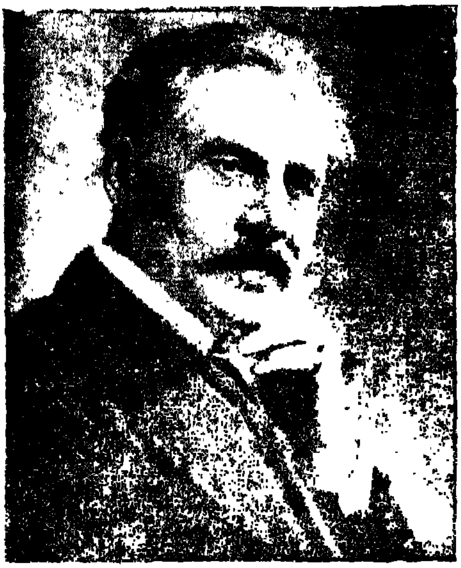
۹۔ ترانۂ وطن
از حضرت روش صدیقی .. .. .. [illegible]

۱۰۔ نکات شکسپیر
از منشی تلوک چند محروم .. .. .. [illegible]

۱۱۔ علمی خبریں اور نوٹ .. .. .. [illegible]

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت ممالک غیر سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کے لئے ششماہی ...



ممالک برطانیہ کے لیڈر، سلطنت عظمیٰ کے وزیراعظم
مسٹر رمزے میکڈانلڈ



مسٹر ایل ایس ایمری وزیر هند



لارڈ لنلتھگو وائسرائے هند

زمانہ

جلد ۵۳ جولائی ۱۹۲۹ء نمبر ۱

عہدِ جاہلیت میں عرب کے علوم و فنون

۱- فلکیات

از مولانا محمد عبد الرزاق صاحب کانپوری مصنفِ البرامکہ

ادب، تاریخ، جغرافیہ، اور علم الانساب کے علاوہ عہدِ جاہلیت میں عقلی علوم و فنون بھی عرب میں موجود تھے، جن میں ایک فلکیات بھی ہے اور فلکیات سے وہ علوم مراد ہیں جنکا تعلق آسمان سے ہے اور جسکا ایک مشہور شعبہ علم نجوم ہے۔

اب سے چار ہزار برس قبل جس قوم نے علم نجوم میں کمال پیدا کیا وہ ایشیا کی مشہور کلدانی ربابلی قوم تھی، کلدانیوں میں اس علم کی بنیاد مطلع کی صفائی، آب و ہوا کی لطافت اور اُفق کے استواء پر تھی اور یہی ایک علم ہے جو حکماء کی دماغی محنتوں کا شرمندہ نہیں ہے چنانچہ اس قوم نے اپنے کمال ذہانت سے ستاروں کے محلِ استقامت معین کئے اور بروج و منازل کی اصطلاح قائم کی کسوف وخسوف (سورج و چندر گہن) کا آلاتِ رصدیہ سے حساب لگایا، دھوپ گھڑی ایجاد کی، اور سبعہ سیارہ کے نام سے بابل میں سات ہیکلیں (مندر) تعمیر کیں، جن میں سے بعض کے کھنڈر

ہنوز موجود ہیں چنانچہ یہی مندر رصدخانوں کا کام دیتے تھے - اور اس عہد کے مشاہیر علماء ہیئت نزی تین کلوس، طیمن قردس اور سیلوس (۳۰۰-۱۲۰ قبل مسیح) تھے جنکے اہتمام میں یہ ہیکل تھے - پانچویں صدی قبل مسیح تک کلدانیوں کی حکومت رہی، پھر اہل اسیریہ نے ان پر حملے شروع کردئے، لیکن ان جنگی مہمات نے انکے آداب اجتماعی پر کچھ اثر نہیں ڈالا - کیونکہ زبان اور مذہب میں دونوں قومیں متحد تھیں - اسکے بعد پانچویں صدی قبل مسیح میں ایرانیوں نے بابل پر حملہ کرکے یہ ملک فتح کرلیا - تب مجبور ہوکر قدیم باشندوں نے ہجرت شروع کی اور اطراف بابل میں اپنی مستعمرات (نوآبادیاں) قائم کیں - اور ایک بڑی جماعت عرب میں آکر آباد ہوئی کیونکہ اس عہد میں مہاجرین عراق اور مصر و شام کے لئے صرف عرب کا ملک مامن تھا - اور عرب کے گرم ریگستان، جنگل اور پہاڑ اعداء کی فوجوں کے لئے سدِّ راہ تھے اور نیز بابلی زبان، عربی زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی ان مہاجرین میں کاہن اور نجومی بھی تھے، جن سے عربوں نے فلکیات کے ابتدائی مسائل سیکھے، اور بعض مسائل وہ پہلے سے جانتے تھے، کیونکہ اپنی عمر کا ایک قیمتی حصہ ان چرواہوں نے صفحاتِ افلاک کے مطالعہ میں صرف کیا تھا اور بعض مسائل ہندوستان سے مل گئے تھے، لیکن بربناء اکثریت عرب، نجوم میں کلدانیوں کے مرہونِ منت ہیں، کیونکہ عربی بروج کے نام کلدانی اسماء سے بہت مشابہ ہیں اور بعض ایک ہی ہیں - مثلاً ثور (ثورا) سرطان، عقرب - اور عقربا اور دلو اور دولا، دونوں جگہ ایک ہی ہیں - اور بعض نام معنی میں متحد ہیں جیسے حوت، کلدانی میں نونا ہے اور عربی میں بھی نون مچھلی کے معنی میں آتا ہے - چنانچہ حضرت یونس کا لقب **ذوالنون** (مچھلی والے) ہے -

۲ - آسمان اور بروج | جزیرۃ العرب میں بجائے رصدگاہوں کے پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں اور عربوں کی تیز نگاہیں، دوربیں - اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یونان اور عرب کا آسمان ایک ہی تھا یا جداگانہ، اور آسمان کا مفہوم کیا تھا؟ کیونکہ یونانی آسمان کو گول اور مجوف جانتے تھے اور متعدد آسمانوں کے قائل تھے اور یہ خیال اس بناء پر تھا کہ انھوں نے ستاروں کی دو قسم کی حرکتیں دیکھی تھیں - ایک وہ تھے جو ایک ہی رُخ پر چلتے تھے، اور دوسرے مختلف جہات

---

۱۵ الفہرست صفحہ ۲۷۳ مطبوعہ لیپزگ (جرمن) و سیاحت المعارف نوفل آفندی - مطبوعہ بیروت

۱۶ بہت قدیم زمانہ سے ہندوستان اور عرب میں سلسلۂ تجارت قائم ہے - یہ عرب تاجر علمی تحقیقات بھی کیا کرتے تھے جسکی تصدیق بعض قدیم سفرناموں سے ہوتی ہے -

میں حرکت کرتے تھے۔ اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ یہ ستارے آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال یہ ایک دقیق عالمانہ بحث ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عربوں کے سر پر ایک نیلگوں شامیانہ تنا ہوا تھا، جسکے زیر سایہ وہ رہتے تھے اور یہی انکا آسمان تھا۔ قدیم عرب میں سماء کی تعریف یہ ہے۔ "کل ما علاک فاظلک" یعنی ہر وہ شئے جو بلند ہو اور جسکا سایہ گرتا ہو وہ آسمان ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر سقف (چھت) اور سحاب (بدلی) پر بھی سماء کا اطلاق ہوتا تھا، جسکے متعدد نظائر اشعار عرب میں موجود ہیں۔

آسمان کا قدرتی رنگ نیلا تھا، اس لئے وہ آسمان کو زرقاء کہتے تھے اور اسکے بھی قائل تھے کہ متعدد آسمان ہیں، لیکن ابتداءً اس تعدد پر انھوں نے کوئی عقلی دلیل نہیں قائم کی تھی۔ بلکہ مسائل فلکیات میں جس قدر اضافہ ہوا وہ اُن مذاہب کے اثر سے تھا، جو جزیرۃ العرب میں موجود تھے۔ عرب متعدد آسمانوں کے قائل تھے اس لئے پہلے آسمان کا نام رقیع تیسرے کا صاقورہ اور چوتھے کا نام الخضراء تھا۔ اسی طرح بروج کی تعداد بھی بارہ تھی اور انھیں پر آسمان تقسیم تھا۔

عربوں کو اختر شناسی میں بڑا کمال تھا اور انھوں نے تمام سیاروں اور بروج کو شناخت کرلیا تھا، اور ایک بڑی تعداد میں وہ ثوابت کو بھی پہچانتے تھے اور اس مسئلہ میں وہ دیگر اقوام کے منجمین سے جداگانہ رائے رکھتے تھے۔

عربوں میں مشہور ستاروں کے یہ نام ہیں:-

بنات النعش صغریٰ وکبریٰ، سُہا، ظباء، اولاد الظباء، عوائذ، ربع۔ نثرہ، فرقدان، راعی الجوزاء، راعی النعائم، عصا الضباع، اولاد الضباع، حارس السماء، حارس السماک، الاظفار، الفوارس، کف الخضیب، العیوق، الجدیین، شعریٰ، سہیل وغیرہ۔

مجرّہ (کاہکشاں) کا نام، ام النجوم تھا، اور فلک مدار النجوم، بڑے اور روشن ستاروں میں منجملہ سبعہ سیاروں کے شمس و قمر کا پورا علم تھا، طلوع اور غروب کے لحاظ سے۔ آفتاب کے متعدد نام تھے مثلاً جب ارتفاع ہوتا تو غزالہ کہتے اور غروب کے وقت جونہ۔ اسی طرح دوسرے نام بھی تھے۔ مثلاً جاریہ، سراج، بیضاء وغیرہ۔

۲- آفتابِ عالمتاب

عرب کی قوم وہ تھی جو عروج کے بعد زوال پر پہونچی تھی اس لئے ان میں بدویت کے ساتھ حضریت بھی تھی، یعنی گلہ بانی کے ساتھ وہ تاجر بھی تھے، اور صنعت و حرفت بھی ان میں

موجود تھی اور چونکہ ضرورت، اُمّ الایجاد ہے اس لئے آفتاب کی رفتار کی انھوں نے بخوبی تحقیقات کرلی تھی اور یہ ضرورت یوں پیش آئی کہ انکے کام کے وقت مقرر تھے مثلاً اپنی قیام گاہ سے ایک خاص وقت میں وہ کُل مواشی لے کر جنگلوں میں چلے جاتے تھے، اسی طرح تجارتی قافلے بھی صیف و شتا (گرمی و سردی) میں روانہ ہوتے تھے اور سب سے بڑھکر یہ ہے کہ عہد ابراہیم علیہ السّلام سے حج و زیارت کا خاص دن اور مہینہ مقرر تھا۔ان اسباب سے سال کی تقسیم ہفتوں اور مہینوں پر ہونا لازمی تھی اور کُل قومی کام فصل کے اعتبار سے ہُوا کرتے تھے اور قمری مہینے کسی فصل سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔

آفتاب روزانہ مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوب جاتا تھا اس لئے انھوں نے بدیہی طور پر سمجھا کہ آفتاب تیس یوم میں ایک منزل طے کرتا ہے، اس حساب سے آفتاب کا سال تین سو ساٹھ دن کا ہونا چاہئے، لیکن شمسی حساب، ماہتاب کی رفتار سے وضع کیا گیا تھا، اس لئے آفتاب کا سال تین سو پینسٹھ دن ۵ ساعت ۴۹ دقیقہ کا قرار دیا۔ جس میں بارہ مہینے ہوتے تھے اور ہر مہینہ چار ہفتوں میں تقسیم کیا گیا۔اور ہر ہفتہ میں سات دن رکھے اور ہفتہ کی اصطلاح عربوں نے شامیوں سے سیکھی کیونکہ توراۃ میں مذکور ہے کہ خدا نے چھ دن میں آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔چنانچہ یہی تقسیم اقوام عالم میں جاری ہے۔

سبعہ سیاروں کے مشہور اقوام میں جو نام ہیں وہ اس نقشے سے معلوم ہونگے۔[1]

عربی	زحل	مشتری	مرّیخ	شمس	زہرہ	عطارد	قمر
رومی	قرونس	زاوس	الرس	ایلیوس	افرودیطی	ہرمس	سیلینس
فارسی	کیوان	ہرمزد	بہرام	مہر، خورشید	ناہید	تیر	ماہ
سریانی	کاون	بیل	نرغال	شمشا	استرادلبتی	نغو	سہرا
عبرانی	شبشی	صیدق	ماذیم	حمّو	نوغہ	کیخو و حمو	لغانہ
ہندی	سینچر	برہسپت	منگل	ادیت	شُرک	بُدھ	سوم

۱-بروج کی تفصیل

عربوں نے آسمان کو بارہ حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصّہ کا نام برُج ہے چنانچہ وہ بروج

[1] آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ابوریحان بیرونی مطبوعہ لیپزگ ۱۸۷۸ء صفحہ ۱۹۲۔

حسب ذیل ہیں جن میں آفتاب گردش کرتا ہے۔

۱- حمل ۲- ثور ۳- جوزا ۴- سرطان ۵- اسد ۶- سنبلہ (بروج شمالی)

۷- میزان ۸- عقرب ۹- قوس ۱۰- جدی ۱۱- دلو ۱۲- حوت (بروج جنوبی)

اور یہ تقسیم بروئے منطقۃ البروج[1] ہے۔

ظہیر فاریابی نے ان بروج کو ترتیب وار نظم کیا ہے[2] ؎

بر جہا دیدم کہ از مشرق برآوردند سر جملہ در تسبیح و در تہلیل حیٔ لایموت
چوں حمل، چوں ثور، چوں جوزاء و سرطان و اسد سنبلہ، میزان و عقرب قوس و جدی و دلو و حوت

اِن بروج کی صورتیں خیالی اور وہمی ہیں جو منطقۃ البروج میں آنکھ یا دوربین سے معلوم ہوتی ہیں اور ان کی تفصیل[3] یہ ہے۔

۱- حمل یہ مینڈھے کی صورت ہے، اسکے سینگ مغرب کی جانب ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پینگ سے پیٹھ کھجا رہا ہے اور دُم مشرق کی طرف اور پشت جانب شمال ہے اور پاؤں جنوب میں ہیں۔ اسکے جسم میں اوپر اور نیچے کل تیرہ ستارے ہیں۔

۲- ثور یہ نصف گاؤ (بیل) کی شکل میں ہے جسکے پچھلے دو پاؤں غائب ہیں، باقی کمر سے سر تک ہے اسمیں تینتیس ۳۳ ستارے ہیں منجملہ انکے ثریا اور دبران خاص ہیں۔ یہ بیل سر جھکائے کھڑا ہے جسکا منہ مشرق کی طرف اور دُم جانب مغرب ہے۔

۳- جوزا یہ دو جڑواں بچے ہیں جنکے تن پر کوئی کپڑا نہیں ہے۔ عجم ان کو دو پیکر کہتے ہیں اور وسطِ آسمان میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک تلوار سامنے پڑی ہے۔ اسی خیالی صورت کی طرف حافظ شیرازی اشارہ کرتے ہیں ع جوزا سحر نہاد حمائل برابرم"۔ انکے سر شمال و مشرق میں اور پاؤں مغرب و جنوب میں ہیں۔ یہ اٹھارہ ستارے ہیں اور چونکہ جڑواں ہے اس لئے اسکو التوامین بھی کہتے ہیں۔

۴- سرطان یہ کیکڑے کی صورت ہے رُخ جانب مشرق و شمال، اور پچھلا حصہ جانب جنوب ہے۔ اس میں نو ستارے ہیں۔

---

[1] منطقۃ البروج۔ اُس دائرہ کا نام ہے جسکے اندر بارہ برج واقع ہیں اور جسکی صورت پیٹی یا پٹکے کی ہے۔

[2] نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی باب اول مطبوعہ لیڈن و بلوغ الارب صفحہ ۲۴۲ جلد ۳۔ و قزوینی از صفحہ ۶۱ بالائے حاشیہ دمیری مطبوعہ مصر ۱۳۰۹ھ۔

۵۔ اَسَد یہ شیر کی صورت ہے اسکا منہ مغرب کی طرف اور پشت شمال کی جانب ہے اسمیں ستائیس ستارے ہیں اور منجملہ انکے ایک بہت روشن ہے جو قلب الاسد کے نام سے مشہور ہے۔

۶۔ سُنبلہ یہ ایک خوبصورت لڑکی ہے، جسکے دو پاتوں ہیں اور لانبی پشواز پہنے ہے۔ سر جانب مغرب و شمال ہے اور قدم جانب مشرق و جنوب ہیں۔ بایاں ہاتھ گرا ہوا ہے جسکے اندر ایک روشن ستارہ ہے جسکو سماک اعزل کہتے ہیں۔ اور دایاں ہاتھ اٹھا ہوا ہے جس میں ایک خوشۂ سُنبلہ ہے چھبیس ستارے ہیں اسکا دوسرا نام العذراء ہے۔

۷۔ مِیزان ترازو کی صورت ہے۔ دونوں پلڑے جانب مغرب ہیں اور عمود (ڈنڈی) مشرق کی طرف ہے یہ آٹھ ستارے ہیں۔

۸۔ عقرب بچھو کی تصویر ہے۔ سر جانب شمال و مغرب ہے اور دھڑ لٹکا ہوا ہے۔ دُم جنوب و مشرق میں ہے اسمیں اکیس ستارے ہیں اور دُم کے ستارے بہت روشن ہیں۔

۹۔ قَوس ایک چوپایہ ہے جسکا سر بصورت انسان ہے اور ہاتھ میں کمان ہے جسکے اندر تیر ہے سر پر گیسو ہیں اور عمامہ باندھے ہے۔ چہرہ جانب مشرق ہے، اسمیں اکتیس ستارے ہیں اور تیر و کمان کی مناسبت سے اسکو رامی (تیر انداز) بھی کہتے ہیں۔

۱۰۔ جَدی یہ بکرے کی صورت ہے جس کے دو سینگ ہیں سر اور اگلے پاؤں مغرب کی طرف ہیں اور پشت جانب شمال ہے اور پشت سے دم تک مچھلی کی صورت ہے، اسمیں اٹھائیس ستارے ہیں۔

۱۱۔ دَلو ایک انسان کی صورت ہے جو کھڑا ہوا ہے۔ سر جانب شمال اور پاؤں جانب جنوب ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا جانب مشرق مائل ہے۔ ایک ہاتھ میں صراحی نما پیالہ ہے جس سے پاؤں پر پانی ڈال رہا ہے اور سامنے ایک دُم ایسی لٹکی ہوئی ہے جسکے پچھلے حصہ پر اسکے دونوں پاؤں ہیں اسمیں بیالیس ستارے ہیں عرب اسکو ساکب الماء اور الدالی بھی کہتے ہیں۔

۱۲۔ حُوت یہ دو مچھلیاں ہیں جنکی دمیں دونوں طرف سے آکر مل گئی ہیں اس طرح پر کہ ایک مچھلی کا سر جانب شمال اور دُم جانب جنوب ہے۔ یہ دمیں خیط الکتان کہلاتی ہیں اسکا اتصال بُرج حمل کے سینگوں سے ہے۔ بُرج حوت کو سمکتین (سمک بمعنی مچھلی یعنی دو چھوٹی مچھلیاں) بھی کہتے ہیں۔

ان بروج میں سے ہر بُرج تیس درجہ پر تقسیم ہے اور ہر درجہ میں ساٹھ دقیقہ ہوتے ہیں اور پھر

ہر دقیقہ میں ثانیہ ثانیہ اور ہر ثانیہ میں ثالثہ ثالثہ چنانچہ اسی ترتیب سے دس درجوں تک یہ تقسیم ہے۔

اقوام عالم[1] میں ان بروج کے جو نام ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

عربی[2]	رومی	فارسی	سریانی	عبرانی	ہندی	
حمل وکبش	قریوس	برہ	امرا	طولہ	مینکھ	मेष
ثور	طورس	گاؤ	ثورا	سؤر	برکھ	वृष
جوزا والتومان	دودیمو	دوپیکر	تامی	تومیم	متھن	मिथु.
سرطان	ترقانس	کرزنگ وخرچنگ	سرطان	سرطون	کرک	कर्क
اسد	لاان	شیر	اریا	اری	سنگھ	सिंह
سنبلہ والعذراء	برثانس	خوشہ	شبلتا وبتلنا	بتولو	کنیاں	कन्या
میزان	زوغاس	ترازو	ماسانا ومانشانا	موزنائیم	تلا	तुला
عقرب	اسقربیس	کژدم	عقربا	عقروب	برچیک وبرشچک	वृश्चिक
قوس والرامی	طکسوطس	نیم اسپ	قشتا	قیشت	دھن	धन
جدی	اغوقروس	بزی	کذیا	کذی	مکر	मकर
دلو	اوریخوس	دول	دولا	دیلو	کمبھ	कुंभ
حوت والسمکۃ	ایکثیس	ماہی	نونا	دوغ	مین	मीन

۲۔ ہفتہ

سات دن کا ہفتہ ہوتا ہے اور امتیاز کے لئے ہر دن کا جداگانہ نام ہے۔

بعض مذہبی روایات میں ہے کہ زمین کی بنیاد یکشنبہ کے دن پڑی اور یہ تخلیق عالم کا پہلا دن ہے اسکے بعد ترتیب سے دوسرے دن ہیں اور انجیل میں ہے کہ خدا نے چھ دن کے بعد اتوار کو جو ساتواں دن ہے آرام کیا۔ عربوں[3] میں ہفتہ کے قدیم و جدید نام یہ ہیں۔

قدیم عربی	جدید	فارسی	ہندی	قدیم عربی	جدید	فارسی	ہندی
اول یا اوہد	احد	یک شنبہ	اتوار	اہون	اثنان	دوشنبہ	سوموار، پیر

[1] بیرونی مذکور صفحہ ۱۹۳ [2] بعض نام عربی سریانی اور عبرانی میں متحد ہیں۔ اور اس سے مورخین نے مختلف نتیجہ نکالے ہیں۔ [3] بیرونی صفحہ ۶۴۔

قدیم عربی	جدید	فارسی	ہندی	قدیم عربی	جدید	فارسی	ہندی
جُبار	ثُلثاء	سہ شنبہ	منگل	دُبار	اربعاء	چہارشنبہ	بُدھ
مونس	خمیس	پنجشنبہ	برہسپت	عروبہ (سرائی)	جمعہ	آدینہ	سُکر
شیار	سبت	شنبہ	سنیچر				

عربی اشعار میں ہفتہ کے نام اس طرح پر موزوں کئے گئے ہیں۔

علمت بان اموت وانَّ موتی — مجھے علم ہے کہ میں مرونگا اور میری موت
باوھد اوباھون اوجُبار — بروز اوحد یا اہون یا جبار
والتالی دُبار اویوافی — یا اسکے بعد دبار یا پھر اسکے بعد
بمونس اوعروبہ اوشیار — مونس۔ یا عروبہ یا شیار کے دن واقع ہوگی۔

اس ہفتہ کے علاوہ ایک موسمی ہفتہ کا نام برد عجوز ہے یہ موسم سرما کے سات دن ہیں جو چھبیسویں تاریخ سے تیسری آذار تک رہتے ہیں۔ اور ہر دن کا نام جداگانہ ہے۔

۲۔ بارہ مہینوں کے نام

عربی قمری سال قدیم زمانہ سے بارہ مہینہ کا مانا جاتا ہے اور عرب العاربہ (عہد عاد ۲۳۰۰ لغایت ۱۸۰۰ قبل مسیح) کے عہد میں سال کے جو مہینے تھے انکے یہ نام ہیں۔

ناتق۔ ثقیل، طلیق، واسخ، انخ، حلک، کسح، زاہر، بوطہ، حرف، نعش، قناتق (ان میں ناتق ماہ محرم کا قائم مقام تھا) اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ عہد عاد میں وہی نام تھے جو سب اخیر زمانے میں تبدیل ہوئے ہیں۔

ایک زمانہ دراز کے بعد عہد ثمود (۱۸۰۰ ق م لغایت ۱۶۰۰ ق م) میں قدیم نام مٹ گئے اور ہر مہینہ کا نیا نام رکھا گیا اور وہ یہ ہیں۔

مُوجب، مُوجِر، مُورِد، مَلزِم، مُصدِر، ہوبَر، ہوبَل، مُوہا، دَیمر، دَابر، حَیفل، مُسبِل۔

ان میں پہلا مہینہ سال کا دیمر (مطابق رمضان) تھا اور موجب، محرم کے مطابق تھا۔

تیسری ترتیب جو قبل اسلام تھی وہ اسماء یہ ہیں اور اسکی صراحت نقشہ مندرجۂ ذیل سے واضح ہوگی۔ ان شہور کے نام عربوں نے ان اتفاقی اسباب اور اتفاقات کی بنیاد پر رکھے ہیں جو تسمیہ کے وقت ظہور پذیر ہوئے۔

لہ مناجۃ طرب صفحہ ۲۰۴ ۔ ٢ے بلوغ الارب صفحہ ۲۸۰ جلد ۳۔ ٣ے بیرونی صفحہ ۶۲۔ ٤ے بیرونی صفحہ ۶۰ و ۶۹۔

عہد قدیم کے نام	ترجمہ	عہد اسلام کے نام	مختصر کیفیت
مؤتمر	مشورہ کا زمانہ	محرم	ایتمار سے مشتق ہے جسکا ترجمہ ہے مشورہ کرنا اور اُسپر عمل کرنا یہ سال کا پہلا مہینہ ہے اِس زمانہ میں پورے سال کا پروگرام مرتب کیا جاتا تھا۔ اِس لئے اسکا نام موتمر قرار پایا۔
ناجر	موسم گرما	صَفَر	نجر سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں گرمی کی شدت۔
خوّان نقّار	خیانت	ربیع الاول	فعّال، مبالغہ کا وزن ہے۔ کوئی عظیم الشان واقعہ خیانت کا قوم میں ہوا ہوگا اسکی یادگار میں مہینہ کا نام خوّان قرار پایا۔
صوّان یا بُصّان	نگہبانی	ربیع الثانی	بروزن فُعَال (صُوان) یا فعّال (صوّان) مادہ اشتقاق صیانت ہے (بشرح صدر)
حَنتم	جنگ	جمادی الاوّل	یہ زمانہ جدال و قتال کا تھا اور قبائل میں جنگ شروع ہو جاتی تھی۔
بائدہ یا زباء، زبہ	ہلاک ہونے والا مشتق از بید مہم عظیم یا مصائب کا زمانہ۔ زباء (مویشیوں کے ذبح کرنیکا قریبی زمانہ)	جمادی الثانی	یہ مہینہ بھی باہمی لڑائی اور مشکلات کا تھا اور اسکے بعد جو مہینہ تھا یعنی اَصم اسمیں لڑائی حرام تھی اور دیت لینا بھی بند ہو جاتی تھی اِس لئے بائدہ میں دل کھول کر لڑتے تھے اور اس مہینہ کے متعلق یہ مثل ہے "العجب کل العجب بین جمادی و رجب"
اَصَم	بہرا	رجب	لڑائی کے باجوں کی آواز اور اسلحہ کی جھنکار اِس مہینہ میں سنائی نہیں دیتی تھی کیونکہ جنگ ملتوی ہو جاتی تھی۔ اِس لئے اسکا نام اَصم قرار پایا۔ یہ مقدس مہینہ تھا۔ عرب اِسمیں روزے رکھا کرتے تھے اور خرید غلہ و سامان کے واسطے ملک سے باہر چلے جاتے تھے۔ اور قبیلہ مضر، اَصم کا بڑا احترام کرتا تھا۔
وَاغِل	بزم نشاط	شَعبان	وغل سے مشتق ہے، اس مہینہ میں عرب ٹوٹ کر شراب پیتے تھے اور بن بلائے مجالس مے نوشی میں شریک ہوتے تھے اِس لئے واغل نام ہوا بیرونی اسکا نام عادل لکھتا ہے۔
ناطِل	شراب کا ایک پیمانہ	رمضان	یہ مہینہ بھی شراب نوشی کا تھا، بیرونی نے اِسکا نام ناتق لکھا ہے۔

عہدِ قدیم کے نام	ترجمہ	عہدِ اسلام کے نام	مختصر کیفیت
عادل	برابر کی تقسیم کرنیوالا مشتق از عدل	شوال	یہ مہینہ بھی حج کا تھا شراب نوشی میں اعتدال ہو جاتا تھا اور گناہوں سے بچتے تھے اِس لئے یہ مہینہ عادل کہلایا بعض تاریخوں میں بجائے عادل کے عاطل ہے اور بیرونی نے واغل لکھا ہے۔
رَنہ یا ہُواع	چیخ۔ پکار	ذلقعدہ	اگلا مہینہ حج اور قربانی کا تھا، ہر شخص قربانی کے لئے اونٹ جمع کرتا تھا اور اونٹوں کی بلبلاہٹ کی آواز عام ہوتی تھی۔
بُرَک یا ابروک یا میموں	اونٹ کا بیٹھنا	ذی الحجہ	وہی پہلی مناسبت ہے کیونکہ اونٹ قربانی کے لئے بِٹھائے اور لِٹائے جاتے تھے۔

صاحب بن عبادہ نے بھی یہی نام نظم کئے ہیں، صرف ہواع کی جگہ پر رَنہ لکھا ہے۔ بہرحال جملہ نام متحد المقصد والمعنی ہیں۔ استداد زمانہ سے ترتیب اور ناموں میں فرق آگیا ہے۔ اور ان ناموں میں فصولِ اربعہ کی بھی رعایت ہے۔

۴۔ عہد اسلام کے نام

آغاز اسلام سے قبل کِلاب بن مُرّہ نے ۴۱۲ء میں یہ نام تجویز کئے تھے۔ اور یہی نام عہدِ اسلام میں باقی رہے۔ اِن اسماء کی وجہِ تسمیہ میں جو رعایت اور خصوصیت ہے، ابوریحان[۱] کی روایت کے مطابق اسکی یہ تفصیل ہے۔

۱۔ محرم — باہمی جنگ وجدال حرام تھا، اِس لئے محرّم نام ہوا۔ جاہلیت میں محرم کی نویں تاریخ (یوم تاسوعا) اور دسویں (یوم عاشورہ) کو عرب روزہ رکھتے تھے اور کعبہ پر نیا غلاف چڑھایا جاتا تھا اسلام نے جب ماہ صیام کے روزے فرض کئے تو عاشورہ کا روزہ لازمی نہیں رہا عہد اسلام میں یہ مہینہ محترم اور سید الاشہر تھا اور بجائے محرّم کے صفر اوّل کہلاتا تھا۔

۲۔ صَفَر یا صفرِ ثانی — اِس مہینے میں عرب کی آب وہوا خراب ہو جاتی تھی اور بیماریوں سے چہرے زرد ہو جاتے تھے اس لئے اِس مہینے کو منحوس جانتے تھے۔ علاوہ بریں یہ خزاں کا مہینہ تھا۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گر جاتے تھے۔ اِس وجہ سے اسکا نام صفر ہوا۔ ایک روایت یہ ہے کہ لڑائی کی وجہ سے مکان خالی ہو جاتے تھے۔ الغرض لغوی معنی کا لحاظ ہر روایت میں ہے۔

[۱] آثار الباقیہ از صفحہ ۳۲۵ و بلوغ الارب صفحہ ۴ جلد ۳۔

نے عربوں کے خیال کو بہت مٹایا اور بجائے نحس کے اسکو سعد قرار دیا۔

۳و۴ ربیع الاول و ربیع الثانی: یہ بارش کا پہلا مہینہ تھا۔ جنگل میں سبزہ اور باغوں میں پھول کھلتے تھے۔ لہذا ربیع نام ہوا۔ عربوں میں موسم کی ابتدا فصل خریف سے ہوتی تھی، اس لئے خریف کا نام ربیع قرار پایا۔ اور بعد کا مہینہ ربیع الثانی یا ربیع الآخر کہلایا، یہ عرب کی بہار کا زمانہ ہے۔

۵و۶ جمادی الاولیٰ و جمادی الثانی: یہ جاڑے کے مہینے ہیں جسمیں شدت سرما سے پانی جم جاتا تھا۔ ایک عرب کہتا ہے۔

فی لیلۃ من جمادی ذات اندیۃ لا یبصر الکلب من ظلمائہا الطنبا

(جمادی کی ایک سرد اور اندھیری رات میں کتے بھی خیمہ کی رسیوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے)۔

۷۔ رجب: لغت عرب میں رجب کے متعدد معنی ہیں مثلاً ڈرنا، احترام کرنا، بچنا، چونکہ اس مہینے میں لڑائی حرام تھی، اس لئے عرب جنگ سے بچتے تھے اور اس مہینے کا خاص احترام کرتے تھے۔ اور رجب کے ایک معنی وسط کے بھی ہیں۔ اس صورت میں یہ رواجب سے مشتق ہوگا، جسکے معنی ہیں درمیانی انگلی کی پوریں اور چونکہ یہ مہینہ وسط سال میں تھا لہذا رجب کہلایا۔ اور ایک قول یہ ہے۔[1]

"ارجبوا ای کفوا عن القتال والغارات لانہ شہر حرام" عہد جاہلیت میں رجب کے متعدد نام تھے۔

۱۔ رجب مضر۔ ہر قبیلہ حد سے زیادہ اسکا احترام کرتا تھا۔

۲۔ منصل الاسنہ۔ تیروں سے پیکان نکال ڈالتے تھے اس لئے یہ نام ہوا۔

۳۔ اصم ۔ اسلحہ کی جھنکار بند ہو جاتی تھی۔

عہد اسلام میں بھی یہ مقدس مہینہ تھا۔

اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ خدا کے یہاں مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہیں شَھْرًا مِنْھَا اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ (سورہ توبہ) جن میں سے چار ادب و احترام کے ہیں۔

[2] اشہر حرم میں چار مہینے، رجب، ذوالقعدہ، ذی الحجہ اور محرم ہیں۔

۸۔ شعبان: قبائل عرب اس مہینے میں لوٹ کے لئے متفرق ہو جاتے تھے اور چشموں پر جاکر قیام کرتے تھے اس لئے اسکا نام شعبان ہوا اور چونکہ یہ مہینہ رمضان کا پیش خیمہ تھا اور مسلمان روزے رکھتے تھے اس لئے اسلام میں بھی محترم مانا گیا۔ نبی کریمؐ شعبان میں بہت زیادہ روزے رکھتے تھے۔

---

[1] منجد الطلاب صفحہ ۲۰۴۔

[2] اشہر حرم میں چونکہ رجب علیحدہ پڑتا ہے لہذا وہ "فرد" کہلاتا ہے اور ذوالقعدہ و ذوالحجہ و محرم مسلسل آتے ہیں لہذا ان کو سرد کہتے ہیں۔

۹۔ رمضان شدت کی گرمی کا نام رمض یا رمضاء ہے۔ اور اسی سے ہے "ارمضت الارض" جس سے رمضان مشتق ہوا۔ یہ مہینہ اکثر گرمیوں میں پڑا کرتا تھا اور اوّلاً اضافت کے ساتھ بولا جاتا تھا یعنی شہر رمضان

۱۰۔ شوال شَول سے مشتق ہے جس کا ترجمہ ہے کوچ کرنا۔ عرب کا محاورہ ہے "شَولوا ای رحلوا" اس زمانے میں عرب اپنے قبیلہ سے باہر چلے جاتے تھے۔ ارباب لغت لکھتے ہیں کہ یہ مہینہ شکار کا تھا "اشال الکلب اذا ارسله للصيد" اور ایک یہ کہ اس زمانے میں اونٹنیاں نر کی خواہش میں اپنی دُمیں اُٹھاتی تھیں۔ عرب اس مہینے میں نکاح کو مکروہ جانتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اتفاقی اُمور کی بُنیاد پر شوال نام قرار پایا ہے۔

۱۱۔ ذوالقعدہ اس زمانے میں عرب لڑائی چھوڑ کر آرام سے گھروں میں بیٹھ جاتے تھے۔ عربوں کا قول ہے "اقعدوا وکفّوا عن القتال"

۱۲۔ ذی الحجہ اس مہینے کی دسویں کو حج ہوتا تھا۔ اس لئے ذی الحجہ نام ہوا۔

آفتاب کے متعلق یہ روزمرہ کی باتیں ہیں جنکا عربوں کو علم تھا۔

(۵) ماہتاب جہانتاب

عربوں نے شمسی سال کے صحیح کرنے کے لئے پہلے قمری حساب کو درست کیا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ سورج کی طرح چاند بھی تیس دن کے اندر جہاں سے چلتا ہے پھر وہیں آ جاتا ہے۔ البتہ آخیر یا کبھی ایک یا دو رات تک چھپا رہتا ہے اور نظر نہیں آتا اس لئے انھوں نے تصحیح حساب کی غرض سے تیس یوم میں سے دو دن گھٹا کر چاند کی رفتار کے ۲۸ دن رکھے۔ اور ہر دن کی مسافت کو ایک منزل قرار دیا۔ اور ہر منزل کا ایک جداگانہ نام رکھا جو قمر کی ۲۸ منزلیں ہیں۔ اس تقسیم کے مطابق آسمان کی ہر منزل ۱۲ درجہ اور ۵۱ دقیقہ کی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ منزل وہ مقدار ہے جس کو ماہتاب ایک رات اور دن میں طے کرتا ہے۔

۱۔ منازل قمر

اہل ہند کے نزدیک منازل قمر ۲۷ ہیں، گویا انھوں نے قمر کے ایام غیبت تین یوم مانے ہیں۔ اور عربوں کے نزدیک ۲۸ منزلیں ہیں۔ منازل قمر سے عرب موسمی ہواؤں کی حالت اور فصولِ اربعہ کی ترکیب دریافت کیا کرتے تھے اور چونکہ اَن پڑھ تھے اس لئے انھوں نے انواء (نچھتروں) سے کام لیا، جو ہر وقت پیشِ نظر رہتے تھے۔ ہر موسم کی تقسیم سات انواء پر تھی اور تیرہ۱۳ دن کے مجموعہ کا

نام نوء تھا (باستثناء جبھہ جو ۱۴ یوم کا ہوتا ہے) ۔

نجوم کی اصطلاح میں جب ایک ستارہ اپنی منزل سے صبح کے وقت جانب مغرب غروب ہو اور اُسکے مقابل کا ستارہ مشرق کی طرف طلوع ہو تو اُسکو نوء (نچھتر ۵۱) کہتے ہیں چنانچہ اسی رفتار کے مطابق عربوں نے بارہ مہینہ کا قمری سال رکھا ہے ۔

۲- عرب کے موسم

عرب کے چار موسم تھے اور ہر موسم تین مہینہ کا ہوتا تھا جنکی یہ تفصیل یہ ہے ۔

۱- ربیع یا ربعی	بہار	۲- صیف	گرمی (تابستان)
۳- خریف یا خرفی	خزاں	۴- شتا	جاڑا (زمستان)

ابوریحان نے منازل قمر کو حسب ذیل انواء پر تقسیم کیا ہے ۔

۱- منازل خریف شرطین، بطین، ثریاء، دبران، ہقعہ (۵)

۲- " شتا ہنعہ، ذراع، نثرہ، طرف، جبہہ، زبرہ (۶)

۳- " ربیع صرفہ، عوا، سماک، غفر، زبانی، اکلیل، قلب (۷)

۴- " صیف شولہ، نعائم، بلدہ، سعد ذابح، سعد بلع، سعد السعود، سعد الاخبیہ ۔
فرع مقدم، فرع مؤخر، بطن الحوت، (۱۰)

موسموں کی یہ تقسیم، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن اسحاق زجاجی کی کتاب الانواء کے مطابق ہے جس سے مصنف بلوغ الارب نے نقل کیا ہے اور ہمارے اس مضمون کا ماخذ یہی کتاب ہے ۔ اب ہم فصول اربعہ کی تفصیل لکھتے ہیں ۔

۱- فصل ربیع

آذار کی انیسویں یا بیسویں تاریخ کو دن رات برابر ہو جاتے ہیں اور اسی تاریخ سے فصل ربیع کا آغاز ہوتا ہے یہ فصل جن انواء پر تقسیم ہے، ابوریحان بیرونی کی تحقیقات کے مطابق اسکی تشریح بھی کی جاتی ہے ۔ اور ہندی نچھتروں کے نام بھی لکھے جاتے ہیں

۱- عوّاء ہست یہ پانچ ستارے ہیں جنکی صورت ایسی ہے کہ گویا الف کی دم ٹیڑھی کر دی ہے اور عواء کے ۵۴ معنی ہیں بوڑھا اونٹ جس سے خمیدگی قامت مراد ہے اور انکے غروب ہوتے ہی فصل

۵۱ مناجۃ العرب صفحہ ۴۰۰
۵۲ بیرونی صفحہ ۳۴۹
۵۳ بلوغ الارب صفحہ ۲۰۲ جلد ۳
۵۴ آثار الباقیہ صفحہ ۳۴۱

بہار کا آغاز ہوتا ہے۔

۲۔سماک چترا चित्रा یہ دو ستارے ہیں ایک کا نام اعزل ہے اور دوسرے کا رامح۔ اعزل کے معنی ہیں مو بے اسلحہ یا بے ہارا ں اور ٹیڑھی دُم کا گھوڑا۔ اسکے نزدیک کوئی دوسرا ستارہ نہیں ہے۔ رامح کے قریب دو ستارے ہیں گویا وہ اسکے دو نیزے ہیں اور یہ دونوں ہیج ہے کی پنڈلیاں ہیں۔ عربی اور فارسی علم ادب میں بھی یہ تشبیہات موجود ہیں۔ سلمان ساوجی اپنے ممدوح کی تعریف میں لکھتا ہے ؎

دارى آں دست کہ از دستِ سماکِ رامح نیزہ بستانی و بخشی بہ سماکِ اعزل

۳۔غفر سواتی स्वाती یہ تین چھوٹے ستارے ہیں جو باہم برج میزان میں متصل ہیں۔ غفر کا مادہ غفرہ ہے اور غفرہ وہ بال ہیں جو شیر کی دُم میں ہوتے ہیں یہ بھاگوان نچھتر ہے۔

۴۔زبانا بساکھا (زبانیاں زبانی) विशाखा یہ الگ الگ دو ستارے ہیں جن کو عقرب کے ہاتھ کہنا چاہئے۔

۵۔اکلیل انرادھا अनुराधा عقرب کے سر پر یہ تین ستارے بطور تاج کے ہیں۔

۶۔القلب جیشٹا ज्येष्ठा برج عقرب کے وسط میں یہ سُرخ ستارہ واقع ہے جسکا نام قلب (دل) ہے۔

۷۔شولہ مولا मूल یہ دو ستارے ہیں ایک چھوٹا، دوسرا بڑا۔ اور ان کی صورت بچھو کی دم سے مشابہ ہے جو اوپر کو اٹھی ہوئی ہے۔

۲۔فصل صیف یا قیظ

شولہ سے جب آفتاب گزر جاتا ہے تو گرمی کا موسم شروع ہوتا ہے اس فصل میں بھی سات نچھتر ہیں

۱۔نعائم۔ پوربا کھاڑ पूर्वाषाढा یہ آٹھ روشن ستارے ہیں منجملہ انکے چار کاہکشاں کے اندر ہیں جو نعام الوارد کہلاتے ہیں اور چار باہر ہیں انکا نام نعام الصادر ہے۔ نعائم کا مادہ نعام ہے اور نعام وہ لکڑی ہے جو دہانۂ چاہ پر حفاظت کے لئے رکھتے ہیں اور ڈول اور گھڑے کنوئیں سے نکال کر اس لکڑی پر رکھے جاتے ہیں پہلے چار قوس کے اوپر ہیں اور دوسرے قوس کے شانہ اور سینہ پر ہیں۔

۲۔بلدہ اترا کھاڑ उत्तराषाढा یہ برج قوس میں چھ ستارے ہیں اور بعض نجومی کہتے ہیں کہ بلدہ آسمان کا وہ خالی حصہ ہے جس میں ایک بھی ستارہ نہیں ہے۔ اور یہ جگہ سعد ذابح اور نعائم کے درمیان ہے اس لئے اسکو بلدہ کہتے ہیں۔ کیونکہ دونوں بھوؤں (ابرو) کے مابین جو خالی جگہ ہے اسکا نام بلدہ ہے۔ اسکے قریب ایک اور ستارہ ہے جسکو قلادہ (گلوبند) کہتے ہیں اور قلادہ میں چھ ستارے

بصورت کمان واقع ہیں۔ (قاموس)

۳۔ سعد الذابح — یہ دو ستارے ہیں ایک شمال کی طرف اٹھا ہوا اور دوسرا جنوب کی طرف جھکا ہوا۔
سبرن یا شرون
श्रवण

۴۔ سعد بلع — یہ کاہکشاں کے دو چھوٹے ستارے ہیں ان میں ایک بہت چمکدار ہے اور ایک میں روشنی کم ہے۔ روشن ستارہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گویا دوسرے ستارے کو نگل رہا ہے اور یہی لفظی رعایت ہے قرآن میں ہے "یا ارض ابلعی ماءک"۔
دھنشٹھا
धनिष्ठा

۵۔ سعد السعود — یہ تین ستارے ہیں ان میں ایک بہت روشن ہے اس نچھتر میں جاڑا ختم ہو جاتا ہے اور بارش شروع ہو جاتی ہے اور سبزہ نکلتا ہے اور زراعت کا آغاز ہوتا ہے اس لئے بہت مبارک ہے۔
پوربا بھادر پد
पूर्वा भाद्रपद

۶۔ سعد الاخبیہ — یہ چار ستارے ہیں ان میں سے تین بصورت مثلث △ حاد الزاویہ ہیں اور چوتھا بیچ میں ہے اور چونکہ اسکی صورت خیمہ سے مشابہ ہے لہذا سعد الاخبیہ (جمع خباء، چھوٹا خیمہ) کہلاتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں زمین سے حشرات الارض (موذی جانور سانپ بچھو وغیرہ) نکلتے ہیں اس وقت یہ طلوع ہوتے ہیں۔ اس صورت میں مادہ اشتقاق خبا ہوگا جس کے معنی چھپانے کے ہیں۔
ست بھکھا
सत भिषा

۷۔ فرغ الدلو الاعلیٰ — یہ دو روشن ستارے ہیں جو الگ الگ ہیں اور انکی صورت ڈول کے مشابہ ہے اس زمانے میں زور کی بارش ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک فرس الاعظم کی پشت پر ہے اور دوسرا شانے پر۔ ان کو عرقوۃ العلیا (حلقوم کا بالائی حصہ) بھی کہتے ہیں۔
فرغ المقدم
فرغ الاول
اترابھادرپد
उत्तरा भाद्रपद

۳۔ فصل خریف

خریف (خزاں) کا آغاز فرغ الدلو کے بعد شروع ہوتا ہے اسمیں بھی سات نچھتر ہیں۔

۱۔ فرغ الدلو الاسفل — یہ دو روشن ستارے ہیں اور دونوں میں فاصلہ ہے یہ عرقوۃ السفلی کہلاتے ہیں۔
فرغ المؤخر، فرغ الثانی
ریوتی
रेवती

۲۔ بطن الحوت — وسط سمک میں ایک روشن ستارہ ہے۔
یا
قلب الحوت

۳-شرطان یا شرطین اسنی
یا
اسونی असुनी
مینڈھے کی صورت میں یہ دو ستارے ہیں انکے غروب ہونے کے بعد بارش شروع ہوتی ہے۔

۴-بُطَین भरनी بھرنی
یہ چھوٹے چھوٹے تین ستارے مثلث متساوی الاضلاع کی صورت △ میں اور برج حمل کے پیٹ میں ہیں۔

۵-ثریا (پروین) کرتکا कृतिका
یہ چھ ستارے ہیں جو قریب قریب واقع ہیں اور انکا مجموعہ خوشۂ انگور معلوم ہوتا ہے۔ بعض اشعار عرب سے واضح ہے کہ ثریا سات ستاروں کا ایک جھومر ہے۔

۶-دبران یا دبرانا روہنی रोहनी
یہ ستارہ ثریا کے عقب میں ہے اس لئے اسکا نام دبران ہوا۔ یہ چمکدار ستارہ ہے اسکو شاذ الراعی، تالی، تابع اور حادی بھی کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک پانچ ستاروں کا مجموعہ ہے اور ان میں وسطی ستارہ بہت روشن ہے جسکو عین الثور (بیل کی آنکھ) کہتے ہیں۔

۷-ہقعہ مرگسرا मृगसरा
یہ تین چھوٹے ستارے ہیں جو برج جوزا کے سر پر ہیں اور قریب قریب واقع ہیں۔ ہقعہ لغت عرب میں اس دائرہ کا نام ہے جو گھوڑے کے سینہ پر ہوتا ہے۔

۴-فصل سِشتا

یہ سال کا اخیر موسم ہے اور اس میں بھی سات نچھتر ہیں۔

۱-ہنعہ آردرا आर्द्रा
یہ دو روشن ستارے ہیں جو قریب قریب واقع ہیں اور جوزا کے شانہ پر ہیں اور ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ مبارک نوء ہے ہنعہ اس داغ کا نام ہے جو اونٹ کی پشت گردن پر ہو۔

۲-ذراع الاسد المقبوضہ ذراع کے نام سے متعدد ستارے ہیں جو بلحاظ صفات مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔
پونربس पुनर्वसु
یہ دو بڑے ستارے ہیں جو برج اسد کے بازو ہیں اور دونوں میں ایک گز کا فاصلہ ہے انکے علاوہ نیچے کی طرف چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں جو اظفار (ناخون) کے نام سے موسوم ہیں گویا یہ شیر کے پنجے ہیں۔

۳-النثرہ یا لہاۃ پکھ पुष
یہ دو چھوٹے ستارے ہیں جو اسد کے منھ اور نتھنے کے درمیان ہیں۔

۴۔ طرف یا طرفہ آشلیکھا یہ دو چھوٹے ستارے ہیں جو اسد کی آنکھیں ہیں اس لیے یہ عین الاسد کہلاتے ہیں اور لغت میں طرف بمعنی چشم ہے۔ अश्लेषा

۵۔ جبہہ۔ مگھا मघा یہ چار ستارے ہیں جو اسد کی پیشانی میں ہیں۔

۶ زُبرہ۔ پوربا پھالگنی یہ دو روشن ستارے ہیں جو اسد کے شانے پر ہیں۔ पूर्वा फाल्गुनी

۷۔ صرفہ اُترا پھالگنی اسکے ڈوبتے ہی جاڑے میں کمی ہو جاتی ہے لہذا اس کا نام صرفہ ہے (مشتق از انصراف) یہ ستارہ اسد کی دُم کی طرف ہے۔ उत्तराफाल्गुनी

حکمائے ہند نے بھی سال کو چار چار مہینوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ زمستاں سردی کاتک कार्तिक اگہن अगहन پوس पूस ماگھ माघ

۲۔ تابستاں گرمی پھاگن फाल्गुन चैत چیت بیساکھ वैशाख जेठ جیٹھ आषाढ़

۳۔ برشگال برسات اساڑھ आषाढ़ ساون सावन بھادوں भादों کنوار कुआर

پھر دو دو مہینے کا ایک ایک موسم قائم کر کے چھ رت ऋतु پر تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم بروج دوازدہ گانہ کے مطابق حسب ذیل ہے

۱۔ بسنت رت वसंत حوت حمل (مین، میکھ) मीन मेष چیت، بیساکھ

۲۔ گری کھم ग्रीष्म ثور، جوزا (برکھ، متھن) वृष मिथुन جیٹھ، اساڑھ

۳۔ برکھا رت वर्षा سرطان، اسد (کرک، سنگھ) कर्क सिंह ساون، بھادوں

۴۔ شرد رت शरत सुंबلہ، میزان (کنیاں، تلا) कन्या तुला کنوار، کاتک

۵ ہمنت رت हेमन्त عقرب، قوس (برچھک، دھن) वृश्चिक धन اگہن، پوس

۶۔ سسر رت शिशिर جدی، دلو (مکر، کمبھ) मकर कुंभ ماگھ، پھاگن

یہ فصلیں اور رت ۱۲ نچھتروں پر تقسیم ہیں۔

ہند کی طرح ایران میں بھی چار چار مہینے کا ایک موسم ہوتا ہے۔

۱۔ بہار ۲۱ مارچ لغایتہ ۲۱ جون حمل، ثور، جوزا ۲ تابستان ۲۱ جون لغایتہ ۲۱ ستمبر سرطان، اسد، سنبلہ ۳۔ پائیز ۲۱ ستمبر لغایتہ ۲۱ دسمبر میزان، عقرب، قوس۔ ۴۔ زمستان ۲۱ دسمبر لغایتہ ۲۱ مارچ جدی، دلو، حوت

فصول کی تبدیلی بھی انواء کے اثر سے ہوتی ہے جس کی تصدیق اشعار عرب سے ہوتی ہے۔

اذا ما قارن القمر الثریا جب تیسری منزل میں چاند اور ثریا کا قران ہو تو سمجھو لینا چاہئے
ثالثۃ فقد ذھب الشتاء کہ جاڑا رخصت ہو گیا۔
اتتك رياح القر من كل جهة ہر جانب سے سرد ترین ہوائیں آنا شروع ہوتی ہیں اور صبح کے وقت
وطاب قبيل الصبح كور العمائم عمامے باندھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔
اذا ما البدر تم مع الثريا جب پندرھویں کا چاند، ثریا کے ساتھ کامل ہو جائے تو تمہارے اوپر
اتاك البرد اوله الشتاء سردی کا موسم آتا ہے اور جاڑے کی ابتدا ہوتی ہے۔

۶۔ عرب اور اختر شناسی

عربوں کو اختر شناسی میں بڑا کمال تھا، کیونکہ وہ دن رات صحیفۂ آسمانی سے استفادہ کیا کرتے تھے ستارے ہی سفر میں انکے راہ نما ہوتے تھے اور انھیں کے طلوع و غروب کے حساب سے وہ منزلیں طے کرتے تھے جب کوئی ان سے راستہ دریافت کرتا تو کہتے تھے کہ فلاں ستارے کے رُخ پہ چلے جاؤ چنانچہ مسافر منزل مقصود پر پہونچ جاتا تھا اور کبھی ہوا کے رُخ سے بھی مدد لیجاتی تھی اور سمت کی شناخت ہو جاتی تھی جسکی مثال یہ واقعہ ہے۔

سُلیک بن سعد نے قیس بن مکشوح مُرادی سے پوچھا کہ تم اپنے قبیلہ کا پتہ بتاؤ پھر میں بتاؤنگا، مگر شرط یہ ہے کہ غلط بیانی نہ کیجئے۔ دونوں نے اقرار کیا۔

قیس نے کہا کہ جنوبی ہوا اور بادِ صبا کے درمیان ایک حد قائم کرو، پھر اس طرح چلو کہ درختوں کا سایہ تم کو معلوم نہ ہو اور جب تم پانی سے گزر جاؤ تو چار منزل چلو، یہاں تک کہ تم کو ایک ریت کا ٹیلہ میگا اس ٹیلہ اور راستہ کے درمیان ٹھہر جاؤ اسی جگہ میری قوم مراد اور پھر خشعم کے گھر ہیں۔

اسکے جواب میں سلیک نے کہا کہ افق آسمان پر مطلع سہیل اور جوزا کے بائیں ہاتھ چلو، اسی جگہ میری قوم بنی سعد بن زید مناۃ کے مکانات ہیں۔

۷۔ عمل کبیسہ

اسلام سے دو سو سال قبل عربوں نے اپنے سنہ قمری میں کبیسہ (لوند) [illegible] کا عمل جاری کیا۔ اور سال میں رویت ہلال کی وجہ سے جو کسر پڑ جاتی تھی اُس کمی کو تین سال میں پورا کرنا شروع کیا۔ یعنی ہر تیسرے سال، عرب ایک مہینے کا سال رواں میں اضافہ کرتے تھے۔ اس اضافہ کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قمری سال شمسی سال کے مطابق ہو جائے۔ یہ اضافہ ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔

[illegible] صفحہ ۱۰۱

بلکہ یہ خدمت بنی کنانہ کے سپرد تھی جو متولی نساءۃ (مہینے کا گھٹانا اور بڑھانا) تھے لیکن ۱۰ھ میں یہ عمل باطل ہوگیا (کیونکہ آیت تحریم النسئ نازل ہوئی) اور قمری مہینے قدیم حالت پر آگئے، اسلامی فرقوں کا شرعی احکام میں رؤیت ہلال پر مدار ہے اور اسلامی سال محرم سے شروع ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں بھی اسکی طرف اشارہ ہے۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔ (سورۂ بقرہ) اے پیغمبر! لوگ تم سے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو تم ان سے کہو کہ چاند سے لوگوں کے معاملات اور عبادات مثلاً حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں۔

اور سال کے بعض مہینے کامل ہوتے ہیں (۳۰ یوم) اور بعض ناقص (۲۸ یا ۲۹ یوم) اور قمری سال ۳۵۴ یوم ۱/۵ یا ۱/۶ کا ہوتا ہے جسکی تفصیل[1] یہ ہے۔

محرم	۳۰ یوم	صفر	۲۹ یوم	ربیع الاول	۳۰ یوم	ربیع الثانی	۲۹ یوم
جمادی الاول	۳۰ ″	جمادی الثانی	۲۹ ″	رجب	۳۰ ″	شعبان	۲۹ یوم
رمضان	۳۰ ″	شوال	۲۹ ″	ذی القعدہ	۳۰ ″	ذی الحجہ	۲۹ یوم

کل ۳۵۴ یوم

اور جب یہ کسر نصف یوم کے برابر یا کچھ زیادہ ہوجاتی تھی تو اس سال کا ذی الحجہ ۳۰ یوم کا ہوتا تھا اور یہ سال کبیسہ کہلاتا تھا جسمیں ۳۵۵ دن ہوجاتے تھے۔ اور ان سنین میں ۱۹ سال بسیطہ ہوتے تھے اور گیارہ سال کبیسہ کے، کبیسہ کے اخیر سال یہ ہیں۔

دوسرا[۲]، پانچواں[۵]، ساتواں[۷]، دسواں[۱۰]، تیرھواں[۱۳]، سولھواں[۱۶]، اٹھارواں[۱۸]، اکیسواں[۲۱]، چوبیسواں[۲۴] اور چھبیسواں[۲۶] و انتیسواں[۲۹]۔

۴۔ عربوں کا دن اور رات

عربوں میں چونکہ رؤیت ہلال پر ماہ و سال کا مدار ہے اور چاند غروب آفتاب کے بعد نکلا کرتا ہے اس لئے ان کے خیال میں سورج کے نکلتے ہی رات ختم ہوجاتی ہے اور غروب آفتاب سے دوسرے غروب تک ایک دن ہوتا ہے۔ عربوں میں دن اور رات کے ہر ایک حصہ کا نام علحدہ ہے چنانچہ دن کے حصے حسب ذیل ہیں بکور، بزوغ، زاد، ضحیٰ، متوع، ظهیرہ، زوال (ہاجرہ) اصیل، عصر، طفل، اور غروب اور رات کی پہلی ساعت کا نام ناشئۃ اللیل ہے۔ باقی ترتیب یہ ہے۔

---

[1] مقریزی صفحہ ۵۵ جلد ۲۔

شفق، عشوہ، عسق، بداۃ، شرع، جنح، زلفہ، ہزیع، عبس، سحر، فجر، صبح۔

اسی طرح چاند کی ہر تین رات کے مجموعہ کا ایک نیا نام ہے [۱]

۱-۳ غرر ۴-۶ نفل یا شہباء ۷-۹ تسع یا بہرا۔ ۱۰-۱۲ عشر ۱۳-۱۵ بیض ۱۶-۱۸ درع

۱۹-۲۱ ظلم - ۲۲ ۲۳ خنادس ۲۵-۲۷ داری ۲۸-۳۰ محاق“

اسکے علاوہ اور تقسیم بھی ہے مثلاً پہلی رات کو غرہ کہتے ہیں تیسری تک ہلال ہے۔ اور پندرھویں رات کا چاند بدر ہے۔ چاندنی رات کا نام سمر ہے اور قصہ کہانیاں بھی سمر ہیں، جن سے مسامرت (قصہ گوئی) اور سمار (قصہ گو) کے الفاظ پیدا ہوئے۔ اور اسی معنی میں حدیث خرافہ ہے یہ لفظ اختراف سے مشتق ہے جسکے معنی ظرافت اور قصہ گوئی کے ہیں۔ قبیلۂ عذرہ میں خرافہ نامی ایک شخص تھا۔ اسکی نسبت مشہور ہے کہ اسکو جن اُڑا لے گئے تھے۔ جب عرصہ کے بعد وہ واپس آیا۔ اور اُس نے جنوں کے حالات بیان کئے تو قوم نے کہا کہ خرافہ کی باتیں قابلِ سماعت نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی واقعہ سے حدیثِ خرافہ کا محاورہ نکلا۔ اُردو میں بھی خرافات سے ایسی ہی مہمل باتیں مراد ہیں۔

رسید کتب

نذرِ ادب۔ مصنفہ منشی بشیشر پرشاد منوّر لکھنوی

اسلام اور غیر مسلم از محمد حنیف صاحب پھلواروی۔ قیمت ۸؍

دکنی لغت۔ از سید شمشاد احمد ہاشمی

روحِ تنقید حصہ ۲۔ از مسٹر زور ایم۔ اے

جواہراتِ کلیاتِ نظیر۔ از سید ہاشمی و مولوی ذہین

دکن میں اُردو۔ از مولوی نصیر الدین ہاشمی۔

آثار الکرام۔ از حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب

(شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن)

---

[۱] بیرونی صفحہ ۶۳۔ ہر لفظ کی وجہ تسمیہ کی تفصیل بیرونی میں دیکھنا چاہیے۔

جنگ کربلا

از مسٹر ہری کرشن - سی - ٹی - آر - اے

تاریخ و فسانہ اگرچہ ظاہری دلچسپی کے لحاظ سے عموماً یکساں نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان دونوں میں بہت کچھ فرق ہے - افسانہ میں اصلی اور فرضی دونوں طرح کے واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں - اور افسانہ نگار اپنے مفید مطلب واقعات میں ترمیم کر سکتا ہے مگر تاریخ میں اس قسم کا تصرف کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا بلکہ صرف حقیقی واقعات پر تبصرہ کرکے انکے اسباب و نتائج بیان کئے جاتے ہیں - اس صورت میں ایک ایسے تاریخی واقعہ پر خامہ فرسائی کرنا جس پر اعتقادات کا پردہ پڑا ہو بہت مشکل کام ہے - تاہم اس مضمون میں جنگ کربلا کے درد انگیز واقعہ پر صرف تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے - اور ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جنکا ذکر عام مرثیہ خوان اصحاب نہیں کرتے - مضمون کا ماخذ عربی زبان کی ایک مستند تصنیف کتاب "الفخری" ہے -

جب حضرت علیؓ شہید ہوئے تو حضرت امام حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی - آپکی مدت خلافت صرف چند ماہ رہی - اسکے خاتمہ کا باعث یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت امام حسنؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موجودالوقت سیاسی مسائل پر آپ سے مشورہ کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت امام حسنؓ کسی ایسی موجود مصلحت کی بناء پر جسکو آپ خود ہی جانتے تھے بحق حضرت معاویہؓ عہدۂ خلافت سے دستکش ہو گئے - عوام نے معہ حضرات امام حسنؓ و امام حسینؓ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور وہ امیرالمومنین کے لقب سے ملقب ہو گئے - یہ واقعہ ۴۱ھ ہجری کا ہے -

اس زمانہ میں اسلامی فتوحات کا دائرہ روزافزوں ترقی پر تھا - فارس، عجم، شمالی افریقہ کے بعض حصص اسلام کے زیرنگین آ چکے تھے - فتوحات کا سیلاب برابر بڑھتا جا رہا تھا - علاوہ ازیں خود فاتحوں میں گروہ بندیاں ہو گئی تھیں - گلِ اتفاق کے پہلو میں خارِ نفاق بھی موجود تھا جو ماہرانِ سیاسیات کی آنکھوں میں ہروقت کھٹکتا رہتا تھا - ہر فریق تخت خلافت پر قابض ہونے کی درپردہ کوشش کرتا رہتا تھا - اور زبردست ترین طاقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا تھا - آنحضرت محمد صاحب صلعم کی وفات حسرت آیات اور خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ یکے بعد دیگرے شہید ہو چکے تھے - ایسے نازک وقت میں تخت خلافت پر ایسی ہستی کی

ضرورت تھی جو کشتیٔ اسلام کو اندرونی نفاق کے گرداب اور بیرونی دشمنوں کی بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے بچاتی ہوئی ساحلِ مراد پر پہونچا دے۔ وہ ایسی کونسی اہم مصالح ملکی و پیش بینیاں تھیں جنکی بناء پر حضرت امام حسنؑ و حضرت معاویہؓ اس اہم تبدیلی پر رضامند ہوگئے؟ کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ یہ مسلّم ہے کہ ان حضرات کے یہ کارنامے ذاتی اغراض پر مبنی نہ تھے۔

حضرت امام حسنؑ حضرت علیؑ کے فرزندِ اکبر تھے اور بعد شہادت حضرت علیؑ (جو خلفائے راشدین میں آخری خلیفہ اور آنحضرت محمد صاحب صلعم کے داماد تھے) تختِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ حضرت امام حسینؑ آپکے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ حضرت معاویہؓ کے والد بزرگوار ابو سفیان مکّہ کے سربرآوردہ اصحاب میں سے تھے یہ اُسی سال اسلام لائے تھے جس سال آنحضرت صلعم نے مکّہ فتح کیا تھا۔ حضرت معاویہؓ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ہی مسلمان ہوئے تھے۔ آپکی والدہ ہند بنت عتبہ شرفائے قریش سے تھیں۔ یہ بھی فتح مکّہ کے سال اسلام لائیں۔ انکی روئداد پر لطف ہے۔ یہ جنگِ اُحد میں موجود تھیں جس میں نبی صلعم کے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہوئے۔ بعد جنگ انھوں نے حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا۔

جب آنحضرت صلعم نے مکّہ فتح کیا اس وقت ہند بھی بہ تبدیلِ لباس مکّہ کی اُن عورتوں کے ساتھ آئیں جو حضرت صلعم کی خدمت میں بغرضِ بیعت حاضر ہوئی تھیں۔ جب وہ بیعت کرنے کو بڑھیں تو آپنے ان سے اسلام کی شرائط قبول کرانے کی غرض سے بیان فرمائیں۔ جناب صلعم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ہند ہیں۔ مگر انھوں نے حضرت محمد صلعم کو بہت سخت جواب دئے۔ اُس وقت کی کچھ گفتگو ذیل میں درج کیجاتی ہے۔

حضرت صلعم۔ تم سب اس بات پر بیعت کرو کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی (عرب لوگ زمانۂ جاہلیت میں اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے)

ہند۔ ہم نے بچپن سے انکو پالا پوسا تھا۔ مگر بڑے ہونے پر تم نے انکو جنگِ بدر میں فنا کر دیا۔

حضرت صلعم۔ نیز اس بات پر کہ نیک بات میں میری نافرمانی نہ کروگی۔

ملہ رسم مثلہ اہل عرب میں زمانۂ جاہلیت سے تھی اور اسلام باوجود کوشش بلیغ کے اس وقت تک اسکا استیصال نہ کر سکا تھا۔ یہ اہل عرب کی اُس بد طینتی۔ تنگدلی اور کینہ پروری کا مظہر تھی جنکی آگ دشمن کے خون سے بھی نہیں بجھتی تھی۔ دشمن کو قتل کرنے کے بعد اسکی نعش کی طرح طرح سے بے حرمتی کی جاتی تھی اُسکے اعضا کاٹے جاتے تھے۔ اور ان حرکاتِ ناشائستہ کے کرنے میں بدترین قسم کی نفرت۔ سنگدلی۔ خونخواری۔ درندگی اور سفاکی کا اظہار نہایت فخر و مباہات کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ کے قتل ہو جانے پر ہندنے اُن کا مثلہ کیا۔ اور انتہائے کینہ پرستی کے جوش میں اُنکے جگر کا ایک ٹکڑا لیکر دانتوں سے اس لئے چبایا کہ حضرت حمزہؓ نے ہند کے کئی عزیزوں کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا۔ اسی واسطے ہند کو جگر خوارہ اور حضرت معاویہؓ کو پسر جگر خوارہ کہتے ہیں۔

ہند۔ ہم اس مجلس میں تمھاری مخالفت کے ارادے سے نہیں بیٹھی ہیں۔
حضرت صلعم۔ نیز اسپر کہ چوری نہ کروگی۔
ہند۔ بخدا میں نے کبھی چوری نہیں کی۔ ہاں میں کبھی کبھی ابوسفیان کے مال میں سے کچھ لیا کرتی تھی۔
اس وقت ہند کے شوہر ابوسفیان بھی موجود تھے اس لئے آنحضرتؐ نے سمجھ لیا کہ وہ ہند ہے۔ اپنے پوچھا۔
حضرت صلعم۔ کیا ہند ہے ؟۔
ہند۔ یا رسول اللہ!
حضرت صلعم۔ نیز اسپر کہ بدکاری نکروگی۔
ہند۔ کیا کوئی شریف زادی بدکاری کرسکتی ہے۔
اسپر آنحضرت صلعم حضرت عباسؓ کی طرف دیکھکر مسکرائے اور ہند کو مشرف با سلام کرلیا۔
مسلمان ہو جانے پر معاویہؓ وحی لکھنے پر مامور ہوئے۔ آپکے علاوہ اور بھی چند بزرگ اس خدمت پر مامور تھے جو آنحضرت محمد صلعم کے یہاں وحی لکھا کرتے تھے۔ آپکی اس تقرری سے اُس عزت و محبت کا پتہ چلتا ہے جو آپ کے لئے پیمبر اسلام کے دل میں موجود تھی۔ اتفاقات زمانہ سے حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے مابین سخت دشمنی ہوگئی۔ حضرت معاویہؓ بڑے سیاست داں تھے۔ روایت ہے کہ ایک روز حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے ہمنشینوں سے کہا کہ تم کیوں قیصر و کسریٰ کی سیاست دانی کی اس قدر تعریف کرتے ہو؟ خود تمھارے درمیان معاویہؓ موجود ہیں۔ یہ انکی انتہائے دانشمندی تھی کہ عمرو بن العاص جیسے شخص کو اپنی طرف مائل کرلیا۔ عمرو بن العاص بھی ایک ہوشیار شخص تھے۔ جب حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تو عمرو بن العاص کسی فریق کے شریک نہ تھے لیکن معاویہؓ کو انکا علیحدہ رہنا پسند نہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی خوف تھا کہ کہیں وہ حضرت علیؓ کے ساتھ شریک نہ ہوجائیں۔ اس لئے حضرت معاویہؓ نے اپنی لیاقت و ہوشیاری سے بالآخر عمرو بن العاص کو اپنا بنا لیا۔ اور اُن کو مصر کا گورنر مقرر کردیا۔ عمرو بن العاص نے ایک عجیب چال سے جنگ صفین میں امیر معاویہؓ کو بچالیا ورنہ حضرت علیؓ کا لشکر انپر غالب آچکا تھا۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ سے درخواست کی کہ وہ خود نبرد آزمائی کے لئے نکلیں تو عمرو بن العاص نے حضرت معاویہ سے کہا کہ تمھیں اُنکے مقابلہ سے منھ موڑنا زیبا نہیں۔ اسپر حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ اے عمرو تم مجھے دھوکا دیتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں قتل ہوجاؤں کیا تم کو معلوم نہیں کہ جو کوئی بھی حضرت علیؓ کا مقابلہ کرتا ہے وہ اُسکو قتل کردیتے ہیں۔ اس حکمت عملی

حضرت معاویہؓ نے ایسے نازک موقعہ پر اپنی جان بچالی۔

سمیّہ زیاد کی ماں عرب کی شاہدانِ بازاری میں سے تھی۔ منجملہ دیگر شخصوں کے مستی عُبید سے بھی اُسکا تعلق تھا۔ پھر وہ ابوسفیان پدر حضرت معاویہؓ سے حاملہ ہوئی اور اُس سے زیاد پیدا ہوا۔ جوان ہوکر وہ مختلف مناصب پر مامور رہا۔ ایک روز وہ حضرت عمرؓ کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ اکابر صحابہ بھی موجود تھے۔ ابوسفیان بھی تھے۔ کسی معاملہ پر زیاد نے ایسی فصیح تقریر کی کہ لوگوں نے کبھی ایسی تقریر نہ سُنی تھی۔ اسپر عمرو بن العاص نے کہا۔ واہ واہ یہ لڑکا بھی کیا خوب ہے۔ اگر اسکا باپ خاندانِ قریش[1] سے ہوتا تو یہ تمام عرب پر اپنا اقتدار جما لیتا۔ اسپر ابوسفیان بولے۔ بخدا میں اسکے باپ کو جانتا ہوں۔ اس سے انکی مراد خود اپنی ذات سے تھی۔ لیکن حضرت علیؓ نے اُسی وقت کہا۔ اے ابوسفیان خاموش رہو اگر حضرت عمرؓ سُن لینگے تو فوراً دُرّہ سے تمھاری خبر لینگے۔

جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو اُنھوں نے زیاد کو فارس کا گورنر مقرر کیا۔ زیاد نے وہاں کا نہایت خوبی سے بندوبست کیا۔ جب معاویہؓ کو اُسکے حسنِ لیاقت کا حال معلوم ہوا تو اُسکو اپنے گروہ میں شامل کرنے کے لئے ایک خط لکھا اور اُسمیں ابوسفیان کی ولدیت کی طرف اشارہ کرکے اُسکو بھائی لکھکر مخاطب کیا۔ جب حضرت علیؓ کو یہ حال معلوم ہوا تو اُنھوں نے زیاد کو لکھا کہ ابوسفیان کی ایک بیہودہ حرکت کی وجہ سے تم اُسکی میراث کے حقدار نہیں بن سکتے۔ معاویہ انسان کو سامنے پیچھے دائیں اور بائیں سے آلیتا ہے اس لئے اُس سے بچو اور پھر بچو۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد معاویہؓ نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح زیاد کی دوستی حاصل ہو جائے۔ اس لئے پھر ابوسفیان کی ولدیت کا قصہ چھیڑا۔ اور معاویہؓ و زیاد دونوں اسپر متفق ہوگئے معاویہؓ کی مجلس میں گواہ گذرے جنھوں نے زیاد کو ابوسفیان کا فرزند بتلایا اور معاویہؓ نے اُسکو اپنے ساتھ ملالیا۔ یہ ملاپ کا پہلا موقعہ ہے جسمیں شرعی احکام کُھلم کُھلا رد کئے گئے۔ رسول صلعم نے یہ طے کیا تھا کہ زانیہ کی اولاد خواہ کسی کے نطفہ سے ہو زانیہ کے خاوند کی طرف منسوب ہوگی۔ اور زانی کا اُس سے کوئی تعلق نہوگا۔ لیکن معاویہؓ نے حضرت صلعم کے احکام کو قطعاً پلٹ دیا اور زیاد بن عُبید کو زیاد بن ابوسفیان بنا دیا۔ چونکہ زیاد ایک آفت کا پرکالہ سیاست داں اور سلیم العقل اعلےٰ پایہ کا فصیح و بلیغ تھا اس لئے حضرت معاویہؓ نے اُسکو حضرت علیؓ کے گروہ سے توڑکر اپنے زمرہ میں شامل کرنے کے لئے یہ تمام کارروائی کی۔

---

[1] خاندان قریش مکہ کا معزز و بااثر خاندان تھا۔ حضرت محمد صاحب صلعم اسی خاندان سے تھے۔

معاویہؓ نے حکومت میں کتنی باتیں ایجاد کیں۔ عرب میں سب سے پہلے بادشاہوں کے لئے باڈی گارڈ انھوں نے مقرر کئے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ بادشاہوں کے لئے مقصورہ تیار کرایا جس میں خلیفہ یا بادشاہ عوام سے علیحدہ ہوکر نماز پڑھتا تھا اور باڈی گارڈ ننگی تلواروں کا پہرہ دیتا رہتا تھا۔ اس انتظام کا سبب یہ تھا کہ حضرت علیؓ ایک روز نماز پڑھنے کے لئے گھر سے نکلے تھے کہ کسی دشمن نے انکو قتل کر دیا۔ معاویہؓ کا تیسرا کام برید کی ایجاد تھی جسکا یہ مطلب تھا کہ تیز رفتار گھوڑے متعدد مقامات پر مقرر کئے جاتے تھے۔ جب کوئی شاہی قاصد اس مقام پر پہونچتا تھا تو وہ فوراً اپنے تھکے ہوئے گھوڑے کو وہاں چھوڑکر اُسکی جگہ ایک نیا گھوڑا بدل لیتا تھا۔ علاوہ انکے "دفتر مُہر دار" کے موجد بھی یہی تھے۔ جب خلیفہ کی طرف سے کسی امر کا فرمان صادر ہوتا تو اس دفتر میں اسکی نقل ہوتی تھی اور اسکے بعد اسکو دھاگے سے باندھکر اُسپر مُہر لگادی جاتی تھی تاکہ کوئی شخص فرمان میں کچھ ردّ و بدل نہ کرسکے اور نہ اُسکے مضمون سے واقف ہوسکے۔

حضرت معاویہؓ بڑے کھانے والے تھے وہ دن میں پانچ بار کھاتے تھے اور پانچویں بار کی غذا سب سے بڑھ چڑھکر ہوتی تھی اور جب کھاتے کھاتے تھک جاتے تو غلام سے فرماتے کہ دسترخوان اٹھا۔ میں بخدا ابھی سیر نہیں ہوا ہوں بلکہ اُکتا گیا ہوں۔ آپکی نسبت یہ مشہور ہے کہ آپ ہمیشہ باخبری کے ساتھ گویا ہوتے تھے۔ اور بُردباری سے چُپ رہتے تھے۔ جب وہ بخشش کرتے تو مالا مال کر دیتے اور جب لڑتے تو دشمن کو فنا کرکے چھوڑتے۔ اُنکے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اُنکو ریاست و حکومت کے لئے بالخصوص پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی رعایا کے شرفا پر بالعموم اور شرفائے قریش پر بالخصوص احسان کیا کرتے تھے حالانکہ شرفائے قریش آپکو ہمیشہ سخت اور مکروہ الفاظ میں مخاطب کیا کرتے تھے لیکن معاویہؓ کبھی انجان بنکر اور کبھی ہنسی میں ٹال دیتے تھے اور گراں قدر تحائف دیکر اُنکو رخصت کرتے تھے لیکن آپ کا لڑکا یزید قریشیوں کے اس قسم کے سلوک کو دابِ شاہی کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور شرفائے قریش کی بدسلوکی اور اپنے باپ کی بُردباری پر دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت معاویہؓ بیٹے جی سعد بن عبادہ سے جو انصاری تھے کہا کہ اے قیس بخدا میری خواہش تھی کہ تیرے کہ اسکے خاتمہ پر ہی تجھ کو ہمارے مابین جنگوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ اسپر قیس نے جواب دیا کہ مجھے یہ پسند نہ تھا طرزِ خطاب کا نمونہ ہے۔ ہو۔ اسپر معاویہؓ خاموش ہوگئے۔ یہ شرفائے قریش کے بہترین

ایک مرتبہ انھوں نے ایک

سخن سو دینار بھیجے جسکو اُس نے کم سمجھا اور

اپنے لڑکے سے کہا کر اُنکو واپس لے جاکر حضرت معاویہؓ کے مُنہ پر پھینک آئے۔ اور اُسکو قسم دلادی کہ ایسا ہی کرے۔ انصاری کے لڑکے نے یہ بات معاویہؓ سے جاکر کہی۔ اسپر اُنھوں نے لڑکے کا ہاتھ اپنے مُنہ پر رکھ لیا اور کہا کہ جو تمھارے باپ نے حکم دیا ہے اُسکی تعمیل کرو۔ اسپر وہ لڑکا شرمندہ ہوا اور اُسنے وہ درہم پھینک دئے اور معاویہؓ نے درہم کی مقدار دوچند کرکے انصاری کے پاس بھجوادے۔ جب یزید کو یہ حال معلوم ہوا تو غصہ ہوتا ہوا اپنے باپ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ نے تو بردباری کی حد ہی کردی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسکو آپ کی کمزوری اور بزدلی پر محمول نہ کیا جائے۔ معاویہؓ نے جواب دیا کہ تم ابھی بچے ہو بردباری کے ساتھ کبھی پشیمانی اور ندامت نہیں ہوتی۔ جاؤ اپنا کام کرو اور مجھکو میری مرضی کے مطابق کام کرنے دو۔

اسی قسم کے برتاؤ کی وجہ سے مہاجرین[1] و انصار[2] کے فرزندوں میں کا ہر وہ شخص جو خود کو حضرت معاویہؓ سے کہیں زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتا تھا سرنگوں ہوگیا۔

جب حضرت معاویہؓ کی وفات کا وقت قریب آیا جو سنہ ۶۰ ہجری میں واقع ہوئی تو اُنھوں نے اپنے فرزند یزید کو ایک وصیت کی جو اُنکی عقل و دانش و حالات سے باخبری اور مردم شناسی پر دلالت کرتی ہے۔ مگر یزید اسپر بالکل کاربند نہوا اور اِسی لئے وہ آج تک بدنام ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے جب خود کو موت کے چنگل میں پھنسا ہوا پایا تو اپنے فرزند یزید کو بُلاکر اس سے کہا کہ اُے بیٹے مَیں نے تم کو ہر قسم کی کدو کاوش سے بے نیاز، تمام اُمور کو تمھارے لئے ہموار، تمھارے دشمنوں کو ذلیل اور عربوں کی گردنیں تمھارے لئے خم کردی ہیں اور تمھارے لئے وہ سامان جمع کر دیا ہے جو کسی نے نہیں کیا۔ اِس لئے اہلِ حجاز کا خیال رکھنا کہ وہی تمھارے عزیز ہیں۔ ان میں سے جو تمھارے یہاں آئے اُسکی خوب خاطر و تواضع کرنا اور جو غیر حاضر ہوں اُنکی بھی خبر رکھنا۔ اہلِ عراق کی ہر وقت دلداری کرتے رہنا۔ اگر وہ یہ خواہش کریں کہ تم ہر روز ایک گورنر بدل دیا کرو تو ایسا ہی کرنا، ایک گورنر کا بدل دینا اس سے زیادہ اچھا ہے کہ تم پر تلواریں بے نیام کی جائیں۔ اہل شام کا خیال رکھنا کہ وہ تمھارے اندرونی راز دار ہیں کسی دشمن کی جانب سے اندیشہ پیدا ہو تو اُنکی مدد لینا اور بعد حصول مقصد اُنکو واپس کردینا ورنہ اُنکے اخلاق بگڑ جائینگے۔ مجھے صرف چار قریشی کا اندیشہ ہے

[1] مہاجرین وہ لوگ تھے جنھوں نے حضرت محمد صاحب صلعم کے سا...
[2] انصار وہ لوگ تھے جنھوں نے حضرت ... انصاری کہلاتے تھے۔

کہ وہ تم سے حکومت کے لئے جھگڑا کریں وہ حسینؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن الزبیرؓ اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکر ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کو تو عبادت نے کمزور کر دیا ہے اور جب کوئی اور تمہاری بیعت سے پیچھے نہ رہیگا تو وہ بھی بیعت کر لینگے۔ رہے حسینؓ وہ کمزور ہیں مگر اہلِ عراق کے کہنے سننے سے وہ ضرور لڑائی پر آمادہ ہونگے۔ پس اگر وہ جنگ کریں اور تم کو ان پر فتح حاصل ہو تو انکی جان بخشی کر دینا کیونکہ وہ حضرت محمد صلعم کے نواسہ اور قابلِ احترام ہیں۔ عبداللہ ابن ابی بکر کی بابت یہ ہے کہ جب وہ اپنے اصحاب کو تمہاری بیعت کرتے دیکھیں گے تو وہ بھی بیعت کر لینگے انکی ہمت تو عورتوں کی سی ہے اور وہ لہو و لعب میں مصروف رہتے ہیں۔ البتہ وہ شخص جو موقع پاکر تمہارے سامنے شیر کی طرح ڈٹ جائیگا اور لومڑی کی طرح پینترے بدلیگا وہ عبداللہ ابن الزبیر ہے پس اگر وہ تم سے لڑے اور تم فتحیاب ہو تو اسکی بوٹی بوٹی کاٹ ڈالنا۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنی قوم کا خون بہانا۔

سنہ ہجری میں حضرت معاویہؓ کے انتقال کے بعد انکا لڑکا یزید حکمراں ہوا۔ یہ لہو و لعب شکار۔ شراب کا شیدائی اور عیاش مزاج تھا۔ ظاہری رعب و داب سلطنت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ مے نوشی و عیاشی میں تمام وقت صرف کرتا تھا۔ اسکی زندگی کا کوئی اصول نہ تھا اور نہ اسکے کام کسی اصول پر مبنی ہوتے تھے۔ شعر گوئی میں کمال حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ عرب میں شاعری ایک بادشاہ سے شروع ہوئی اور ایک بادشاہ پر ختم ہوئی جسکا یہ مطلب ہے کہ عرب میں شاعری یزید سے شروع ہوئی اور امرؤالقیس پر ختم ہوگئی۔ یوں تو عرب میں بہت سے شاعر ہوئے ہیں لیکن شاعری کے جو کمالات اور نزاکتیں ان دونوں کے کلام میں موجود ہیں وہ دوسروں کے یہاں نہیں پائی جاتی ہیں یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کے لئے مشہور ہے کہ ایک ترک یعنی امیر خسرو سے شروع ہوئی اور ایک ترک یعنی مرزا غالب پر ختم ہوئی۔ بطور نمونہ یزید کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

۱- جاءت بوجہ کأن البدر برقعہٗ نوراً علی مائس کالغصن معتدلِ

ترجمہ اُس لچکدار قد پر جو شاخ کی طرح سیدھا تھا وہ چہرہ لائی جس پر گویا ماہ چہاردہم نے نور کا برقعہ پہنا دیا تھا

۲- احدی یدیہا تعاطینی مشعشعۃ کخدّہا عصفرت صبغتہ الخجلِ

ترجمہ۔ اسکا ایک ہاتھ مجھکو پانی ملی ہوئی شراب دے رہا تھا جو اسکے رخسار کی طرح سرخ تھی جو شرم سے عرق آلودہ ہو رہے تھے

۳- ثم استبدت وقالت وہی عالمۃ بما تقول وشمس الراح لم تفلِ

ترجمہ پھر وہ سختی سے بولی ناراض ہو کر جانے کے لئے کہنے لگی اور اسطرح گفتگو کرنے لگی گویا کہ وہ بیہودہ [illegible]

۴۔ لا ترملن فما ابقیت من جلدی ما استطیع بہ تودیع مرتحل

ترجمہ۔ تو رخصت نہ ہو کیونکہ تو نے مجھ میں اتنا صبر نہیں چھوڑا جس سے میں کسی مسافر کو رخصت کر سکوں

۵۔ ولا من النوم ما القی الخیال بہ ولا من الدمع ما ابکی علی الطلل

ترجمہ۔ اور نہ تو نے نیند ہی چھوڑی ہے جس میں تیرے خیال سے خواب میں مل سکوں اور نہ آنسو ہی جو تیرے گھر کے کھنڈر پر رو سکوں

یزید کی مدت حکومت تین سال چھ ماہ ہے۔ پہلے سال میں حضرت امام حسینؑ کو شہید کیا۔ دوسرے سال میں جنگ زمین سیاہ (حرّہ) ہوئی جس میں مدینہ فتح کیا اور تین دن تک قریش قتل کئے گئے۔ صنف نازک کی عصمت دری ہوتی رہی۔ اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ کے بعد جب کوئی مدینہ کا آدمی اپنی بیٹی کا نکاح کرتا تو اُسکی بکارت کی ضمانت نہ کرتا۔ تیسرے سال کعبہ پر فوجکشی کی۔ اہل مکہ کی جانب سے ابن الزبیر مقابلے کو نکلے لیکن ہنوز جنگ شروع نہ ہوئی تھی کہ یزید کی موت کی خبر سے جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اسکا لشکر مکہ سے واپس چلا گیا۔ جنگ کربلا جس میں حضرت امام حسینؑ شہید ہوئے اسلامی تاریخ کا وہ زبردست واقعہ ہے جس نے مسلمانوں کو دو زبردست گروہوں شیعہ اور سنی میں تقسیم کر دیا۔ اور انکے مابین دشمنی کی آگ روشن کر دی جو تیرہ سو برس گذر جانے پر بھی بالکل ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔

اسکی مختصر کیفیت یہ ہے کہ یزید کی جب بیعت ہوئی تو اسکو بجز اسکے اور کوئی فکر نہ تھی کہ حضرت امام حسینؑ اور نیز اُن لوگوں کی جن سے اسکے والد نے اسکو ڈرایا تھا بیعت لے۔ اس نے اس نے ولید بن عتبہ ابن ابی سفیان مدینہ کے گورنر کو خط لکھا کہ وہ ان لوگوں سے بیعت لے لیں۔ اس نے امام حسینؑ کو بلایا اور اُن کو معاویہؓ کی وفات اور یزید کے حکم کی اطلاع دی۔ حسینؑ نے جواب دیا۔ کہ مجھ جیسا آدمی پوشیدہ بیعت نہیں کر سکتا۔ اسکے بعد حضرت حسینؑ مدینہ سے مکہ کو روانہ ہو گئے۔ آپ کے مکہ پہونچنے پر اہل کوفہ کو آپ کے یزید کی بیعت سے منکر ہونے کا حال معلوم ہوا۔ یہ لوگ بنو امیہ کو بالعموم اور یزید کو بالخصوص ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ کھلم کھلا معاصی کا مرتکب ہوتا۔ اور اعمال بد کا شیدائی تھا۔ اہل کوفہ نے حسینؑ کے پاس چند خطوط روانہ کئے اور انکو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ اسپر انھوں نے اپنے چچیرے بھائی مسلمؓ بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔ وہاں وہ ہانی بن عروہ کے مکان میں مقیم ہوئے۔ جب عبید اللہ بن زیاد گورنر کوفہ کو اسکی خبر ملی تو اسنے ہانی کو جو شرفائے کوفہ سے تھا۔ بلوایا اور مسلمؓ کو اس سے طلب کیا۔ اور انکار کرنے پر چھڑی سے ہانی کا منھ توڑ دیا گیا۔ مسلمؓ بھی گرفتار ہو کر بایں حال گورنر کے سامنے پیش ہوئے۔ اور اُس نے حکم دیا کہ ان کو محل کی دیوار پر کھڑا کر کے

قتل کیا جائے جس سے اُن کا سرِ مبارک بلندی سے زمین پر گرا۔ اور پھر دھڑ کو بھی نیچے پھینک دیا گیا۔ اس طرح نعش کی توہین کرکے یزید کے گورنر نے اپنی بدطینتی کا ثبوت دیا۔ بعد ازاں ہانی کو بازار میں لیجا کر قتل کیا۔

اس واقعۂ خونچکاں کے بعد حضرت امام حسینؓ بغیر مسلمؓ کا حال معلوم کئے ہوئے مکہ سے کوفہ کو روانہ ہوگئے۔ جب کوفہ کے قریب پہنچے تو کچھ آدمیوں نے انکو اصل حقیقت سے آگاہ کرکے واپس چلے جانے کا مشورہ دیا۔ مگر کسی ایسی غرض سے جو وہ اور لوگوں سے زیادہ سمجھتے ہونگے وہ واپس نہ لوٹے۔ اور کوفہ جانے کا پختہ عزم کرلیا۔ ابن زیاد نے اُنکے مقابلے میں ایک لشکرِ عظیم بھیجا جسکا سپہ سالار عمر بن سعد تھا۔ جب دونوں صفیں میدانِ کربلا میں برسرِ پیکار ہوئیں تو بقول مولانا شبلی نعمانی حضرت امام حسینؓ کے جاں نثاروں کی قلیل جماعت کا دشمنوں کی ہزاروں کی جمعیت کے مقابلے میں جنگ کرنے سے تھوڑی سی دیر میں ہی ع

"لٹ گیا خون شہیدوں کا ترے ہاتھوں ہاتھ"

والا معاملہ ہوگیا۔ مزید براں جنگِ کربلا میں جو خونریزیاں۔ گرفتاریاں۔ مُثلہ۔ وبیاکانہ سفاکیاں منجانب یزید ہوئی ہیں وہ تاریخِ دنیا میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ لیکن جن اُصولوں پر مر مٹنے کے لئے یہ قربانیاں ہوئیں۔ اور جس بہادری۔ صبر۔ للہیت۔ پرہیزگاری۔ آدابِ جنگ میں مہارت اور فصاحت و بلاغت کا اظہار حضرت امام حسینؓ اور اُنکے رفقائے کار سے ہوا انکی بدولت پکا شمار دنیا کی اُن برگزیدہ ہستیوں میں ہوگیا ہے جنکی تمثیل مُردہ قوموں میں زندگی کی ایک لہر پیدا کردیتی ہے۔ اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

رباعی

ہر دل ترے غم کے میہمانوں میں ہے　　ہر جسم ترے سوختہ جانوں میں ہے

بجھتی نہیں بعد مرگ بھی آتشِ شوق　　ثابت ہے کہ آگ استخوانوں میں ہے

شوق قدوائی مرحوم

محبؔ

(از حکیم سید احمد اللہ قادری)

شیخ ولی اللہ المتخلص بہ محبؔ بارھویں صدی ہجری کے اخیر زمانہ میں گذرے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اُردو شاعری کا آفتاب نصف النہار ترقی پر تھا اور گھر گھر شعر و سخن کا چرچا تھا

محبؔ اگرچہ مشاہیر شعراء سے نہیں ہیں۔ لیکن اُردو شاعری میں بلند پایہ ضرور رکھتے ہیں، اور دلی کے باکمال شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، میر حسنؔ کا تذکرہ اُردو شاعروں کے تذکروں میں سب سے پہلا ہے جس میں محبؔ کا ذکر موجود ہے، یہ تذکرہ محبؔ کی زندگی میں تصنیف ہوا تھا۔ اسکے بعد متعدد تذکرے تالیف ہوئے ان میں بہت سے ایسے ہیں جنمیں محبؔ کے حالات ملتے ہیں، لیکن ان سے بہت کم کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

تذکرہ نویسوں نے محبؔ کو شعراء دہلی میں شمار کیا ہے۔ اور مشہور یہ ہے کہ دلی میں رہا کرتے تھے، لیکن خود محبؔ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ علاقہ سرہند میں قصبہ انبالہ انکا وطن تھا۔

محبؔ ہندوستاں زادوں کی گویائی کو کیا پہونچے سخن کہنے میں ہو جس کا وطن سرہند انبالہ

شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں وطن سے دلی آئے۔ اور ارباب کمال کی صحبتوں میں شریک ہوکر کمال حاصل کیا، شاہی دربار تک رسائی ہوئی، قمر الدین منتؔ، میاں شکیباؔ، ثناء اللہ خاں فراقؔ قدرت خان قاسمؔ، یہ سب دلی میں موجود تھے۔ ان سے محبؔ نے معاصرانہ تعلقات پیدا کئے۔ اُس زمانہ میں کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے، جن میں قریباً تمام شعراء شرکت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نواب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر کے مکان پر مشاعرہ منعقد ہوا جسمیں خاصا مجمع تھا۔ اور شعراء اپنے اپنے کلام سے اہل مجلس کو محظوظ کر رہے تھے جب مرزا عظیم بیگ عظیمؔ کی باری آئی اور انھوں نے

اپنی غزل سنائی تو سید انشار اللہ خاں انشار نے اعتراض کیا جس سے مرزا عظیم بیگ کے دل کو سخت صدمہ ہوا، اور انھوں نے دوسرے دن انشار کی ہجو کہی۔ اس پر انشار نے بادشاہ سے جاکر عرض کیا کہ لوگ آپ کی غزل پر خواہ مخواہ ہنستے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بادشاہ نے غزل بھیجنی موقوف کردی۔ یہ واقعہ جب شعرار کو معلوم ہوا تو سب کمر بستہ ہوکر دربار میں گئے۔ اس موقعہ پر بادشاہ کے سامنے محبؔ نے ذیل کی غزل سنائی۔

سر بہ خط فرماں رہے تحریر کے آگے
ہو لال زباں داں مری تقریر کے آگے

دل ہے سو نگہ تیرے کے ہے تیر کے آگے
سر ہے سو خمیدہ دم شمشیر کے آگے

تدبیر پڑی ٹھوکریں کھاتی رہی پیچھے
یاں حضرت انساں تیری تقدیر کے آگے

ہوتا ہے ہمیں محو خدائی کا بھی آداب
جا نکلے ہیں جب اُس بت بے پیر کے آگے

شیطاں جسے کہتے وہ اے شیخ مزور
پیچھے ہی رہے ہے تیری تزویر کے آگے

کیا معنے ہے آئینہ نہ پانی ہو بصد رنگ
اُس پر قلموں شوخ کی تصویر کے آگے

کس طرح نہ ہو سلسلہ زنجیر کا بر پا ؟
دیوانوں سے اُس زلف گرہ گیر کے آگے

پیچھے ہی ہے عشق کے سہ لت سے تہمتن
گو رستمی اپنے سے وہ ہو تیر کے آگے

مبحث میں پکے چاہیئے تعلیمہ شرار کا،
اس فن کے کسی صاحب توقیر کے آگے

ہے نقص جو شاعر ہوئے فریادی ورادی
اکبر کے حضور اور جہانگیر کے آگے

نیزے پہ ہدف کرکے رکھیں ہم سر حاسد
اور تیر قلم اپنے کے سر تیر کے آگے

ہو رستم میدان سخن کے بھی ہمارا
یک مصرعہ سو مصرع شمشیر کے آگے

جو عرض مطالب کرے مقصد ہی کو پہونچے
باصدق محبؔ حضرتِ شبیر کے آگے

مرزا سلیمان شکوہ دلی کے مشہور شہزادے تھے ان کو شعر و سخن کا خاصا چسکا تھا، حاتم اور انشار کے شاگرد تھے غزل خوب کہا کرتے تھے۔ محبؔ[1] جب دلی میں آئے تو کچھ عرصہ کے بعد انکی سرکار میں توسل پیدا کیا اور غزلوں کا بنانا ان کو تفویض ہوا، اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ شہزادے نے بعض واقعات کے باعث دلی کی سکونت چھوڑ دی، اور وہاں سے نکلکر لکھنؤ چلے گئے۔ جسکے باعث محبؔ کا سہارا جاتا رہا۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی دلی کو خیرباد کہا اور فرخ آباد آکر وہاں نواب مہر خاں کی

[1] گلستان سخن صفحہ ۴۲۸

کی مصاحبت میں زندگی بسر کرنے لگے۔

جس وقت میر حسن نے تذکرۂ شعراے اُردو کو تمام کیا ہے[1]۔ محب فرخ آباد میں رہا کرتے تھے اس کے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ چلے گئے اور پھر مرزا سلیمان شکوہ کے ندیموں میں شامل ہوگئے۔ اور حسب سابق اُن کا وظیفہ جاری ہوگیا۔

مرزا سودا کے انتقال کے بعد اس زمانہ میں جب کہ جان گلکرسٹ نے زبان دانان ریختہ کو لکھنؤ طلب کیا، اور لکھنؤ میں کلکتہ پہنچنے کے لیے میر تقی میر منتخب ہوئے[2]۔ تو اسوقت محب لکھنؤ میں موجود تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے ایک شعر میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

سودا تو آرام کو ہوئے رخصت یہ غزل سن
کلکتہ کو ہوں لکھنؤ سے میر مرخص

اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ محب سودا کے شاگرد تھے۔ لیکن خود محب کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سودا سے شاگردی کا تعلق نہ تھا بلکہ انکے کلام کی اتباع کیا کرتے تھے۔

شاگرد گو نہیں ہوں یہ انداز گفتگو
فیضان نطق مجھ کو ہے مرزا رفیع کا

محب نے لکھنؤ آنے کے بعد اپنی زندگی کے اخیر ایام اسی شہر میں گذارے اور یہیں فوت ہوکر پیوند خاک ہوئے۔

مولوی عبد الکریم نے تذکرۂ شعراے اُردو میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۲۰۸ھ میں محب نے انتقال کیا مولانا عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے بھی اسی قول کا اتباع کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب لکھنؤ سے کلکتہ بھیجنے کے لیے میر تقی میر کی تقریب کی گئی تھی تو اُسوقت محب بقید حیات موجود تھے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۱۳ھ مطابق سنہ ۱۷۹۹ء کا ہے۔

مصنف آبحیات لکھتے ہیں کہ جب سودا اور میر نہ تھے تو اُسوقت محب کا وجود لکھنؤ میں تھا۔ میر نے سنہ ۱۲۲۵ھ مطابق سنہ ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ محب کا انتقال میر کی وفات کے بعد واقع ہوا ہے۔

محب کے دیوان کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے غالباً خود انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا مسلک امامیہ تھا۔

پردے سے ذکر ہاتھ نکلنے کا ہے جو سچ
تو بھی محب علی کو خدا جوں نصیری بول

خوف محشر کا محب اب تو غلط ہے تجھکو
کہ مددگار ترے شاہ خراسان ہوئے

[1] میر حسن کا تذکرہ سنہ ۱۱۹۱ھ اور سنہ ۱۱۹۲ھ کے مابین ختم ہوا ہے۔ [2] گلشن ہند صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۳

محب نے اپنے کلام میں جا بجا سودا کی تعریف کی ہے۔ یا اُنکے کلام کو تضمین کر لیا ہے۔ یا اُنکے حق میں دعا کی ہے۔

ریختہ کے ملک کا سودا کو بجنا تو نے راج — اس نگر میں کون ایسا ناظم و ناثر ہوا اب

تو نے سُنی ہے مصرعۂ سودا سے وہ مثل — آوازۂ دہل ہے خوش آیند دور کا

ہجر میں اس کے محب عجب بقول سودا — ہو گئی جان ہوا ایک نفس سرد کے ساتھ

سودا کی مغفرت پہ یقین ہے کہ وہ محب — ورد زباں ہمیشہ رکھے تھا علیؑ علیؑ

سودا تو ارم کو ہوئے رخصت یہ غزل سُن — کلکتہ کو ہوں لکھنؤ سے تیرہ غرض

محب نے اپنے اشعار میں روزمرہ کے واقعات یا سامنے کی تشبیہیں نہایت خوبی کے ساتھ بیاں کیں ہیں۔

وہ گلعذار باغ میں آوے جو رحم کر — کہتے ہیں گل گلوں سے کریں آج رت جگا

گرگٹ کی طرح سرخ و سفید و کبود و زرد — بدلے ہے شیخ ریش کا تیرے خضاب رنگ

فرقت میں دل کو ہر شب پہنچے ہے داغ تازہ — اس گھر میں روز روشن ہوئے چراغ خانہ

محب نے تلازمہ بندی میں کمال دکھایا ہے۔ بعض اشعار میں ضلع کا استعمال اسقدر کیا ہے کہ اُسکے باعث معنی بھی خبط ہو گئے ہیں۔

اُس لب شکر کے وصف میں شک کر نہ بات بول — بیشک جو بولنا ہے محب تو نبات بول

بعض اشعار ایسے بھی ہیں جس سے انکا استغنا پایا جاتا ہے۔

عاشق تو خطاب اپنا ہے عشق کی دولت سے — اب ہم کو نہیں خواہش خانی و نوابی کی

ایک غزل میں جسکا قافیہ۔ یہ۔ بہ۔ زہ۔ وہ۔ ہے۔ رہ؛ بھی قافیہ باندھ دیا ہے جس سے اختلاف توجیہہ واقع ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کو جائز سمجھتے ہوں مطلع یہ ہے۔

جو کروں ترک ملاقات اس سے تو مشکل ہے یہ — غیر سے ملتے اُسے دیکھوں تو ہے ناگفتہ بہ

اس کے مقطع میں کہتے ہیں۔

سینہ پر لوٹے ہیں اُس شوخ کے تیر نگاہ — تا کہیں ہمسر محب صد آفریں شاباش رہؔ

بعض اشعار ایسے بھی کہے ہیں جنکے معنی کی تکمیل کے لئے کچھ مقدمات لینے پڑتے ہیں، اگر نہ لیں تو شعر بے معنی رہ جاتا ہے۔

عالمت تیغ کی کرتا انہیں زنگ — اگر اشراف کے کچھ بھی ہوں پیسے

ؔ حاشیہ: اصل میں یہ لفظ "ن" تھا۔ زیر نقطہ نہ ہونیکی وجہ سے لائق مضمون نگار نے اسکو "رہ" پڑھا ہے۔ مدیر زمانہ

درد علیہ الرحمۃ کے ایک مصرعہ کو محب نے اس طرح تضمین کیا ہے۔

یہ زمانہ محب بقول درد، آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے ٭

درد کا شعر یہ ہے۔

دل بھی تیرا ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے ٭

درد نے اس مصرعہ سے معشوق کے تلون طبع کو ظاہر کیا ہے۔ بخلاف اسکے محب نے اس سے انقلاب زمانہ کی کیفیت نمایاں کی ہے۔ اور اس طرح پر محب کا شعر درد کے شعر سے زوردار ہو گیا ہے۔

محب کے کلام میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ان کے معصر بلند پایہ شعراء کے کلام میں موجود تھیں۔ ان کے اشعار میں بعض ایسے بھی الفاظ ہیں۔ جو آج کل متروک سمجھے جاتے ہیں، مثلاً "ٹک" اور "سج" وغیرہ

ٹک دیکھ محب دیدۂ حق بیں سے کہ تیرا ہے دوست دلی کون عدو کون ہے جان کا

ہم سج ہی سیر زمانہ کی کر گئے ٭ ٭ معلوم بھی نہیں کدھر آئے کدھر گئے

ان کے کلام میں بعض الفاظ ایسے بھی موجود ہیں جو آج کل ہمارے کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں جیسے ان اشعار میں "اوجھیڑا" اور "پوپٹے" ہیں۔

کس سے سلجھے ہے ہمارا اُسکا اوجھیڑا محب چاہ اُس کی دل سے ریشم کی گرہ رکھتے ہم

شب فراق نہ کاٹے کٹے ہے کیا کیجے نہ صبح ہوتی ہے نہ پوپھٹے ہے کیا کیجے

یا جیسے اس شعر میں لفظ موقع کا قدیم استعمال۔

آتے ہی دم جو کہو یہاں سے جانا موقع ایسے آنے سے تو اے یار نہ آنا موقع

محب نے عمو ناً فعل حال کے عوض مضارع کیساتھ حرف ربط کو استعمال کیا ہے یہی کیفیت انکے بعد عرصہ تک رہی ہے جیسے اشعار ماسبق میں "سلجھے ہے"، "پوپھٹے ہے"

ان کی ایک غزل میں محب کی جمع محبان دیکھ کر تعجب ہوا۔ جس زمانہ میں محب گذرے ہیں ایسی جمع کا استعمال نہ لکھنؤ میں تھا نہ دلی میں۔

غزل ایک اور بھی لکھے محب ان کے بحث میں ساعت کی ہوس باقی نہ رہے سامعے محبان کو

ہم اپنے مضمون کے خاتمہ پر محب کے دیوان سے چند شعر بطور نمونہ نقل کرتے ہیں تاکہ وہ لوگ جن کی نظر سے استاد دیوان نہیں گذرا ہے مستفید ہو سکیں۔

(۱)

شاید کے لکھا ہوں تھا تقدیر الٰہی میں — عاشق کی رہے کشتی امواج تباہی میں
یوں دل کے سویدا میں روشن ہے تری صورت — جوں چشمۂ حیوان کا ہو نور سیاہی میں
ہے مشرب رندان میں بالفعل تو مے رائج — اس امر کو زاہد نے سمجھا ہے مناہی میں
معراج گدائی کا ہوتا نہیں کم ہرگز — پستی و بلندی ہے یاں افسر شاہی میں
دریا میں حباب آسا کیا مظہر وحدت ہے — جو غرق سراپا ہے اسرار الٰہی میں

ہر برگ گل لالہ ایک مظہر خونی ہے
سینہ کے محب تیرے داغوں کی گواہی میں

(۲)

مے جو گلگوں کے شیشہ میں بھری رہتی ہے — چشم مستوں میں عجب جلوہ گری رہتی ہے
نالہ بلبل ہے چمن زار ہے دل داغوں سے — آہ تا صبح نسیم سحری رہتی ہے
لب و چشم اپنے ہیں ایک عالم خشکی و تری — عشق کی سلطنت بحر و بری رہتی ہے
اشکباری سے غم و درد کی کھیتی باڑی — لہلہے سی نظر آتی ہے ہری رہتی ہے
بے نشاں زخم سے اس تیر نگہ کے دل ہے — درد رہتا ہے نہ پیکاں نہ سری رہتی ہے

دلکو لے ڈوبتی کیونکر نہ نظر آتے محب
کشتی چشم تر پانی سے بھری رہتی ہے

(۳)

ہزار صاحب تدبیر ہو تو کیا حاصل — موافق اس سے نہ تقدیر ہو تو کیا حاصل
ملے سے عاشق و معشوق کی بڑی ہے قدر — جدا کمان سے گر تیر ہو تو کیا حاصل
گرے جو یار کی نظروں سے ہو وہ خیر نہیں — ہزار صاحب توقیر ہو تو کیا حاصل
نہ حرف ہو نہ حکایت خموش مجلس عیش — بہ شکل صفحۂ تصویر ہو تو کیا حاصل

جہاں کو پائے قناعت سے لے محب کر سیر
جو دست حرص گلوگیر ہو تو کیا حاصل

پریرویوں سے الفت کا عجب سودا کیا ہم نے — کہ عقل و ہوش سب کھو کر جنوں پیدا کیا ہم نے

کچھ اندنوں طبیعت ہے آپ کی کشیدہ	آگے نہ تم میں ہم میں مطلق نہ تھا تکلف
وہ بت بیگانہ وش یارب ہے کیسا آشنا	جو ہے اُس کا آشنا عالم سے ہے نا آشنا
دل نخود رفتہ و خود کام خود داری کو کیا جانے	شراب بیخودی کا مست ہوشیاری کو کیا جانے
عشق کا بوجھ فرشتوں سے تو مطلق نہ اُٹھا	اُس کے حامل جو ہوئے حضرت انسان ہوئے
بڑھ چکے تو ایک بوسہ پہ اے یار اور بھی	ہیں جنس دل کے ورنہ خریدار اور بھی
میں کاہے کو تھا عشق کے دریا کا شناور	دل کی نہیں تقصیر ان آنکھوں نے ڈبویا

محب کے حالات کتب ذیل میں دیکھئے۔

(۱) تذکرۂ شعرائے اُردو	عبدالکریم	دہلی	۱۲۶۵ھ
(۲) گلشن بے خار	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	نولکشور	۱۲۹۱ھ
(۳) سخن شعرا	عبدالغفور خاں نساخ	نولکشور	۱۲۹۱ھ
(۴) نغمۂ عندلیب	حکیم قطب الدین خان باطن	نولکشور	۱۲۹۱ھ
(۵) آبحیات	محمد حسین آزاد	مجتبائی لکھنؤ	۱۳۱۴ھ
(۶) تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسن	علیگڑھ	۱۳۴۰ھ
(۷) قاموس المشاہیر جلد دوم	نظامی بدایونی	نظامی پریس	۱۳۴۵ھ
(۸) رسالہ اُردو	مرتبہ مولانا عبدالحق	اورنگ آباد	۱۳۴۶ھ
(۹) دیوان محب	شیخ ولی اللہ محب		

شبستان (لاہور) غالباً یہ اپنی وضع کا واحد اُردو رسالہ ہے جو صرف سینما کے متعلق مضامین شائع کرتا ہے۔ اسکے ایڈیٹر دیوان آتم آنند صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ آر۔ ایس (لندن) ہیں جو نہایت قابلیت سے اسکو مرتب کرتے ہیں۔ یورپ کے مشہور ایکٹروں کی تصاویر اور حالات نیز فلم بنانے کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس رسالہ کا ایک حصہ انگریزی زبان کے مضامین کے لئے بھی مخصوص ہے سینما سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اسکا مطالعہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔ تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت قریب جزو قیمت سالانہ چار روپیہ للعمر

حضرت قائم چاندپوری

از جناب تراز چاندپوری

استاذ الاساتذہ حضرت قائم چاندپوری کا نام اگرچہ دنیائے ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، لیکن بعض دوسرے متقدمین شعراء کی طرح اُنکے ذاتی حالات پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے اور مختلف و متعدد تذکروں میں جس قدر حالات پائے جاتے ہیں اُن سے قائم صاحب کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں، البتہ ہر تذکرہ نویس اُنکے کمال فن کا معترف و مداح ہے، حتیٰ کہ بعض حضرات نے انکو میر و سودا (حالانکہ وہ سودا کے شاگرد تھے) جیسے مسلم الثبوت اساتذہ پر تفوق و برتری دی ہے اور اُنکے کلام کو سراہا ہے، لیکن اس وقت میرا موضوع سخن قائم صاحب کے کلام سے بحث کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اُنکے حالات کی تحقیق مدنظر ہے۔

چونکہ راقم الحروف کا مولد و مسکن چاندپور ہے لہذا فطرۃً مدت سے یہ خیال تھا کہ وطن جانے کا موقع ملے تو قائم صاحب کے مفصل حالات بہم پہنچاکر دنیا کے روبرو پیش کردوں، مگر ہنوز یہ خیال عملی صورت اختیار نکرنے پایا تھا کہ رسالہ "نگار" بابت ماہ اگست ۱۹۳۰ء میں حضرت سعیدی کا ایک مضمون بعنوان "قائم چاندپوری" نظر سے گزرا اور وطن جانے کا موقع ملنے کا انتظار فضول سمجھکر اپنے ایک عزیز کے توسل سے قائم صاحب کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اسمیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم جس قدر حالات معلوم ہوسکے وہ میرے اطمینان کے واسطے کافی تھے۔

سب سے پہلا مختلف فیہ مسئلہ نام کا ہے بعض تذکروں میں ان کا نام شیخ محمد قیام الدین مذکور ہے۔ بعض میں شیخ محمد قائم، بعض میں قائم الدین اور بعض میں قیام الدین علی۔ غرض تمام تذکرے مختلف البیان ہیں، لیکن اسکا فیصلہ نہایت آسانی کے ساتھ اس طرح ہوجاتا ہے کہ شیخ محمد حسن صاحب جو قائم صاحب کی نسل میں اس وقت چاندپور میں موجود ہیں راقم الحروف کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"سچا نام محمد قائم تھا بعض تذکروں میں آپکا نام جو قیام الدین لکھا ہوا ہے وہ غلط ہے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ آپکے والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا نام محمد اکرم تھا۔ نیز آپ کے صاحبزادے کا نام محمد منعم تھا۔ اس صورت میں آپکا نام قیام الدین کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔"

چونکہ تذکروں کی روایات کے مقابلے میں منشی محمد حسین صاحب کا مذکورۂ بالا بیان زیادہ قابلِ قبول ہے لہٰذا قائمؔ صاحب کے نام میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اُن کا نام صرف محمد قائم تھا، مگر حال ہی میں انجمن ترقیٔ اُردو نے قائمؔ صاحب کا مرتب کردہ تذکرۃ الشعراء موسومہ بہ "مخزنِ نکات" شائع کیا ہے، اُسکے مطالعہ کے بعد نام کے مسئلہ میں پھر ایک بحث پیدا ہو جاتی ہے یعنی مذکورۂ بالا تذکرہ کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے خود قائمؔ صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"...... فقیر مؤلف محمد قیام الدین قائمؔ بعد کوشش تام وسعی تمام دو دورین ایں اعزہ فراہم آوردہ پارۂ ابیات از ہر کدام بر سبیلِ یادگار در ذیل ایں بیاض کہ "مخزنِ نکات" موسوم است بقیدِ قلم در آوردہ"

اور آخر میں اپنے ذاتی حالات بیان کرتے ہوئے بھی اسی کا اعادہ کیا ہے:-

"آلودۂ انواعِ جرائم فقیر مؤلف قیام الدین قائمؔ ہر چند از باشندگانِ قصبۂ چاندپور است امّا از بدوِ شعور تا ایں حال بتوسل نوکری بادشاہی بدار الخلافت شاہجہان آباد گزارندہ ......"

اب ایک طرف مندرجۂ بالا تحریری شہادت موجود ہے اور دوسری جانب منشی محمد حسین صاحب کا زندہ بیان- دونوں اپنی اپنی جگہ قابلِ قبول ہیں- اور ان دونوں بیانات کو مدِّ نظر رکھکر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دراصل قائمؔ صاحب کا نام تو محمد قائمؔ ہی تھا مگر بعد میں یا تو خود یا احباب کے کہنے پر انھوں نے اپنے نام میں ایک معنی خیز تبدیلی کر دی- کیونکہ محمد قائم کے مقابلہ میں محمد قیام الدین میں معنویت زیادہ ہے اور اس طرح نام کے بعد تخلص (محمد قائم قائمؔ) کا لانا جو مُخلِ فصاحت تھا اُسمیں بھی ایک خوبی پیدا ہو گئی- واللہ اعلم بالصواب -

نام کے بعد سنِ وفات کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے- تذکروں میں انکا سالِ وفات باختلاف ۱۲۰۷ھ- ۱۲۰۸ھ- اور ۱۲۱۰ھ پایا جاتا ہے- منشی محمد حسین صاحب خاندانی روایات کی بناء پر قائمؔ صاحب کا سالِ وفات سنہ ۱۲۱۰ھ اور انکا رامپور میں انتقال فرمانا بتاتے ہیں- لیکن ان کے انتقال کی جو تاریخ میاں جرأتؔ نے کہی ہے اور اُسکا ایک شعر "مخزنِ نکات" کے دیباچہ میں نقل کیا گیا ہے اُس سے ۱۲۰۸ھ نکلتے ہیں اور زبانی روایت کے مقابلہ میں یہ زیادہ قرینِ صواب ہے-

تاریخ پیدائش کے متعلق کہیں کوئی ذکر موجود نہیں اور ذاتی حالات جس قدر مختلف تذکروں میں پائے جاتے ہیں اُن سے زیادہ کوئی قابلِ قدر و مفید بات منشی محمد حسین صاحب سے بھی معلوم نہیں ہو سکی- البتہ نسب کی بابت منشی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ خاندانی شجرہ جو

کسی زمانہ میں اُن کے یہاں موجود تھا اور اب گم ہو گیا ہے اسکے مطابق قائم صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرمؑ تک پہنچتا ہے مگر نسب نامہ کی عدم موجودگی میں انکو اسپر اصرار نہیں کہ قائم صاحب واقعی علوی تھے۔

بعض دوسرے اساتذہ کے کلام کی طرح قائم صاحب کا کلام بھی کمیاب ہے۔ انکے دیوان کا ایک مختصر انتخاب اب سے چند سال پہلے مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا تھا۔ اب منشی محمد حسین صاحب سے معلوم ہوا کہ دیوان قائم کا ایک مکمل نسخہ جو اُنکے پاس تھا مولوی ظفر الملک علوی صاحب کے حوالہ کر دیا گیا ہے اور امید ہے کہ عنقریب الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوگا۔

اس سلسلہ میں غالباً یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ تمام تذکروں میں چاندپور کو ملحقات مرادآباد میں شمار کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ عہدِ مغلیہ میں ملک کی تقسیم ایسی ہی ہو لیکن آجکل موجودہ حکومت کے زمانہ میں مرادآباد اور بجنور دو علیحدہ علیحدہ اضلاع ہیں جن کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں اور چاندپور ضلع بجنور کا ایک قصبہ ہے۔

نور اللغات (جلد سوم) مرتبۂ مولوی نور الحسن صاحب نیر ایڈوکیٹ چیف کورٹ اودھ قیمت عــہ ۵،

خوشی کا مقام ہے کہ نور اللغات کی تیسری جلد بھی شائع ہو گئی۔ اسمیں ڈال سے قاف تک کے الفاظ ہیں۔
چونکہ نور اللغات کی پہلی دو جلدیں شائع ہو کر ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں اور "زمانہ" میں بھی اُنپر ریویو ہو چکا ہے لہذا اب یہ تیسری جلد کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سابق جلدوں کی طرح اس میں بھی الفاظ و محاورات بعد تحقیق جمع کئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ جلد ہی اسکی چوتھی اور غالباً آخری جلد بھی شائع ہو جائیگی اور اُردو زبان میں کوئی مکمل و مستند لغت نہونے کی جو شکایت تھی وہ اسکی تکمیل کے بعد ایک بڑی حد تک رفع ہو جائے گی۔ ہم مؤلف صاحب کو اُنکی اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔

کرشن کی مایا

از منشی بھگوت سروپ صاحب

پانڈے سدانندراؤ کو اپنے بڑے بھائی مہانندراؤ سے بیحد محبت تھی۔ جہاں مہانند کا پسینہ گرتا۔ سدانند اپنا خون بہانے کو تیار رہتے۔ یوں تو بھائی کو بھائی سے محبت ہوا ہی کرتی ہے۔ مگر سدانند کی عدیم المثال محبت دنیا سے نرالی تھی، دونوں بھائی ہمیشہ ساتھ رہتے، ایک دم کو بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے، کھانا، پینا، اُٹھنا، بیٹھنا اور سونا ہر حالت میں وہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے، اِس وجہ سے لوگ انھیں رام لچھمن کی جوڑی کہا کرتے تھے۔

انکے پاس ایشور کا دیا سب کچھ موجود تھا، دس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کی زمینداری تھی۔ ہزاروں کا لین دین ہوتا تھا۔ چھوٹا کنبہ اور تھوڑا خرچ تھا غرض ہر طرح سے آنند ہی آنند تھا۔

دنیا میں کوئی شخص آبحیات پیکر تو آتا نہیں، مرنا سب کے لئے ہے۔ آخر قدرت کے پوشیدہ ہاتھوں نے مہانند کو سدانند سے جدا کر دیا۔ پانڈے سدانندراؤ نے پیارے بھائی کی بے وقت موت پر بہت ماتم کیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب مہینوں جاری رہا۔ ہنسنا، بولنا موقوف ہو گیا۔ جہاں کسی نے مہانند کا ذکر کیا انکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مدت تک کسی کام کاج کو ہاتھ نہیں لگایا۔

منشی کنجبہاری لعل اِس خاندان کے پشتینی نمک خوار تھے۔ مہانند انکی بڑی عزت کرتے تھے زمینداری اور لین دین کا کوئی کام بلا انکے مشورے کے نہیں ہوتا تھا۔ سدانند بھی منشی جی کو بہت مانتے تھے، بلکہ بھائی کی برابر عزت کرتے تھے۔ منشی جی نے کاروبار میں ابتری ہوتے دیکھکر سدانند سے کہا کہ بڑے مہاراج تو اب آ نہیں سکتے۔ دنیا آنے اور جانے کی جگہ ہے۔ ایک جاتا ہے دوسرا اُسکی جگہ لیتا ہے۔ آپ کب تک اُنکا غم کرینگے۔ پرماتما اُنکو سورگ میں جگہ دیں۔ اب آپ اُنکو بھول جائیے اور دنیا کے کام میں جی لگائیے۔ گھر گرہستی کو دیکھئے۔

کنجبہاری لعل کی کوششوں سے سدانند نے دیوانخانہ میں آنا و بیٹھنا شروع کیا۔ چند روز تک گھبرا گھبرا کر چلے جاتے رہے۔ مگر کب تک! فصل آئی اسامیوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ قرضدار حساب چکانے کو جمع ہونے لگے۔ کوئی لگان لاتا کوئی پچھلے حساب کی صفائی کرتا پہلے بھائی کا سہارا

تھا اب سارا بوجھ اُن پر ہی پڑ گیا تھا، دیوانخانے میں تھیلیاں بھری جانے لگیں، روپیہ کی جھنکار سُنائی دینے لگی، مرنے والے کو سب بھُولنے لگے۔

کہتے ہیں کہ دولت مقراضِ محبت ہے، باپ اور بیٹے بھائی اور بھائی کے خونی رشتہ کی محبت کی رگوں کو کاٹ دینا اسکا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے، حقیر جھونپڑوں میں جہاں لکشمی جی کا پرکاش کم ہوتا ہے وہاں محبت کی اصلی اور سچی تصویر کی جھلک دکھائی دیجاتی ہے، لیکن دولت سے معمور قلعہ اور محل اس نعمتِ بے بہا سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اگر کوئی شبیہ نظر آتی بھی ہے تو اسمیں اصلیت کم اور ظاہرداری اور بناوٹ زیادہ ہوتی ہے۔

ایک روز منشی کنج بہاری لعل نے سدانند کو ملول دیکھکر کہا کہ "مہاراج برادر پرستی کی مثال آپ سے بڑھکر نہیں مل سکتی، مگر اب اس رنج وغم کو دور کیجئے، لڑکیوں کی شادی کی فکر کیجئے"

سدانند نے جھنجھلا کر کہا "منشی جی شادی گئی چولھے بھاڑ میں، بھائی صاحب کو رو چکا اب تو جیتوں کا رونا رہ گیا ہے"

کنج بہاری لعل نے چونک کر گردن اُٹھائی اور پوچھا "مہاراج آپ کا مطلب میں نہیں سمجھا"

سدانند۔ منشی جی۔ یہ بھابی اور بھتیجی مجھکو کھائے جاتی ہیں نہ چھمی کو دیکھ سکتی ہیں نہ اسکی ماں کو۔ جب اندر جاتا ہوں کلیش ہی کلیش دکھائی دیتا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ چھمی کی ماں کتنی سیدھی سادی ہیں۔ پھر بھی بھابی چین نہیں لینے دیتیں۔

کنج بہاری لعل نے قلم کان میں رکھتے ہوئے کہا "ہیں! ہیں! آپ کیا کہہ رہے ہیں، بڑی سرکار تو سچ مچ کی دیوی ہیں، پوجا کرنے یوگ ہیں۔ کلاوتی کو بچپن سے میں نے کھلایا ہے جیسی اسکی صورت ہے، ویسی ہی اسکی سیرت بھی ہے، مہاراج آج میں اپنے کانوں سے وہ سُن رہا ہوں جو کبھی نہیں سُنا تھا۔ ہے ایشور! بڑے مہاراج کی آنکھ بند ہوتے ہی کیا تو اُنکے کنبے سے بھی آنکھ پھیر لیگا"

سدانند۔ منشی جی! آپ ڈائنوں کو دیوی کہکر میرا جی جلاتے ہیں۔

کنج بہاری لعل۔ آپ خفا کیوں ہوتے ہیں؟ اگر آپ کی نیک اور سیدھی سادی دھرم پتنی سے بڑی سرکار کی اب نہیں نبھ سکتی ہے تو اُنکو علیحدہ کر دیں اُنکا حصہ بانٹ ......"

سدانند نے تڑک کر کہا "کہیں بھنگ تو نہیں کھائی ہے۔ کیا بزرگوں کی جائداد عورتوں میں بٹا کرتی ہے؟"

کنج بہاری لعل۔ مہاراج اتیاہ نہ کیجئے۔ اسکا پھل اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کے لڑکا ہوتا تو ابھی

ہو جائے تو آپ بے شک ان بیکسوں کو گذارہ دیسکتے تھے - لیکن اب لچھمی اور کلاوتی دونوں برابر کی حقدار اور برابر کی وارث ہیں - آپ ان دکھیوں کو اپنی استری اور گوبھ کے بس ہو کر دکھ ندیں -

سدانند منشی جی! کس منھ سے آپ زندوں اور مُردوں کی اولاد کو برابر کا حقدار بتاتے ہیں؟

منشی جی - جس منھ سے دونوں کا نمک کھایا ہے -

سدانند - پھر جائیے انکا ہی نمک کھائیے -

گنج سہائے لعل نے کان میں سے قلم نکالا - قلمدان میں رکھا، بستہ باندھا - اپنی جگہ پر چھوڑ دیا - پرنام کیا اور گھر کا راستہ لیا -

---

راجہ پور کا تعلقہ نہایت وسیع اور خوشحال تھا - تعلقدار کھانڈے رائو کی منگنی سدانند کی لڑکی بیٹی لچھمی دیوی سے قرار پا چکی تھی، اسکو کئی برس گذر چکے تھے - یوں تو شادی کبھی کی ہو گئی ہوتی لیکن تعلقہ دار کے نابالغ ہونے کی وجہ سے علاقہ کورٹ تھا - کورٹ سے صرف دس ہزار روپیہ شادی کے خرچ کے واسطے منظور ہوا تھا، اور کھانڈے کی ماں اپنے لڑکے کی شادی مین دل کے وصلے نکالنے کی خواہاں تھی اس نے صاف صاف کہدیا تھا کہ یہ شادی اب اسی وقت ہوگی جب میرا بیٹا گدی پر بیٹھ جائیگا -

جب کھانڈے رائو کے بالغ ہونے میں صرف ایک سال کی کسر رہ گئی تو شادی کی تاریخ بھی مقرر کردی گئی - سدانند کا خرچ بہت کم تھا - آمدنی وافر تھی، شادی میں دل کھول کر روپیہ خرچ کرنے کا ارادہ تھا، جہیز میں دینے کو سونے کا چھپر کھٹ، چاندی کے برتن، ایک ہاتھی، اسکے لئے گنگا جمنی ہودہ، زربفت کی جھول، اہلکاروں اور ملازمان کے لئے سنہری روپہلی خلعت اور وردیاں، غرضکہ سب چیزیں فراخ دلی سے تیار ہو رہی تھیں - انکا خیال تھا کہ کھانڈے راؤ اگر تعلقدار ہیں تو میں اپنے قصبہ کا رئیس ہوں - لوگ ہاتھیوں پر چڑھکر مجھسے روپیہ قرض لینے آتے ہیں، میری لچھمی کرم کی بھی لچھمی ہے اُدھر ایک تعلقہ کی مالک ہوگی، ادھر میری دولت بھی لاکھوں کی ہے وہ بھی اسی کے لئے ہے، ہاں ذرا بدمزاج اور کریہ منظر ضرور ہے - مگر یہ کوئی بات نہیں ہے جسکی فکر کی جائے، بڑے آدمیوں کو سب باتیں زیب دے جاتی ہیں -

سدانند بہت ہی خوش رہتے، سب سے ہنس ہنس کر بولتے، اور دن رات شادی کی شان و شوکت بڑھانے کے لئے خیالی تجاویز سوچا کرتے - ہاں انکو کلاوتی سے بھی گلو خلاصی کی فکر تھی، اور وہ

اُنکے لئے ایسے گھراور بر کی تلاش کر رہے تھے جو اس قابل ہی نہو کہ کسی وقت کلاوتی کے حقوق کا دعویٰ کرسکے۔ وہ ایسا بالغ اور غریب لڑکا چاہتے تھے جو تھوڑا بہت روپیہ لیکر اپنی بیوی کے حقوق سے دست برداری دے دے۔ شہر میں ایسے لڑکوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن سدانند اس بلا کو دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔ لہذا دور دراز مقام پر رشتہ کی تجویز زیر فکر تھی۔

جس حالتِ افلاس و ناداری میں کلاوتی اور اُسکی ماں نے کئی برس کاٹے اسکا حال سُن کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ شروع شروع میں سدانند کی بیوی نے بدزبانی اور بلا وجہ طعن و تشنیع تک ہی بس کیا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا گالیوں تک نوبت آنے لگی۔ سدانند اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ لچھمی بے وجہ کلاوتی کو گالیاں دیتی۔ کوستی اور مار بھی لیتی مگر وہ اپنی دھرم پتنی کے خوف سے زبان تک نہ ہلاتے۔ ویسے بھی کلاوتی ایک خار تھی جو ان میاں بیوی کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ اگر یہ سدِ راہ نہوتی تو پھر کُل دولت انکی ہی تھی۔

ایک روز لچھمی نے کلاوتی سے دودھ مانگا۔ وہ کٹورے میں دودھ لا رہی تھی۔ کٹورہ گرم ہو گیا تھا ذرا دیر لگ گئی تو لچھمی نے بگڑ کر کہا: "کیا ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ چلا بھی نہیں جاتا؟"

کلاوتی نے جلدی کی۔ عجلت میں دودھ گر پڑا۔ گرم گرم دودھ پاؤں پر گرا، آبلے پڑ گئے چیخ نکل گئی سدانند کی بیوی نے کہا: "کمبخت کو دیکھو، دودھ کا دودھ گرا دیا اور نخرے کے نخرے دکھاتی ہے"

یہ سنکر مہانند کی بیوی نے آہستہ سے کہا: "کیوں خفا ہوتی ہو، اُسکا پاؤں تو دیکھو کیسا جل گیا ہے"

"ہاں مجھکو تو جب چین آتا اور سُکھ سے سوتی جب وہ بالکل جل جاتی"

مہانند کی بیوی آہ سرد بھر کر خاموش ہو گئی، مگر سدانند کی بیوی کب چُپ رہنے والی تھی۔ سنے کہا "دیکھو ہمارا ہی کھاؤ اور ہمکو ہی دھکیلو چلو، اور آ میں بھرو۔ ابھی تم کو گھر سے نکال کر دم نہ لوں میرا نام نہیں۔ لچھمی۔ ذرا انکو بلا تو لا"

سدانند آئے۔ ماں بیٹی خاموش بیٹھی تھیں۔ دوسری طرف اُنکی زوجہ محترمہ کُہرام مچا رہی تھیں سارا گھر سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ سدانند کو مجبوراً ان دونوں ناکردہ گناہ مظلوموں کو اُس ٹوٹے پھوٹے مکان میں بھیجنا پڑا جہاں مہانند کے زمانے میں کاشتکار اور نیچے درجے کے مہمان ٹھہرا دئے جایا کرتے تھے، مگر یہاں بھی انکو چین نہ ملا۔ سدانند کی زبان دراز بیوی وہاں جاکے اوپر سے اُکھاڑ اُڑتے۔ نوکرانیوں کے ذریعہ سے طرح طرح کی باتیں کہلوا کر بھیجتی اور اُسکے زخمی دل پر نمک پاشی کرتی رہتی تھی۔

یہ وہی گھر تھا جہاں مہانند کی بیوی نے راج کیا تھا۔ آج وہاں وہ خادماؤں سے بدتر حالت میں تھی۔ سدانند اوّل تو گذارہ کو دیتے ہی کیا تھے۔ اور جو کچھ دیتے بھی تھے وہ بھی اس دولت کے بندے کو ناگوار گذرتا تھا، اور اکثر اسکی زبان سے نکل جاتا کہ "بھائی صاحب کہاں کا وبال میرے اوپر ڈال گئے"۔ دو ایک مرتبہ منشی گنج بہاری لعل نے کچھ امداد کرنے کی کوشش کی تھی تو ان بائیت اور غیور بیویوں نے شکریہ کے ساتھ کہلا بھیجا کہ "ہم خوش ہیں منشی جی ہمارے لئے ہراساں نہوں"۔

کلاوتی بڑی سوشیل اور سیدھی لڑکی تھی۔ آئے دن کی دماغی تکالیف نے اُسکی ماں کی صحت کو خراب کر دیا تھا، تاہم دن بھر کے کام کاج اور ماں کی خدمت سے جو کچھ وقت بچتا وہ مذہبی کتابوں کے پڑھنے میں صرف کرتی۔ رامائن تو مہانند نے اسکو اس وقت لاکر دی تھی جب اسنے ہندی پڑھنا سیکھا تھا، اور کچھ کتابیں اسکی ماں کی تھیں، اسکو سری کرشن مہاراج کے حیرت انگیز کرشموں پر بڑا یقین تھا، ایک روز اس نے اپنی ماں سے کہا۔

" اماں! کرشن جی نے سب کے دُکھ دُور کئے، بھگتوں کی امداد کو فوراً جا پہنچتے تھے، کاش ہماری پیدائش اُنکے زمانے میں ہوئی ہوتی"

ماں نے حیرت سے پوچھا "تو پھر تم کیا کرتیں؟"

" اماں! میں اُنکے قدم پکڑ لیتی اور کہتی " دُکھ ہرو دوارکا ناتھ سرن میں تیری"

ماں نے کہا "تم کو کیا دُکھ ہے؟"

کلاوتی نے کہا "کیا یہ دُکھ کم ہے کہ میری پیاری ماں اچھی نہیں رہتی"

ماں بولی "بیٹی دُکھ سُکھ ہمیشہ نہیں رہتے۔ کرشن مہاراج ہر زمانے میں تھے اور ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں، صرف بھگتی بھاؤ کی ضرورت ہے، وہ بھگتوں کی آزمائش بھی کیا کرتے ہیں۔ جب ہمارے سُکھ کے دن نہیں رہے تو وہ دُکھ کے دن بھی دُور کر دینگے۔ بیٹی تم اُنپر نویراؤ شواس رکھو"

کئی برس گزر گئے لیکن لالچی اور زن مُرید سدانند کو کبھی یہ خیال نہوا کہ یہ اُسی بھائی کی یادگاریں ہیں جنکو وہ پران سے زیادہ بتلایا کرتا تھا۔ زن۔ زر اور زمین کے عجیب کرشمے ہوتے ہیں۔

لچھمی کی شادی کو ایک ماہ رہ گیا۔ سب اہتمام پائیہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ مکانات کی مرمت ہو کر سفیدی ہو گئی۔ سدانند کی مشغولیت بہت ہی بڑھ گئی تھی۔ کاموں کی دیکھ بھال سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ انھیں دنوں میں ایک روز شام کے وقت ایک لنگڑا کُبڑا سیاہ فام برہمن جسکے

بال بڑھے ہوئے تھے، صورت پر وحشت برس رہی تھی اور جسکے نیم برہنہ بدن کی ستر پوشی ایک پرانی پھٹی ہوئی دھوتی کر رہی تھی، سدانند کے دروازے پر آیا، اور بہت زور سے چلّا کر بھیک مانگنے لگا۔

دربان نے کہا "جا یہاں سے ہٹ جا، کیا تو نہیں جانتا کہ شام کو بھیک نہیں دیا کرتے"

فقیر نے کہا "میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتا، مالک سے مانگتا ہوں"

دربان۔ بھاگ جا، بدمعاش کہیں کا۔

فقیر۔ بدمعاش تو اور تیرا باپ، تو ایک برہمن کو بدمعاش کہتا ہے۔

سدانند یہ سن رہے تھے، کمرے سے نکل کر چلے آئے اور فقیر سے کہنے لگے "کیوں شور مچا رہا ہے ہندو لوگ دونوں وقت ملے بھیک نہیں دیتے، تو کیسا برہمن ہے؟"

فقیر۔ جیسے آپ برہمن ہیں، میں تو ودیارتھی بھی ہوں، اور ہم لوگوں کو بھی دونوں وقت بھوک لگا کرتی ہے۔

سدانند۔ کل آنا۔

مگر ودیارتھی وہیں جم کر بیٹھ گیا، اور کہنے لگا "اب تو یہیں رین بسیرا ہوگا۔ ایک وقت کھانا دو ملا نہیں ہے"

سدانند کو غصہ آگیا۔ چلّا کر کہا "چلا جا۔ نہیں تو تجھے پٹوا دیا جائیگا"

ودیارتھی نے نہایت اطمینان سے کہا "کچھ پروا نہیں، پاٹھ شالا میں اکثر پٹتا ہوں۔ آج اور سہی"

سدانند۔ آہا۔ وہاں پٹ پٹ کر کمرا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب میں ہاتھ بھی تڑوا دونگا۔

ودیارتھی۔ مہاراج ہاتھ توڑ کر پھر تو کھانا دے ہی دوگے۔

سدانند۔ اچھا اگر تو ودیارتھی ہے تو بتا کیا پڑھا ہے؟

ودیارتھی۔ ہاں مہاراج یہ ڈھنگ کی بات ہوئی۔ لو۔ وید، شاستر، جوتش، ویاکرن سب کچھ پڑھ لیا ہے۔

سدانند۔ جوتشی جی تم شگون بچار کر نہیں چلے تھے۔ ورنہ یہاں نہ آتے تمکو کچھ نہیں ملیگا۔

ودیارتھی۔ جوتشی سب کچھ بچار کر چلتے ہیں، وہ دیکھو برابر والے گھر سے کچھ آرہا ہے۔

سدانند نے دیکھا کہ کلاوتی کچھ لا رہی تھی۔ کلاوتی نے دو مٹھی جوار ودیارتھی کو دی اور ہاتھ جوڑ کر بولی "جوتشی جی! میری ماں کب تک اچھی ہو جائیگی؟"

ودیارتھی۔ واہ! جوار لائی۔ آج یہی سہی۔ ہاں! تیری ماں بیمار ہے۔ کیا مضائقہ ہے۔

حکیم کو بلوا، ڈاکٹر کو دکھلا، دوا پلا، بس پھر وہ اچھی ہو جائیگی۔

کلاوتی۔ ہمارے پاس روپیہ، پیسہ، نہیں ہے۔ ہم غریب ہیں اور ڈاکٹر حکیم بلا روپیہ کے کیوں آنے لگے؟

سدانند اپنے پیارے بھائی کی لڑکی اور نصف جائداد کی مالکہ کی زبان سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ جھنجھلا کر بولے۔

کلا! تو سب سے بولتی ہے۔ اتنی بڑی ہوگئی، گھر میں جی نہیں لگتا''

کلاوتی چلی گئی۔ ودیارتھی نے کہا، "جوار کھاؤں، پھر سونے کا پربندھ کرونگا، مہاراج! جو آگیا ہو تو دروازے پر پڑا رہوں" سدانند کچھ نہ بولے۔ ودیارتھی دربان کی کوٹھری کے سامنے سو گیا۔

صبح ہوئی۔ سدانند باہر آئے دیکھا کہ ودیارتھی سو رہا ہے۔ کہنے لگے "بڑا بے فکر ہے۔ زمین پر کیسے آنند سے سو رہا ہے۔ ارے او۔ اٹھ کیا گھوڑے بیچکر سویا ہے"

ودیارتھی نے آنکھیں کھولیں، انگڑائی لی۔ ایکدم چلا اٹھا۔ "میں مرا۔ میرا دم نکلا ہائے رام سارے بدن میں درد ہوگیا"

سدانند چلائے "ارے بدذات۔ شادی بیاہ کے گھر پر کیسی بری بھاکھا بول رہا ہے! کمبخت اٹھ۔ بھاگ جا"

ودیارتھی لنگڑاتا ہوا اٹھا اور کلاوتی کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے جاکر گر پڑا، کلاوتی یہ دیکھ رہی تھی اسنے کل ماجرا اپنی ماں سے کہا۔ ماں نے پوچھا "کلا! کچھ گھر میں ہے"؟

کلاوتی۔ اور کیا ہے وہی جوار پڑی ہے

"جا اسکو دے آ۔ اور دیکھ میرے سرھانے والے بکس میں تھوڑی سی افیم پڑی ہے اور ایک خانے میں کچھ پیسے ہیں اسمیں سے چار پیسے بھی دیدے۔ اوس میں پڑے پڑے اسکا یہ حال ہوگیا ہے تیل میں افیم ملا کر ملیگا تو آرام ہو جائیگا"

کلاوتی نے ماں کے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ ودیارتھی کو پیسے اور جوار دے رہی تھی تو اسنے پوچھا "داسی تمھارا مالک تو بڑا بزدل ہے اور تم ایسی دیاوان ہو۔ اس مکان میں بھیشن بھی ہیں!

کلاوتی۔ میں داسی نہیں ہوں۔

ودیارتھی۔ پھر کون ہو؟

کلاوتی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میں انکی بھتیجی ہوں"۔

ودیارتھی چونک پڑا۔ غور سے اُسکا مُنہ تکنے لگا۔ اور پھر سوچکر بولا "تمہارے مالک نہیں۔ نہیں۔ چچا کے کوئی اولاد نہیں ہے؟"

کلاوتی۔ ہے کیوں نہیں۔ میرے برابر کی لڑکی لچھمی دیوی ہے"

"کیا وہ گھر سے نہیں نکلتی؟"

کلاوتی۔ نکلتی کیوں نہیں۔ آج کل اُسکی شادی کے دن ہیں اِس لئے باہر کم آتی ہے۔

ودیارتھی۔ تمہارے چچا بڑے مالدار ہیں۔ کیا تم کو کچھ نہیں دیتے؟

کلاوتی خاموش ہوگئی۔ ودیارتھی لنگڑاتا ہوا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد واپس آیا۔ وہاں سے کچھ دوا لاکر کلاکو دی اور کہا کہ اپنی ماں کو پلا دے۔ اور خود اُسی پیڑ کے نیچے جا پڑا۔

کئی روز ہوگئے ودیارتھی وہاں سے نہیں ٹلا۔ اُسی درخت کے نیچے دن کی دھوپ اور رات کی اوس میں پڑا رہتا۔ کلاوتی کے جوار کے دانوں پر اُسکی بسر ہوتی رہی۔ اب گھر کے ملازم بھی اسکے پاس آنے جانے لگے۔ وہ کسی سے سدانند کی دولت کا حال پوچھتا اور کسی سے لچھمی کے مزاج اور اُسکی ماں کی حالت دریافت کرتا۔ غرض کہ وہ گھر کے بھیدوں اور حالات کو معلوم کرتا رہتا۔ جب سدانند کو اسکا پتہ لگا تو وہ نوکروں پر بہت خفا ہوا۔ اور ودیارتھی کو بُلا کر کہا۔ "تو یہاں کیوں پڑا ہے؟ جاتا کیوں نہیں؟ بول تیری کیا مرضی ہے؟ میں تجھکو پولیس کے حوالہ کردونگا"

ودیارتھی نے مسکرا کر کہا "مہاراج آپ خفا نہوں۔ میں آج ہی چلا جاؤنگا۔ لیکن ذات برادری سے آپ کا سلوک اچھا نہیں ہے، یہ بڑی بُری بات ہے"

سدانند۔ ذات برادری کے کیا معنی؟

ودیارتھی۔ مہاراج میں بھی تو مرہٹہ برہمن ہوں۔ جھانسی کے رئیس گوبند راؤ گھاٹے کا پوتا ہوں۔ میرا خاندان مدت ہوئی برباد ہوگیا۔ مجھکو تعلیم کا شوق تھا۔ بنارس چلا گیا۔ بھیک مانگ مانگ کر دو حرف سیکھ لئے۔ اب پیٹ کی فکر ہے۔ پیسہ پاس نہیں ہے۔ روزگار ملتا نہیں۔ لاچار ہوں۔ کچھ سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری صورت میری حالت اور میرے جسمانی عیوب مجھے کامیاب نہیں ہونے دیتے۔ مہاراج میری حالت دیکھکر آپ کو بھی نفرت پیدا ہوگئی۔ ایک چٹکی آٹا بھی نہیں دیا۔

سدانند خیالات کے سمندر میں غوطہ کھا رہے تھے۔ گردن اٹھا کر بولے "میں نے مدت ہوئی گوبند راؤ کا نام سُنا تھا۔ رئیس آدمی گنے جاتے تھے۔ اُنکا خاندان کب برباد ہوا؟ مجھکو خبر نہیں۔ مجھکو تم سے

ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ میں تمھاری مدد کرونگا۔ لیکن اس شرط پر کہ تم بھی میرا ایک کام کر دو۔ میں تم کو کافی معاوضہ دونگا۔ تمھارا کوئی رشتہ دار ہے؟"

ودیارتھی۔ اوپر آسمان اور نیچے زمین۔

سدانند۔ خیر میں تم کو دس ہزار روپیہ دونگا۔ روپے کے بدلے میرا کام کر دینا، اور دوسری شرط یہ ہے کہ پھر یہاں نہ آنا، دور پردیس میں جاکر کام کاج کرنا۔

ودیارتھی دس ہزار کا نام سنکر حیرت زدہ ہو گیا اور سدانند کا منھ تکنے لگا۔

سدانند نے کہا "ہاں پورے دس ہزار دونگا۔ ایک کوڑی بھی کم نہیں"۔

ودیارتھی۔ مہاراج گنتی تو میں نے کروڑوں تک کی لکھی ہے مگر دیکھے سو روپیہ بھی نہیں۔ اندھے کو دو آنکھیں چاہئیں۔ آپ تو مجھپر راجہ کرن جیسی دیا کر رہے ہیں۔ میں اس احسان کے بدلے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

سدانند۔ اندر گئے۔ میاں بیوی میں بہت دیر تک کچھ گفتگو ہوتی رہی۔ بیوی کہتی تھی۔ تم نے ایک دم دس ہزار کھدئے۔ برا کیا۔

سدانند نے کہا "خیر ڈر تو جاتا رہیگا۔ اور میں تو بھائی کو بھی اسکے ہی حوالہ کر دونگا، سب کانٹا نکل جاویگا"۔ یہ کہکر وہ خوش خوش باہر آئے۔ ودیارتھی سے مشورہ کرتے رہے۔ رات ہی کو باہر کی بیٹھک میں ودیارتھی کو ٹھہرا لیا۔ کپڑے بدلنے کو دیدیے۔ اور کھانا بھی گھر سے بھجوا دیا۔

قصبہ میں اگلے ہی دن یہ خبر پھیل گئی کہ جھانسی کے ایک بگڑے رئیس کے پوتے کے ساتھ کلاوتی کی شادی ہونے والی ہے اور مہاراج سدانند نہایت دریا دلی سے اس خاندانی کے نوشہ کے دلدر دور کر دینگے۔ اور اپنی بیٹی سے پہلے بھتیجی کا بیاہ کرینگے۔

چوتھے دن بوسیدہ مہمان خانہ میں منڈھوا چھایا گیا۔ مہاراج سدانند مع اپنی بیوی اور لچھمی کے آئے۔ لچھمی نے اپنے بہنوئی کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ودیارتھی نے لچھمی کو دیکھا اور اپنی ظاہری صورت کی وجہ سے اسکو ہنستے ہوئے دیکھا۔ مگر اسنے نہایت اخلاق سے ماں بیٹیوں کو پرنام کیا۔

مریضہ اٹھکر آئی۔ دیور کے قدموں پر گر پڑی اور بولی "تم کیسے چچا ہو کہ اپنی بھتیجی کو ایک لنگڑے کبڑے کے گلے باندھے دیتے ہو۔ میری لڑکی کا اس طرح بلیدان کئے دیتے ہو۔ میں نے فاقے کئے، سوکھ سے جوار کے دانوں پر دن کاٹے، اور پھر بھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ میرے بدن کے

چیتھڑے، میری موجودہ حالت، میری صورت کو دیکھو ۔ میں بھی کبھی اسی گھر کی مالکہ تھی، وہی مالا جسکو تم روز صبح پرنام کیا کرتے تھے ۔ تم کو کرشن جی کا واسطہ ہے ۔ تم کو اپنے سرگ باشی بڑے بھائی کی قسم ہے ۔ اِس بھکاری کالے کلوٹے، مفلس قلاش کے ساتھ میری پیاری بیٹی کی قسمت مت پھوڑو ۔ اسکو بھاڑ میں مت جھونکو ۔ اِس سے بہتر ہے کہ اسکو جان سے مار ڈالو، میں پاگل ہو رہی ہوں، گھر سے نکل جاؤنگی، اپنی بیٹی کو ساتھ لیجاؤنگی، مگر ایک فقیر کے ساتھ جسکا نام تک بھی تم نہیں جانتے بھاڑ میں نہیں جھونکنے دونگی"۔

سدانند کی بیوی نے گرج کر کہا "چپ رہو، مت بکو، بڑی آئیں کہیں کی دکھیان دینے والی دس ہزار تمھاری بیٹی اور داماد کو ملیں گے اور کیا کسی کا ماس لوگی"

پھمی مسکراتی ہوئی کلاوتی کو عروسی جوڑا پہنا کر گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھی دو خادمائیں اُسکو مدد دے رہی تھیں ۔ جب کلاوتی ماں کے پاس آگئی تو اُسنے آہستہ سے کہا ۔

"ماں کرشن جی کہاں ہیں ۔ کیا بیکسوں کی تباہی کے بعد ہی وہ خبر لیتے ہیں"

ماں نے کہا "دکھ ہرو دوارکا ناتھ سرن میں تیری"

مریضہ بیہوش ہوگئی تھی، کلاوتی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا ۔

سدانند چند خاندانی پروہتوں کے ساتھ بھانوریں ڈالنے کی رسم ادا کرا رہے تھے ۔

شادی ہوگئی ۔ دو دن گذر گئے ۔ سدانند کی بیوی رو پیٹ کر بیٹھ رہی ۔ کلاوتی کے دل کا حال ایشر جانے ۔ تیسرے دن سدانند نے ودیارتھی کو بلوایا ۔ اور بڑی خاطر سے کہا ۔

"سنو بھئی! تمھاری شادی ہوگئی، اب پانچ پنچوں میں اپنا معاملہ صاف کرلو، پھمی کی شادی کو کچھ دن نہیں رہے ۔ آج دوپہر کو میں یہاں کے کچھ برادری والوں کو بلا لونگا اور تم اپنا روپیہ لے کر اس کاغذ پر دستخط کردو، بھابی کی تندرستی خراب ہے اور وہ کلاوتی سے الگ رہنا نہیں چاہتیں لہذا میری رائے ہے کہ تم انکو بھی ساتھ ہی لیجاؤ"

ودیارتھی نے کاغذ کو لیا، غور سے پڑھا ۔ ہنس کر کہنے لگا "مہاراج آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں، سب باتوں کی تعمیل کرونگا ۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ آپ آج اپنی بھتیجی کو رخصت کردیں، میں اُسکو کسی دور گاؤں میں لیجاؤنگا ۔ وہاں مکان وغیرہ کا انتظام کرکے پھر آکر روپیہ وغیرہ لیجاؤنگا ۔

سدانند ۔ کب آؤگے؟

وِدّیارتھی - آپ کی لڑکی کی شادی کے بعد -

سدانند - فی الحال کہاں جاؤگے ؟

وِدّیارتھی - یہاں سے بیل گاڑی پر نوگاؤں جاؤنگا، وہاں سے ریل پر سوار ہوکر اپنے دیس کی طرف چلا جاؤنگا -

سدانند - تو جلدی آنا - روپیہ پیسہ کا معاملہ ہے، حساب جتنی جلدی صاف ہوجائے اچھا ہے

سورج غروب ہو رہا تھا - ایک بیل گاڑی پر ایک حسین دُلھن - دوسرا لنگڑا، کُبڑا، سیاہ فام دولھا سوار تھے - بیل گاڑی جارہی تھی - گھر والے اور نوکر چاکر سب اُسکی طرف دیکھ رہے تھے - ماں بیٹی کی رخصت دیکھ رہی تھی اُسکی آنکھوں کے آنسو خشک ہوچکے تھے -

لچھمی نے تمسخر سے کہا " اماں - وہ دیکھو - لنگڑا دین پونے تین - کالا دولھا کرموں ہین "

ماں بولی - " چلو اچھا ہوا - پاپ کٹا "

سدانند سب کچھ سُن رہے تھے - وہ خیالات میں غلطاں و پیچاں ایک محویت کی حالت میں گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے - شام ہوگئی تھی - اندھیرا ہوتا جاتا تھا - سیدھی سڑک پر گاڑی نظر سے اوجھل ہوتی جاتی تھی - سب لوگ کام کاج میں لگ گئے تھے - عورتیں گھروں میں چلی گئیں تھیں لیکن سدانند ٹکٹکی باندھے گاڑی کے راستہ کو دیکھ رہے تھے - انکو نیند سی آنے لگی - انھوں نے محسوس کیا کہ دُور فاصلہ پر ابھی جہاں گاڑی نگاہ سے اوجھل ہوئی تھی روشنی ہورہی ہے - انھوں نے کچھ شور و غل بھی سُنا - یکایک بہت سی بندوقیں ایک دم سر ہوئیں - وہ چونک پڑے - اور اُنکی زبان سے نکلا " آہ یہ میرے بھائی کی بیٹی کا بلیدان ہے - میں نے بُرا کیا " وہ افسردہ دل ہوکر مکان کے اندر چلے گئے -

---

لچھمی کی شادی کو صرف ایک ہفتہ رہگیا تھا - کلاوتی کی طرف سے بیفکری ہوگئی تھی - اور شادی کے جملہ سامان مکمل ہوگئے تھے کہ راجہ پور سے ایک پروہت آیا اُسنے سدانند کو ایک لفافہ دیا - اُسکو کھولا تو نوشتۂ تقدیر یہ تھا :-

سری مہاراج ـــــ پرنام

مہاراج کھانڈے راؤ فرماتے ہیں کہ " میری تعلیم نے مجھکو رسمی شادیوں کے بالکل خلاف کردیا ہے - میں اُس وقت تک شادی نہ کرونگا جب تک کہ مجھکو یہ اطمینان نہو جائے کہ میری بیوی میری زندگی کی مکمل اور حسب منشاء حصہ دار بن سکیگی -

لہذا میں جناب کو شادی کی تاریخ کے التوا کی اطلاع دیتا ہوں۔ جلد کام سرانجام کر لینے کے بعد آپکو اس اطلاع سے ضرور ناامیدی ہوگی۔ لیکن مہاراج کھانڈے راؤ کی ضد سے مجبور ہوں۔

آپکا سیوک ـــــ کنجہاری لعل مختار عام

سدانند نے خط پڑھا تو بدحواس ہوگئے۔ ہائے رام ہائے رام کہتے ہوئے اندر گئے اور بیوی سے کہا "جسکو تم کمبخت کہا کرتی تھیں وہ تو گئی۔ اب بچھمی اُس سے بڑھکر بدبخت ہے۔ بدمعاش کنجہاری لعل نے خود کھانڈے راؤ کو ورغلا دیا۔ اور آج منع کا خط بھی بھیجدیا۔ ہائے میں کیا کروں میرا تو لاکھوں روپیہ برباد ہوگیا۔" سدانند کے گھر ماتم کا سا کہرام مچ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عزیز قریب مرگیا ہے۔

بیمار بھاوج نے یہ شور سُنا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی آئی، حال معلوم ہُوا، دیور کو تسلی دی اور کہا "کلاوتی کی قسمت تھی جو اُسکو ایسا بَر ملا۔ تمھارا کیا قصور ہے؟ ہونی ہوکر رہتی ہے۔ مجھکو اب اسکا رنج نہیں ہے۔ اور اب جو ہُوا اُسمیں بھی پرماتما کی مرضی تھی۔ صبر کرو۔ سب ہی کو تعلقدار نہیں ملجایا کرتے ہیں۔ رامجی کا دیا تمھارے پاس سب کچھ ہے۔ آس پاس جو اچھا گھر بَر ملے بیاہ کر دو۔"

سدانند کا زعم اور غرور گھٹ گیا تھا۔ بھاوج کی نصیحت مان لی۔ اور ایک ہی مہینے کے بعد بچھمی کا بیاہ ایک معمولی لیکن شریف گھرانے میں کر دیا۔

چھ مہینے ہوگئے وِدیارتھی روپیہ لینے نہیں آیا، نہ اُسکی کوئی خیر خبر ہی ملی۔ کلاوتی کی ماں بیٹی کو یاد کرتی اور چھپکے چھپکے رو لیتی، وہ دل میں سوچتی تھی کہ "اگر کلاوتی کے باپ جیتے رہتے اور اُسکی تقدیر میں لنگڑا اور کُبڑا ہی بَر ہوتا تو کون روک سکتا تھا۔ وِدیارتھی میں جسمانی عیوب سب تھے۔ کالا لنگڑا کُبڑا سب ہی کچھ تھا لیکن ویسے بول چال میں بہت اچھا تھا۔ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ نام تک نہیں بتلایا۔ پتہ تک نہیں دیا۔ اور کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ لاکھوں کی جائداد کے بدلے دس ہزار ملتے تھے وہ بھی نہیں لئے۔ نہ جانے کِس حال میں ہوگا۔ جو روپیہ لیجاتا تو دُکان ہی کھول لیتا۔ اُسکے پاس تو ٹوٹا جھونپڑا بھی نہیں۔ کلا کیا کرتی ہوگی، اُسنے بھی کوئی چھٹی نہیں بھیجی، وہ بھی اپنی بیمار ماں کو بھول گئی۔"

ایک دن سدانند کے پاس کلکٹر صاحب کا اردلی آیا اور کہا۔ کہ آپکو بڑے صاحب نے بلایا ہے۔ سدانند آنریری مجسٹریٹ اور رئیس ہونے کے سبب سے حکام رس تھے۔ فوراً سوار ہوکر بنگلہ پر گئے۔ کلکٹر صاحب نے مزاج پرسی کے بعد فرمایا۔

"آپ کو اس وقت اِس وجہ سے تکلیف دی گئی ہے کہ ہز ہائینس مہاراجہ گڑھ کھروہ ایجنٹ گورنر جنرل سے مِل کر آرہے ہیں - میرے ضلع سے گذرینگے - اِس جگہ دو دن قیام ہوگا - آپ کی ذات برادری کے ہیں - آپ میری خاطر سے اُنکے کھانے پینے کا حسبِ رواج انتظام کردیں - خیمہ وغیرہ انکے ہمراہ ہیں - اور باقی ہمارے مالخانہ سے جائینگے - یہاں وہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے ہونگے - جملہ خرچ کا بِل ہم ادا کرینگے"۔

بُندیل کھنڈ کی خود مختار ریاستوں میں سے گڑھ کھروہ ایک وسیع اور بڑی ریاست تھی جو کہ سلطنت پیشوا کی یادگار تھی - سابق مہاراجہ کے مرنے پر حقِ ریاست اُنکے نواسہ کو ملا تھا اور بعد حصول اختیارات وہ ایجنٹ گورنر جنرل سے مِل کر اپنی ریاست کو واپس جارہے تھے چونکہ اس ضلع سے اُنکا راستہ تھا اس لئے وہ سرکاری مہمان کئے گئے - اور اِس خیال سے کہ اہل ہنود اور مرہٹہ برہمنوں کو ایک ہم مذہب کے انتظام سے آرام مِل سکتا ہے کلکٹر صاحب نے سدانند کو تکلیف دی -

سدانند نے کہا "مجھکو کیا کیا کرنا ہوگا ؟"

کلکٹر صاحب - ہاں منشی کنجبہاری لعل صاحب رائے بہادر آپکے دیوان آگئے ہیں - آپ اُن سے مِل کر پوچھ لیں -

کلکٹر صاحب کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ سدانند بول اُٹھے "حضور یہ کنجبہاری لعل کون ؟ وہ تو پہلے راجہ پور کے کارندے تھے - اور اس سے قبل ......"

کلکٹر صاحب نے ٹوک کر کہا "اوہ ! بس ! وہی - اور مہاراجہ صاحب وہاں کے تعلقدار اب بھی ہیں - ریاست گڑھ کھروہ اُنکو اپنے نانا سے ملی ہے - ہمکو فخر ہے کہ ہمارے ضلع کا ایک شخص ہز ہائینس مہاراجہ ہو گیا"

سدانند حضور - معاف فرمائیں مجھ سے کچھ نہو سکے گا -

کلکٹر صاحب - کیوں - کیا آپ گورنمنٹ کا اتنا سا بھی کام نکر سکیں گے - ؟

سدانند - سرکار کے لئے جان حاضر ہے مگر اِس کام سے معافی چاہتا ہوں -

کلکٹر صاحب (زور سے) آپ آنریری مجسٹریٹ ہیں - سرکار کو امداد دینا آپکا فرض ہے

سدانند - حضور کھانڈے راؤ .... ؟

کلکٹر صاحب - ہز ہائینس مہاراجہ کھانڈے راؤ کہئے -

سدانند - انھیں سے میری لڑکی کی منگنی ہوئی تھی - بس میرے کارندہ کنجبہاری لعل نے تکرار کی

اور شادی کو ملتوی کرا دیا۔

کلکٹر صاحب۔ پانڈے جی! آپ بہت بدزبانی کرتے ہیں۔ رائے بہادر منشی گنجباری لعل کہے۔

سدانند۔ حضور۔ ایسے ہی سہی۔ انھوں نے مہاراجہ کو ورغلا دیا۔ اور عین وقت پر انکار کر دیا۔ میرا لاکھوں روپیہ برباد ہو گیا۔

کلکٹر صاحب۔ آپکی لڑکی کی شادی ہو گئی۔ پھر ایک مہاراجہ والئی ریاست جو خود فضا ہو آپکے ہاں کیسے آسکتا تھا؟ آپ تو مہاراجہ نہیں ہیں۔

سدانند۔ لیکن شادی تو برادری ہی میں ہوا کرتی ہے۔

کلکٹر صاحب۔ لیکن برابر والوں میں۔ آپ کیوں بُرا مانتے ہیں؟ شہنشاہ جرمنی میری برادری کے ہیں۔ تو کیا وہ مجھ سے رشتہ کر لینا پسند کرینگے۔ ہر شخص اپنی سوسائٹی میں بھی اپنے وقار کا خیال رکھتا ہے۔ بہرحال یہ ذاتی معاملہ ہے۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو پھر میں خود اہتمام کرونگا۔ اچھا سلام

سدانند بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ کلکٹر صاحب نے گھنٹی بجا دی اور لاچار بے حد ملول گھر واپس آئے۔ انکو افسر اعلیٰ کی ناراضگی اور آنریری مجسٹریٹی کے جانے کا خوف لگا۔

مہاراجہ کا لشکر آگیا۔ خیمہ۔ ڈیرہ۔ شامیانے لگ گئے۔ ڈپٹی کلکٹر۔ تحصیلدار۔ کوتوال سب انتظام کے لئے موجود تھے۔ جب مہاراجہ صاحب کی سواری آئی تو سترہ ضرب توپ کی سلامی اُتاری گئی۔ کلکٹر صاحب اور پولٹیکل افسر نو گاؤں نے آکر پیشوائی کی اور بڑے تپاک سے انکا خیر مقدم کیا۔

توپوں کی آواز سے شہر بھر کو معلوم ہو گیا کہ کوئی بڑا مہاراجہ آیا ہوا ہے۔ سینکڑوں آدمی مہاراجہ کے لشکر کی شان و شوکت دیکھنے کو آنے لگے۔

سدانند کھانا کھا رہے تھے۔ توپوں کی آواز سنکر لچھمی نے پوچھا "پتا جی۔ آج توپیں کیسی چھوٹ رہی ہیں؟"

سدانند کا جی جلا ہوا تھا خفگی سے کہا "تم کو کیا؟ سنتا ہے کوئی مہاراجہ آئے ہیں"

لچھمی بولی "میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ جب بڑے لوگ آتے ہیں تو توپیں کیوں چھوڑی جاتی ہیں؟ پار سال جب لاٹ صاحب آئے تھے تو بھی ایسے ہی گولے چھوٹے تھے۔ پتا جی! مہاراجہ کو کیسے دیکھیں؟"

سدانند کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ ملازم نے ایک سنہری مہردار لفافہ لاکر انکے ہاتھ میں دیا۔

لفافہ کھول کر مضمون خط پڑھا تو سدا انند کا چہرہ اتر گیا۔ باپ کو اداس دیکھکر لچھمی نے پوچھا۔

"خیر تو ہے"؟

سدا انند۔ ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ آج شام کو مہاراجہ کی سواری نکلے گی۔ ہماری برادری کے آدمی ہیں۔ مجھ سے ملنے کو آئینگے۔

خط دیکھکر لچھمی نے کہا۔ "مہاراجہ کیا سونے کے بنے ہوتے ہیں جو خطوں پر بھی سونا ہی چڑھاتے ہیں"

مہاراجہ صاحب ریاست سے باہر سب برابر والوں سے برابری سے ملتے تھے، اور خوش اخلاق سے پیش آتے تھے۔ سدا انند نے مکان کو جھاڑ پونچھکر صاف کرادیا۔ روشنی کا اہتمام کیا۔ زنانہ دروازے پر چق ڈلوادی کہ گھر اور محلہ کی عورتیں بھی تماشہ دیکھ لیں۔

اندھیرا ہو چلا تھا، چراغ جلنے لگے تھے، سدا انند اور محلہ والے صحن میں بیٹھے ہوئے مہاراجہ کی آمد کے منتظر تھے کہ بندوقوں کے سر ہونے کی آواز آنے لگی۔ لمحہ دو لمحہ کے بعد نقیبوں کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔

"شری مہاراج ادھیراج ہز ہائینس مہاراجہ گڈھ کھردہ کی سواری آتی ہے"

"سری مہارانی ہر ہائینس مہارانی گڈھ کھردہ کی سواری آتی ہے"

آوازیں قریب تر ہونے لگیں۔ سدا انند نے نقیبوں کی دوسری صدا سنی۔ بھاگ کر اندر گئے بیوی سے کہا۔ اسے مہارانی بھی ساتھ ہیں۔ یہ تو بری طرح برادری والوں سے بھوت چڑیلوں کی طرح چپٹے ہیں۔ "مان نہ مان میں تیرا مہمان" ذرا خاطر مدارات سے پیش آنا۔ اندر سے وہ مرادآبادی چوکی نکلوالو۔ بڑی کرسی بھی رکھوا دینا"

جلدی جلدی یہ ہدایت دے کر سدا انند باہر آئے تو سواری دروازے پر آ پہنچی تھی۔ مہاراجہ نے سواری سے اترتے ہی سدا انند کو پرنام کیا۔ سدا انند سر جھکانے والے تھے کہ مہاراجہ نے کہا "نہیں نہیں۔ آپ بزرگ ہیں"۔

شکمپال دہلیز پر لگا دیا گیا۔ ڈیوڑھی کے اندر گیس کا ہنڈا جل رہا تھا۔ مہارانی اتریں۔ دس داسیاں انکا ملو گئے تھیں۔ مہارانی کے سر کے مرصع و مزین تاج کے بیش بہا ہیرے۔ اور ساری کے سچے موتیوں کی جھالر گلے کے ہار کے نادر جواہرات کی چمک سب کی آنکھوں کو چوندھیا رہی تھی۔ باہر مہاراجہ کی آو بھگت ہو رہی تھی اندر مہارانی کی شان و شوکت کو دیکھنے کے لئے عورتوں کا جم غفیر امنڈا ٹوٹا پڑتا تھا۔ مہارانی متحیر اور ایک سراسیمگی کی حالت میں ہر ایک کا منہ تک رہی تھیں۔

یکایک مہارانی کی نگاہ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی پتلی دبلی ادھیڑ عورت پر پڑی۔ اسکا بدن لاغر تھا۔ اسکے بدن پر ایک میلی اور پھٹی ہوئی دھوتی تھی۔ اس نحیف عورت کی نگاہ بھی مہارانی سے دوچار ہوئی۔ اس نے زور سے کہا "تم کون ہو؟ بولو بولو"

ایک ممتاز داسی نے کہا "ہز ہائینس مہارانی آف گڈھ کھردہ"

مہارانی چیخ کر اچھل پڑی۔ "نہیں۔ نہیں۔ اماں میں ہوں تمہاری بیٹی ۔ کلاوتی"

ر ایک مہارانی کا سر ایک غریب بیوہ کی گود میں تھا۔

چیخ کی آواز مردانہ تک سنائی دی۔ مہاراجہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ "مہاراج سدانند!

ان جی! آپ جلد اندر چلے جائیے۔ اور اس گوہر بے بہا کی خبر لیجئے جسکو اچھی طرح پرکھنے کے بعد

ں نے اپنے تخت کی زینت کے لئے منتخب کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی فوری جوش اسکے شیشۂ دل کو

ے ٹکڑے کر دے"

سب کے آگے سدانند تھے انھوں نے سنا۔ ماں نے بیٹی سے پوچھا "کلا! وہ کالا کبڑا لنگڑا و دیارتی کہاں ہے؟"

ال! نہیں! نہیں! ہز ہائینس مہاراجہ ...."

"تو پھر کیا ہز ہائینس ایسے ...."

ماں نہیں! نہیں! وہ بہروپ تو سامنے والی سڑک پر دو تین ہی فرلانگ دور جا کر اتارڈالا تھا اور وہاں دیوان کنج بہاری لعل رائے بہادر پیشوائی کو موجود تھے۔ ہاں۔ اماں۔ وہاں ے لینے کو فوج موجود تھی۔ بندوقوں کی سلامی ہو رہی تھی۔ ماں! کیا تمنے نہیں سنا تھا؟"

سدانند کو اس دن کی محویت کا خوابی نظارہ یاد آ گیا۔ وہ اب بھی دم بخود خواب سا دیکھ رہے تھے، معلوم کن خیالات نے انکو بے خود سا کر دیا تھا۔

یکایک منشی کنج بہاری لعل کی آواز "بڑی سرکار کو پرنام" سنکر وہ چونک پڑے۔ انھوں نے ۔کر ایک تاجدار کا سر آنکھی مظلوم بیوہ کے سامنے خم ہے۔ ایک مہارانی اسکی گود میں ہے اور عالی مرتبہ دیوان اسکو پرنام کر رہا ہے۔

"یہ ہے کرشن کی مایا"

رباعیات صفی

ہے توسنِ عمرِ گزراں گرمِ شتاب
طفلی کا زمانہ ہے نہ ہنگامِ شباب
پیری کا مزا ہے زیست سے سیری ہے
پایانِ شبِ عمر ہے یا خواب

ہمت اعضا تمام سب ہارے ہیں
بیکار حواس ہیں یہی سارے ہیں
پیری کا اشارہ ہے کہ آگاہ صفی
اب موت کی جانب سے نقارے ہیں

دل میں جو ہوس ہو درہم و دینار نہ رکھ
ذخیرۂ عصیاں کا انبار نہ رکھ
پیری میں ہے ہر غرض سے لگاؤ اے صفی
بس جی کو دنیا سے اب سروکار نہ رکھ

صفی لکھنوی

آزادی ادب

از ابو الکمال مولوی سید عبد الودود صاحب ورد بریلوی مرحوم

ہے طبیعت اور حقیقت اصل و موضوعِ ادب
اور لٹریچر اسی کے ذیل میں آتا ہے سب

ہے ادب کیا چیز؟ گویا اک طبیعی ترجمان
اور شاعر کیا ہے؟ گویا ایک فطرت کی زبان

آنچہ استادِ ازل گفت است می گوئیم ما
رازہائے مخفی و سربستہ می گوئیم ما

آشیاں ہے بلبلِ باغِ تخیل کا بلند
پاؤں پر اسکے نہیں اخلاق و مذہب کی کمند

یہ بہ تبدیلِ زمانہ اور بہ تبدیلِ مکاں
ایک حالت پر نہیں گاہے چنیں گاہے چناں

گر ادیب فلسفی اخلاق کے پابند ہوں
جملہ درہائے ترقی انکے منہ پر بند ہوں

ہے ادب اک یونیورسل اور عالمگیر چیز
مشرق و مغرب میں یکساں طور پر ہر دلعزیز

اختلافِ السنہ سے فرق کچھ پڑتا نہیں
لعل و گوہر لعل و گوہر ہیں لیجاؤ کہیں

مختلف اخلاق ہیں یا کہ سر مختلین آج
ہیں جدا ہر ملک کے آداب اور رسم و رواج

کون سے اخلاق کا تابع ہے بیچارہ ادیب؟
ایک ہی نغمہ پہ کیوں مجبور ہو یہ عندلیب؟

اہلِ علم و ذوق کو یہ قید وجہِ عار ہے
اسکی پابندی ادب میں ہو بہت دشوار ہے

شاعری کا کوئی مذہب ہے نہ کچھ اخلاق ہے
شاعری کے قصر میں یہ قصہ زیبِ طاق ہے

رباعی

از وادیِ فتنہ ہمچو گرد آمدہ ایم
دل باختہ با چہرۂ زرد آمدہ ایم

زہر لیست کہ اندر رگِ جاں ریختہ اند
تحفہ فشاں ز راہ دور آمدہ ایم

وفا رامپوری مرحوم

کرمکِ شب تاب

از منشی رتیام سنگھ بھنوری

کرمکِ شب تاب تجھکو کیا کہوں میں کیا ہے تو؟
زینتِ گلشن ہے تو زیبائشِ صحرا ہے تو
اِک جہانِ شعلہ زارِ حسن سرتاپا ہے تو
رات کی تاریکیوں میں نور کا پتلا ہے تو
بادۂ حسنِ ازل سے پُر ترا پیمانہ ہے
تیری ہر پرواز میں اک لغزشِ مستانہ ہے

تو کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو اے جگنو نہیں
بہرِ نظارہ اتر آیا ہو جو سوئے زمیں
محفلِ ہستی میں جلوہ گر ہے کوئی مہ جبیں
دستِ ساقی میں ہے یا جامِ شرابِ آتشیں
دیکھے چشمِ تماشا شعلۂ عریانِ حسن
عمر بھر دیکھی نہ ہوگی تو نے ایسی شانِ حسن

تو یدِ قدرت کا کیسا دلفریب اعجاز ہے
آئینہ میں آئینہ ہی آپ عکس انداز ہے
انتہائے حسن ہے تو عشق کا آغاز ہے
گاہ شمع و گاہ خود پروانہ جانباز ہے
تو صفائے قلب سے روشن ہے مانندِ قمر
اہلِ بینش کیوں نہ سمجھیں تجھکو نورِ دیں نظر

یہ تری تابندگی ہے جوششِ رنگِ شباب
یا فضا میں ایک ہلکی سی شعاعِ ماہتاب
ڈالتا ہے کیوں رُخِ روشن پہ رہ رہ کر نقاب
کیا پسند آئی تجھے پابندیِ رسمِ حجاب
تیرے جلوے سے ہے رنگیں عارضِ زیبائے حسن
بادۂ احمر سے گلگوں ہو گیا مینائے حسن

طور در آغوش ہے تو کرمکِ آتش بجاں
دیکھتا ہوں چشمِ حیرت سے ترا سوزِ نہاں
یہ تری شعلہ فشانی اور یہ بیتابیاں
پیکرِ خاکی میں شاید چھپ رہی ہیں بجلیاں
ایک حالت پر نہیں تجھکو کسی پہلو قیام
جستجو میں کس کی آوارہ ہے اے محشر خرام

ننھا سا ٹکڑا ہے یا برق و شرر کا آئنہ
انقلابِ گردشِ شام و سحر کا آئنہ
یا طلسمِ دہر کے زیر و زبر کا آئنہ
کشتگانِ ناز کے دردِ جگر کا آئنہ
یہ تری بے مائگی یہ سوز و سازِ زندگی
ہر تڑپ ہے اک ادائے دلنوازِ زندگی

ترانۂ وطن

از حضرت روشؔ صدیقی

حوادثات کے اونچے پہاڑ توڑونگا — تغیرات کو مجبور کرکے چھوڑونگا
مین تیری خاک وقار جبین بناؤنگا — مرے وطن! تجھے خلد برین بناؤنگا
خزان کو بار ملے گا نہ تیرے گلشن مین — مین تیرے خار بھی رکھلونگا اپنے دامن مین
بہار خلد بساؤنگا گوشے گوشے مین — چمن ہزار کھلاؤنگا ذرے ذرے مین
خیال زیست نہ اندیشۂ اجل ہوگا — ترے لئے مرا بازو کبھی نہ شل ہوگا
اڑونگا چرخ پہ جوش وفا کے افسون سے — ستارے توڑکے لاؤنگا سقف گردون سے
تری نشاط پہ میری ہراک خوشی قربان — تری حیات پہ سو بار زندگی قربان
اگر نوشتہ بدل جائے میری قسمت کا — نہ نقش دل سے مٹے گا تری محبت کا
ہزار بار بھی برباد ہون تو عشرت ہے — مین تیری گود مین آزاد ہون تو عشرت ہے

وفا پرست ہون مین مرکز وفا تو ہے
روشؔ ہے تیرا پرستار دیوتا تو ہے

بادۂ کہن

چشم ہوس اٹھائے تماشے سے جون حباب — نادیدنی کی دید بس اک دم بہت ہے یان
دیکھا جو باغ دہر تو مانند صبح وگل — کم فرصتی ملاپ کی باہم بہت ہے یان

سودا

نکاتِ شیکسپیئر

از منشی تلوک چند محروم بی۔ اے

قدرِ شئے

قدر ہم اسکی نہیں کرتے ہیں پُوری پُوری ۔۔۔ چیز جب ہوتی ہے اِک پاس ہمارے موجود
ہاتھ ملتے ہیں۔ وہ جب ہاتھ سے جا سکتی ہے ۔۔۔ اپنے اوصاف دکھا دیتی ہے جو کر مفقود

مصیبت میں راحت کا خیال

ہاتھوں میں اپنے آگ کو کس طرح لیجیئے ۔۔۔ دل میں خیال کر کے ہمالہ کی برف کو
بیٹھے ہوئے پلاؤ خیالی پکا لیئے ۔۔۔ مِٹتی ہے بھُوک پیاس کہیں اس طرح بھلا
چلئے ننگے کے برفِ زمستاں میں برہنہ ۔۔۔ بھر لیجئے سر میں شدتِ گرما کی کچھ ہوا
راحت کا یوں خیال مصیبت میں رنج میں ۔۔۔ کرتا ہے اور رنج و مصیبت کو جاں گزا

نصیحت

ہر ایک سے کیجئے محبت ۔۔۔ چند ایک پہ اعتبار لیکن
دیجئے نہ کبھی کسی کو ایذا ۔۔۔ طاقت میں عدو سے کم نہ رہئے
لیکن کیجیے نہ پیش دستی!

احباب کو اپنے رکھئے دائم ۔۔۔ اپنے ہی حلقہ اثر میں
یہ عیب نہیں ہے۔ سُننے والے ۔۔۔ کم گوئی پہ معترض اگر ہوں
لیکن ہے بڑی فضول گوئی.

رباعی

اے ذوقِ نظر یہ دید بازی کب تک؟ ۔۔۔ اے شورشِ سر یہ ہرزہ تازی کب تک؟
اب شرمِ گنہ بھی منہ چھپانے آئی ۔۔۔ اے شانِ کرم یہ بے نیازی کب تک؟

وفا اسیرؔ

علمی خبریں اور نوٹ

چند اہل علم کے مساعی جمیلہ اور صوبہ متحدہ کی حکومت کی سرپرستی کی بدولت ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کا قیام ایک ایسا کارنامہ ہے جو نہ صرف علم دوست حضرات بلکہ عوام کے بھی شکریہ کا مستحق ہے۔ اکیڈیمی کو قائم ہوئے ابھی تقریباً دو سال ہوئے ہیں مگر اس قلیل مدت میں جو کچھ کام کیا جا چکا ہے اسکو مدنظر رکھکر یہ اُمید کیجا سکتی ہے کہ آگے چلکر اکیڈیمی سے جو اُمیدیں وابستہ ہیں وہ عنقریب پوری ہونگی

اکیڈیمی کی جانب سے مختلف علوم وفنون پر ممتاز اہل قلم سے کتابیں لکھانے اور مشاہیر اہل علم سے لیکچر دلانیکا جو انتظام ہے اس پر "زمانہ" کے گذشتہ نمبروں میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اب اسکی جانب سے اُردو زبان کے شعراء کے کلام کا انتخاب کرایا جا رہا ہے جو بعد تکمیل یقیناً ایک مستقل کارنامہ ہوگا۔ اس انتخاب میں ابتدائی زمانہ سے لیکر آخری دور تک کے تمام مشاہیر و مستند شعراء کا کلام ہوگا جسکی چھ جلدیں ہونگی۔ بعض ایسے شعراء کا کلام بھی بہم پہونچا کر شامل انتخاب کیا گیا ہے جو اگرچہ عام طور پر مشہور نہیں ہیں لیکن ان کا کلام پڑھنے کے قابل ہے۔ ہر شاعر کا مختصر حال اور اسکے کلام پر مجملاً اظہار خیال بھی کیا گیا ہے۔ غرض اپنی وضع کا یہ ایک مکمل و جامع انتخاب ہوگا۔

۳۱۔ مارچ کو ختم ہونیوالی سہ ماہی میں صوبہ متحدہ میں اُردو زبان کی صرف سوا سو (۱۲۵) کتابیں شائع ہوئی ہیں جنمیں جدید کتابیں اور طبع ثانی دونوں شامل ہیں۔ نثر میں زبان کے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں "مضامین چکبست" اور "جوہر العروض" کے علاوہ اور کوئی مفید کتاب معلوم نہیں ہوتی۔ نظم میں عموماً غزلوں کے مجموعے ہیں یا معمولی منظوم قصّے اور کچھ کتابیں تعلیمی نصاب کی ہیں۔ بہرحال کتابوں کی تفصیل بہ اعتبار موضوع حسب ذیل ہے:۔

قصّے۔	۱۵	تاریخی۔	۵
زبان	۱۹	تعلیمی	۱۵
قانون	۲	متفرق	۲۱

طب۔	۳	نظم۔	۳۱
سیاسی۔	۵		
مذہبی۔	۹		

علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر یقیناً مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ نظام کالج حیدرآباد دکن کے پروفیسر آغا محمد علی صاحب نے فارسی زبان کی ایک جدید لغت مرتب کی ہے جو نظام گورنمنٹ کی جانب سے سرکاری خرچ سے طبع کرائی جائیگی۔ اسکی طباعت کے مصارف کا تخمینہ تقریباً ساڑھے تین ہزار روپیہ سکہ نظام کیا گیا ہے۔

ترکی زبان میں جب سے عربی رسم الخط کو ترک کرکے لاطینی حروف تہجی کا رواج شروع ہوا ہے ہر شعبہ علمی میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔ علامہ حسین کاظم قدری نے تقریباً تیس سال کے مسلسل غور و فکر اور محنت کے بعد ترکی زبان کی ایک مبسوط لغت تیار کی ہے۔ اسمیں وہ تمام الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں جو تمام ترکی قومیں جو آذربائیجان، بخارا، خیوا وغیرہ میں سکونت پذیر ہیں استعمال کرتی ہیں۔ ترکی وزارت تعلیم کی منظوری سے اس لغت کی پہلی جلد عربی حروف میں طبع ہو چکی ہے۔ مگر اب انگورہ میں ایک ادارہ "مجمع اللغوی" کے نام سے حکومت کی منظوری سے قائم ہوا ہے جو جدید حروف میں ترکی زبان کی لغت تیار کرنے میں مصروف ہے اور دوسری علمی انجمنیں ترکی یونیورسٹی کی سرپرستی میں علمی اصطلاحات وضع کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ تمام ترکی کالجوں کے اساتذہ اور "مجمع اللغوی" کے ارکان انگورہ میں جمع ہوئے اور باہم تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد کام کرنے کا ایک راستہ مقرر کر لیا۔ ترکی یونیورسٹی کے ہر شعبہ کی سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے شعبہ کے متعلق اصطلاحات وضع کرکے "مجمع اللغوی" کے روبرو پیش کرے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک سال کے اندر جدید لغت تیار ہو جائے۔ اور اسکی تدوین و ترتیب میں علامہ حسین کاظم قدری کی مرتب کردہ لغت سے حتی الامکان فائدہ اٹھایا جائے۔ بہرحال یہ ایک بہت بڑا کام ہے مگر امید ہے کہ حکومت کی سرپرستی میں جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیگا۔

خوشی کا مقام ہے کہ اردو دنیا گزشتہ اساتذہ و مشاہیر شعراء کے کلام کو بہ نظر تنقید مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ ہو رہی ہے جسکی بین مثال معاصر "نگار" (لکھنؤ) کا گزشتہ "مومن نمبر" اور "نیرنگ" (درامپور) کا "میر نمبر" ہے۔ اب ۱۹۳۳ء کے لئے "نگار" نے اعلان کیا ہے کہ اسکا جنوری نمبر بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار سلطنت مغلیہ

حالات، سیرت، شاعری، انتخاب کلام نیز اس زمانہ کے سیاسی و ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے وقف ہوگا۔

"زمانہ" بابت ماہ مئی ۱۹۲۹ء میں منشی پریم چند صاحب بی اے کا ایک دلکش افسانہ بعنوان "عفو" شائع ہوا تھا جس کے مطالعہ کے بعد مولوی ولی محمد صاحب بالقابہ سکریٹری اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال اپنے ایک عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

(۱) اندلس میں علماء کے سوا اور کوئی شخص عمامہ نہ باندھتا تھا اور علماء بھی بہت ہلکے عمامے سروں پر رکھتے تھے جنکی وضع پنجابی پگڑیوں سے ملتی جلتی تھی۔

(۲) جنوبی اندلس اور سلطنت غرناطہ میں اونٹ نہیں ہوتا۔

(۳) وادی الکبیر اور بقیہ میں پتھر کی سلیں نہیں ہیں۔

ہم مولوی صاحب موصوف کی اس تکلیف فرمائی کے شکر گزار ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ ہمارے دوست پریم چند صاحب بھی شکرگزار ہونگے۔

افسوس سید عبدالودود صاحب درد بریلوی کے انتقال پُرملال سے "زمانہ" اپنے ایک قابل و پرجوش معاون کے فیض قلم سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔ مولوی صاحب اسلامیہ ہائی اسکول بریلی کے سکریٹری تھے اور مختلف ملکی و قومی تحریکات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے۔ آپ اولو العزم۔ بلند خیال مستقل مزاج و ہمدرد واقع ہوئے تھے جس کام کو ہاتھ میں لیتے محنت و خلوص کے ساتھ انجام تک پہونچاتے تھے۔ نان کوآپریشن کے زمانہ میں کئی ماہ آپکو قید فرنگ میں رہنا پڑا جس سے آپکے ملکی عقائد میں مزید استواری آگئی تھی۔ اُردو ادب سے آپکو خاص دلچسپی تھی۔ نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔ "زمانہ" کے پرانے قدردان تھے اور وقتاً فوقتاً اپنے افکار عالیہ بھی اشاعت کے لئے عنایت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس نمبر میں بھی آپکی ایک پُرزور نظم "آزادی ادب" کے عنوان سے ہدیۂ ناظرین ہے۔ ابھی دو ایک اور بھی اشاعت کے لئے رکھی ہوئی ہیں جو آیندہ زیب رسالہ ہونگی۔ کیا خبر تھی کہ یہ آپکی قلمی احسانات کی آخری قسط ہوگی۔ افسوس!

نوشتہ بماند سیہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا اُمید

مرحوم ایک عرصہ سے ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ اس مرض سے ذرا افاقہ ہوا تھا کہ تپ کہنہ کا حملہ ہوا اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ایک سال سے ضعف بڑھتا ہی گیا۔ چنانچہ ۸ مئی گذشتہ کو

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

جلد ۵۳ | اگست ۱۹۲۹ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

...ماوریہ۔ حضرت آدم کا خلد سے نکلنا۔ عشق و زندگی۔

...دیون کے علوم طبعی
از مولانا محمد عبدالرزاق مصنف البرامکہ ... ۹۵

قدیم لکھنؤ
از خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی ... ۴۲

بسمارک
از چودھری محمد علی بی۔ اے، ایل ایل بی وکیل ...

منشی نندلال گویا
از مسٹر ہری کرشن بی۔ سی۔ ... ۹۰

طوفان شاعری
از منشی کرشن سہائے ... ۹۶

چمار (افسانہ)
از پروفیسر ... ایم۔ اے ...

تنقید کتب
... دیوان ... ۔ ...
...

۸۔ ترانہ گنہگار
از پنڈت آنند نرائن ملا ایم۔ اے، ایل ایل بی ...

۹۔ جگر پارے
از بابو شیام موہن لال جگر بی۔ اے ...

۱۰۔ خودی
از پروفیسر رام پرشاد ... ایم۔ اے ...

۱۱۔ ترانہ وطن
از جناب محمود اسرائیلی ...

۱۲۔ غریب کی آرزو
از پنڈت ... ...

۱۳۔ بیان ہستی
از منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی ...

۱۴۔ لطف سخن
از حضرت ... ...

۱۵۔ عالمی خبریں اور ... ...

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

...

ذرا پس و پیش نہ کیجئے!

موسم سرما کے سرد دن اور سرد راتیں سر پر آرہی ہیں یقیناً آپ کوئی لوئی خریدنے کا ارادہ کر رہے ہوں گے مگر بازار میں اتنی قسم کی لوئیاں ہیں کہ آپ کے لیئے انتخاب کرنا مشکل ہے۔ ذرا پس و پیش نہ کیجئے۔ اور لال اِملی کی لوئی خرید لیجئے۔ لال اِملی کی لوئیاں سو فیصدی خالص اُون سے بنتی ہیں۔ انہیں ہندوستانی کاریگر ہندوستان کی سرزمین پر بناتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں خوبصورت ہیں اور خریدنے میں سستی ہیں۔

اگر آپ لال اِملی کی لوئیاں خریدیں گے۔ تو نہ صرف آپ ہی کو بہترین چیز ملے گی۔ بلکہ آپ کے دیسی مصنوعات کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

LALIMLI
PURE WOOL

ملاحظہ فرمایئے۔ قیمتیں کم کردی گئی ہیں

لوئیوں کی قیمتیں معہ محصول ڈاک

			طول		عرض		قیمت	
			گز	گرہ	گز	گرہ	روپیہ	آنہ
نمبر ۳۱	لوئیاں	(سفید اور رنگین)	۳	۰	۱	۸	۴	۰
نمبر ۲۶	"	"	۲	۱۵	۱	۶	۶	۱۲
نمبر ۲۶	"	"	۲	۸	۱	۴	۵	۷
نمبر ۴/۱۸	"	"	۲	۱۲	۱	۵	۵	۱۲
نمبر ۳/۱۶	"	"	۲	۱۵	۱	۶	۷	۸
نمبر ۲۶		(چارخانہ دار)	۲	۱۵	۱	۶	۷	۳
نمبر ۶۰		(سفید اور رنگین)	۳	..	۱	۶	۱۳	۰

کانپور وولن ملز کمپنی — پوسٹ بکس نمبر ۹ کانپور

رجسٹرڈ ٹریڈ مارک

اپنے شہر کی لال املی ایجنسی میں جاکر نمونے دیکھئے اور پسند فرمایئے اگر وہاں ایجنسی نہ ہو تو ہم سے [illegible]

زمانہ

جلد ۵۳ — اگست ۱۹۲۹ء — نمبر ۲

عربوں کے علوم طبعی

(از مولانا محمد عبدالرزاق صاحب کانپوری)

۱۔ علم مہب الریاح یا ہواؤں کا چلنا | علم الانواء (نچھتروں) کا تعلق جس طرح آسمان، آفتاب، ماہتاب اور ستاروں سے تھا، اسی طرح یہ علم کائنات فضا سے بھی تعلق رکھتا تھا جسمیں ہواؤں اور بارش سے بحث کیجاتی ہے

عرب، طے مسافت میں بھی ہواؤں کا خیال رکھتے تھے اور یہ ہوائیں بھی اُنکی رہبر تھیں، اسلئے ہواؤں کا نام جداگانہ تھا۔ تعمیر مکانات میں بھی ہواؤں کا لحاظ رکھتے تھے اور مکانات کے دروازے مشرق کی جانب ہوتے تھے کہ جاڑے اور گرمی سے محفوظ رہیں۔ علم الھواء پر عربوں کی کوئی مستقل تصنیف ہماری نظر سے نہیں گزری بلکہ اس علم کا مدار بھی اشعار جاہلیت پر ہی جن سے ضروری مضامین اخذ کرلئے گئے ہیں۔

اقسام ہوا | عربوں میں اُمّ الریاح، صرف چار ہیں۔ باقی ہوائیں ان سے ملکر پیدا ہوتی ہیں اور اثرات و رفتار کے لحاظ سے ان کی مختلف حالتیں ہیں۔

۱۔ صبا | یہ پُروا ہوا ہے، جسکو مانسون (یہ لفظ موسم سے مشتق ہے) کہنا چاہئے۔ یہ ابر لاتی ہے اور سامنے کے رُخ (مطلعِ شمس) سے چلتی ہے۔ اور مبارک مانی جاتی ہے۔

صبا کا مادہ صبوۃ ہے، جسکا ترجمہ ہے میلان اور مسرت، اور چونکہ یہ ہوا مژدۂ جانفزا لاتی ہے، اسلئے صبا نام ہوا۔ یہ نہایت سریع السیر ہے اس لئے شاعروں نے اِس سے نامہ و پیام کا کام لیا ہے۔ عرب اِسکو نسیم الصبا بھی کہتے ہیں۔

عرب کے مشہور ملک الشعراء امرؤ القیس نے ایک قصیدہ میں زمین سے بخار کا اُٹھنا، پھر اُسکا بادل ہوجانا اور بجلی کا چمکنا اور اسکی تمام کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ جسکا ایک شعر یہ ہے ؎

فراح تمريه الصبا ثم انتحى — شام کو صبا بادل سے بکری کے دودھ کی طرح دوہنے لگی۔
به سئوب جنوب منفجر — اسکے بعد جنوبی ہوا کا لایا ہوا اور منتشر ہو کر برسنے والا ابر خوب برسا

اس شاعرانہ خیال کی بنیاد یہ ہے کہ جب دودھ دوہا جاتا ہے تو پہلے دھارا ہستہ آہستہ نکلتی ہے، پھر تیز ہو جاتی ہے اور خوب دودھ نکلتا ہے یہ ابر کی قدرتی تشبیہ ہے کیونکہ پہلے صبا چلتی ہے، اس وقت معمولی ترشح ہوتا ہے، پھر جنوبی ہوا آتی ہے تو زور کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔

۲۔ دبور | یہ وہ ہوا ہے جو پشت کی جانب سے چلتی ہے جسکو پچھوا کہتے ہیں یہ مغرب الشمس سے مطلع سہیل کی طرف جاتی ہے۔

۳ و ۴۔ شمال و جنوب | یہ اُترا اور دکھن کی ہواؤں کا نام ہے چنانچہ شمال نامبارک ہے اور قحط کی علامت ہے۔ یہ کرسی، بنات النعش سے سورج کی طرف چلتی ہے۔ لبید شاعر فخریہ کہتا ہے۔

وغداة ريح قد وزعت وقرة — موسم سرما میں صبح کے وقت (جبکی باگ شمالی ہوا کے ہاتھ میں تھی)
قد اصبحت بيد الشمال زمامها — میں نے محتاجوں کو کھانا کھلایا اور انکی حاجتیں پوری کیں

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ میں قحط اور شمالی ہوا کے زمانہ میں فیاضی کرتا ہوں۔

جنوبی ہوا مطلع سہیل سے شروع ہو کر مطلع شمس تک چلتی ہے باقی ہواؤں کے یہ نام ہیں۔

۱۔ تناوحہ — یہ چاروں طرف چلتی ہے اور نرم رفتار ہے۔ جسکو ہندی میں چوبائی کہتے ہیں۔
۲۔ نکباء — یہ آندھی ہے، جس سے بادل منتشر ہو جاتے ہیں، یہ دبور اور صبا کے درمیان چلتی ہے اور چاروں طرف چکر کھاتی ہے۔
۳۔ ازیب — یہ مشرق و جنوب کے درمیان چلتی ہے۔
۴۔ صابئہ — جنوب اور دبور کے مابین چلتی ہے۔
۵۔ جربیاء — دبور اور شمال کے درمیان چلتی ہے۔
۶۔ هیف — شمال اور صبا کے مابین چلتی ہے۔
۷۔ نانجہ — نہایت تیز رفتار ہے۔
۸۔ حاصبہ — یہ اس زور سے چلتی ہے کہ ہوا میں کنکریاں اُڑنے لگتی ہیں۔
۹۔ خرجف — سرد ہوا۔
۱۰۔ نسیم — یہ صبا کی بہن ہے نہایت نزاکت سے قدم اُٹھاتی ہے۔ شعرائے ہند بھی اسکے مداح ہیں۔
۱۱۔ حرور، سموم — جو ہوا حد سے زیادہ تیز اور گرم چلتی ہے وہ سموم ہے۔ ریگستان عرب میں قافلے اس ہوا سے زندہ در گور

ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ مختلف اوصاف کے لحاظ سے جملہ مرکب ہوائیں تعداد میں چھبیس ہیں۔ قرآن کریم میں آٹھ قسم کی ہواؤں کے نام آئے ہیں۔

(الف) مبشرات، مرسلات، ذاریات، ناشرات،

(ب) صرصر، عقیم، عاصف، او قاصف، یہ چاروں آندھیاں قہر الٰہی ہیں۔ دوسری بالکل خشک ہے، تیسری اور چوتھی سمندر سے مخصوص ہیں۔

اس علم سے جہازرانی میں کام لیا جاتا ہے۔

۲۔ علم المطر یا بارش کا علم | جزیرۃ العرب کے اندر دریا اور بڑی نہریں نہیں ہیں جو چراگاہوں کو سیراب کریں اور مواشی و زراعت کے لئے بھی پانی کافی نہیں ہے اور قحط کے مصائب اسکے علاوہ ہیں، اس لئے ابنائے بادیہ (بدوی) کی نظریں ہمیشہ آسمان پر لگی رہتی تھیں، اور وہ ستاروں اور ہواؤں کی چال سے معلوم کر لیتے تھے کہ کب پانی برسے گا۔ کونسی بدلی برسے گی اور کون خالی جائیگی؟ چنانچہ عرب کی تاریخوں میں بارش کے متعلق نہایت دلچسپ قصے لکھے ہیں۔

ایک[1] اندھے کا واقعہ ہے کہ وہ اپنی ایک چھوٹی لڑکی کے ہمراہ جنگل میں بکریاں چرا رہا تھا کہ یکایک آسمان پر بادل چھا گیا، لڑکی نے باپ سے کہا کہ "پانی آگیا" باپ نے پوچھا، کس رنگ کے بادل ہیں؟ لڑکی نے جواب دیا "کانھا فرسٌ وھما تجر جلالھا" بابا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سیاہ گھوڑا اپنی جھول اتار رہا ہے (مطلب یہ ہے کہ بادل کی سیاہی کم ہوتی جاتی ہے)

یہ سن کر بڈھے نے کہا کہ کچھ فکر نہ کر، بکریاں چراتی رہ، تھوڑی دیر بعد پھر ابر آیا، لڑکی نے چلا کر کہا "کانھا عین جمل طاریف" یعنی بدلی جوان اونٹ کی آنکھ کی طرح ہے (اونٹ کی آنکھ نیلگوں ہوتی ہے اور بچوں میں زردی مائل ہلکی سیاہی ہوتی ہے) باپ نے کہا کہ یہ بدلی نہیں برسے گی، کچھ دیر بعد پھر ابر آیا لڑکی نے کہا "سطحت وابیضت" (پھیلی ہوئی سفید بدلی ہے) باپ نے کہا کہ "بکریوں کو پہاڑ کی کھوہ میں لیجا، بارش ہونے والی ہے"۔ اغانی میں اصمعی وغیرہ سے ایسی متعدد روایتیں منقول ہیں۔ عرب کے اندھے، ہوا کے اثر سے معلوم کر لیتے تھے کہ کب اور کس قسم کی بارش ہوگی۔

---

[1] بلوغ الارب صفحہ ۲۵۹ جلد ۲۔

بارش کے لئے لغات عرب میں متعدد الفاظ موجود ہیں - مثلاً

۱- غَیث وہ بارش جو عین وقت پر ہو-
۲- وَدِیمَہ ٹھہر ٹھہر کر ہو-
۳- وَابِل بڑی بوندوں کی سخت بارش-
۴- جَوْد جس سے جل تھل بھر جائے-

ربیع الاول کی بارش کا نام وسمی ہے کیونکہ برسات زمین میں نباتات کا وسمہ لگا دیتی ہے- یہ وسم سے مشتق ہے جسکے معنی داغ کے ہیں-

اسی طرح بدلی کے بھی متعدد نام ہیں-

۱- سَحاب معمولی بدلی-
۲- مکفہر چھایا ہوا گہرا بادل-
۳- مرزم وہ بدلی جس میں بجلی تڑپتی ہے-
۴- جلب ہلکی بدلی جس میں پانی نہ ہو-
۵- جنابہ وہ بدلی جو دھوئیں کی طرح آسمان پر چھا جائے-

بارش کے نچھتر جداگانہ تھے اور ہر بارش کو وہ کسی نہ کسی نچھتر سے منسوب کرتے تھے، جو اس وقت طالع ہوتا تھا[1]- مثلاً "مُطِرنا بنوء المجرۃ" (کاہکشاں کے نچھتر سے بارش شروع ہوتی ہے) بدلی کے رنگ سے وہ یہ جان لیتے تھے کہ اسمیں پانی کم ہے یا زیادہ- مثلاً سفید میں کم، سرخ میں کسی قدر زیادہ اور سیاہ میں بہت زیادہ پانی ہوتا تھا- چنانچہ عربوں کا یہ مشہور قول ہے "السحابۃ البیضاء جَفَلٌ والحمراء عارض والسوداء هطلة"، یعنی سفید بدلی جَفَل ہے (پانی برسا چکی ہے) اور سرخ عارض ہے (چھائی ہوئی ہے) اور سیاہ ھطلہ ہے (خوب برسنے والی) رعد اور برق کو بھی بارش میں دخل تھا- مثلاً جب بادل میں معمولی کڑک ہو تو کہتے تھے کہ ابھی بارش میں دیر ہے- اور جب کڑک پر شور ہو تو یہ قرب بارش کی علامت تھی، اسی قسم کی علامتیں بجلی میں بھی تھیں-

۳- علم الماء (پانی کا علم) آلات کے ذریعہ سے پانی کی کیمیائی تحلیل زمانۂ حال کی ایجاد ہے- عربوں میں پانی کی کوئی تقسیم نہ تھی- وہ صرف صاف، ستھرے اور غیر مکدر پانی کو اچھا جانتے تھے- اور سب سے بہتر بارش کا پانی (ماءُ السماء) تھا اور اسی لطافت کی بناء پر عرب کی ایک شاہزادی کا لقب ماء السماء تھا-

[1] میدانی صفحہ ۱۰۹ جلد اول

عرب پانی کو سرمایۂ حیات جانتے تھے اور اُنکا یہ بھی خیال تھا کہ صاف اور نِتھرا ہوا پانی حُسن کو چمکاتا ہے۔ امرؤالقیس کہتا ہے۔

کبکر المقاناۃ البیاض بصفرۃ وہ محبوبہ شترمرغ کے انڈے کی طرح ہے جسمیں سپیدی اور زردی آمیز ہے

غذاھا نمیر الماء غیر محلل اور اُسکو خالص اور صاف سُتھرے پانی نے پرورش کیا ہے

اطبائے عرب کے نزدیک پانی کے یہ اوصاف تھے۔

رنگ شفاف ہو، بُو نہ ہو، شیریں ہو، ہلکا ہو۔ گہرے کنوئیں یا چشمہ کا ہو، اور ایسی جگہ کا ہو جس پر دھوپ اور ہوا کا گزر ہو، بندلہ (راکد) نہ ہو بلکہ بہتا ہُوا ہو، اور یہ بھی شرط ہے کہ تازہ ہو۔

عرب، پانی کو بشرطِ ضرورت اِس طرح صاف کرتے تھے کہ آبِ شور کو اُبال کر بخارات ایک اُون کے ٹکڑے میں جذب کرتے تھے اور پھر اُسکو نچوڑ لیتے تھے۔

عرب زمین سُونگھ کر یہ بھی بتا دیتے تھے کہ پانی کس قدر گہرائی میں ہے۔ چنانچہ نجدیوں میں یہ علم ہنوز موجود ہے، وہ زمین میں کان لگا کر پانی کا اندازہ کر لیتے ہیں اور اِس فن کا نام علم الریافہ ہے اور یہ فراست پر موقوف ہے اور یہ لوگ قصّاۃ کہلاتے ہیں۔

۴- عِلم الاَصنام (بُت پرستی و بُت تراشی) علم الاصنام، جسکو علم الخرافات اور میتھالوجی بھی کہتے ہیں اسکا بھی نجوم سے تعلق تھا کیونکہ عرب ستارہ پرست تھے۔ اور انھیں کی صورت و شکل کی مورتیں بنا کر پوجا کرتے تھے لہٰذا اِن ستاروں کی نسبت اِن میں طرح طرح کے فسانے بھی مشہور تھے مثلاً دبران نے ثریا کو شادی کا پیام دیا تھا اور چاند دونوں کا وکیل تھا۔ ثریا نے کہا کہ دبران نے کیا سمجھ کر شادی کا پیغام بھیجا ہے وہ تو فقیر ہے (ثریا میں چھ ستارے ہیں اور دبران تنہا ہے یہی اسکی مفلسی ہے) جب دبران نے یہ حقارت آمیز پیام سُنا تو وہ اپنی اونٹنیوں کو اظہارِ تموّل کے لئے ثریا کے سامنے ہانک کر لے گیا۔ غرض کہ شادی تو آج تک نہوئی، لیکن تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی دبران نے ثریا کو نہ چھوڑا۔ (چونکہ دبران ہمیشہ ثریا کے عقب میں نکلتا ہے اسی وجہ سے اسکو دبران کہتے ہیں اور یہی تلمیح اِس قصّہ کی جان ہے)۔

دوسری حکایت یہ ہے کہ جدی (قطب تارہ) نے نعش (نام ستارہ) کو قتل کر دیا تھا۔ اِس لئے نعش کی بیٹیاں (بنات النعش) باپ کا قصاص لینے کو قطب کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں، لیکن آج تک کامیاب نہیں ہوئیں۔ ضرب الامثال میدانی میں اور بھی دلچسپ قصّے ہیں۔

لہ حضرت ناسخ کا مشہور شعر ہے ؎ رُکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں + کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں۔

۵- علم الملاحۃ یا کشتی رانی | جزیرۃ العرب کے اندر اگرچہ سمندر اور دریا موجزن نہ تھے تاہم بحرِ قلزم، بحرِ ہند، خلیج فارس اور عمان و بحرین کے اتصال سے انکو کشتی رانی کی ضرورت پیش آئی اور انھوں نے اس علم میں بھی خاص امتیاز پیدا کیا اور چونکہ عربوں کا ہند، روم، شام، ایران اور ممالکِ حبش سے سلسلۂ تجارت تھا لہذا اس علم سے وہ کسی طرح بے نیاز نہیں ہوسکتے تھے۔

عربوں کا علم الملاحۃ میں کامل ہونا تو تاریخوں سے ثابت ہے، لیکن اس فن پر کوئی کتاب نہیں ہے جس سے تفصیل معلوم ہوسکے البتہ اشعار اور لغت کی مدد سے ضمنی امور معلوم ہوتے ہیں۔ کشتی رانی میں رات کے وقت ستارے انکے راہ نما تھے۔ اور ہزاروں تجارتی کشتیاں سمندر پر دوڑتی پھرتی تھیں۔ عمرو بن کلثوم تغلبی کا یہ دعوے محض شاعرانہ نہیں ہے۔

ملاء نا البر حتیٰ ضاق عنا ہمارے قبیلے کی کثرت سے زمین کو
ونحن البحر نملاہٗ سفینا اور ہماری کشتیوں نے سمندر کو معمور کردیا ہے

عہدِ اسلام میں عربوں نے جہازی بیڑے تیار کیے جسکی تفصیل ایک جداگانہ مضمون میں لکھی جائیگی۔ لیکن جاہلیت میں اُنکے پاس بڑی اور چھوٹی کشتیاں تھیں اور یہ تین قسم کی تھیں۔

الف۔ فلک، سفینہ، قرقور، جاریہ، خلیہ (کلاں)

ب۔ قارب زورق (ڈونگیاں)

ج۔ بوصی اور عدولیہ (یہ دجلہ و فرات میں چلتی تھیں سبعہ معلقہ میں انکے نام آئے ہیں اور حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفرنامہ میں بوصی کا ذکر کیا ہے)۔

کشتی کے متعلق لغاتِ ذیل قابلِ توجہ ہیں۔

۱- شراعہ و قلع	بادبان۔
۲- قلس	کھجور اور ناریل کے موٹے رسّے۔
۳- جؤجؤ	کشتی کا سینہ (ابتدائی حصّہ)
۴- کوثل	دنبالۂ کشتی (پچھلا حصّہ)
۵- معروی، قیقلان، مجداف	پتوار (کشتی چلانے کی بلّیاں)
۶- مرساۃ	آہنی لنگر، گھاٹ،
۷- مینا	بندرگاہ۔
۸- نوتی۔ عرکی۔	ملّاح۔

۹- دسار — کشتی کی ڈوریاں جس سے تختوں کی بندش ہوتی ہے۔

۱۰- علم الاہتداء یا راستوں کی راہ نمائی

عرب کا ملک ریگستان ہے اور بعض قطعات میں جنگل ہے جسکے اندر نہ سڑکیں ہیں نہ پگ ڈنڈیاں، اس لئے قافلوں کا بغیر راہ نما کے چلنا محال تھا- اور ہر قافلہ کے لئے ایک دلیل (رہبر) کی ضرورت تھی، جو سلامتی جان و مال کے ساتھ منزل مقصود پر پہونچاتا تھا- یہ راہ نما ستاروں کو خوب جانتے تھے اور انھیں کے طلوع و غروب پر سفر کی بنیاد تھی- قرآن مجید میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے-

هوالذی جعل لکم النجوم لتهتدوا بها فی ظلمات البر والبحر — اور اسی نے تمھارے لئے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے جنگل اور دریا کی تاریکیوں میں راستہ پاؤ (سورۂ انعام رکوع ۱۸)

ستاروں کے علاوہ وہ ہواؤں سے بھی کام لیتے تھے اور علم الریافہ سے بھی- اور ستاروں سے کام لینے کی مثال یہ ہے کہ قافلہ کو مکہ جانا ہوتا تو وہ قطب شمالی کے ذریعہ سے سفر کرتا تھا، کیونکہ قطب تارہ میں حرکت نہیں ہے اور وہ ہمیشہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہتا ہے اور اس ستارے کو ہر شخص پہچانتا تھا- اور چونکہ شہروں کے قرب و لبعد سے قطب کی سمت میں فرق ہوجاتا تھا، اس صورت میں عراق سے چلنے والا قافلہ دائیں کان کے پیچھے، اور مصر کا قافلہ بائیں کان کے پیچھے قطب کو طے کرتا تھا- اور اس طرح وہ مکہ پہونچ جاتا تھا- قطب کے بعد جدی، فرقدان اور منازل قمر سے کام لیتے تھے-

یہ راہ نما نشانِ قدم کو بھی خوب پہچانتے تھے- جس سے سفر میں اور نیز مسروقہ حیوانات کی تلاش میں بڑی کامیابی ہوتی تھی- وہ یہاں تک بتاتے تھے کہ یہ جوان آدمی کا قدم ہے یا بوڑھے کا، اور عورتوں کے نشانِ قدم میں کنواری اور بیاہی کا امتیاز کرلیتے تھے- چنانچہ نجد میں ایسے لوگ ہنوز موجود ہیں-

---

لہ بلوغ الارب صفحہ ۳۵۴- جلد ۳-

قدیم لکھنؤ

از خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی

لکھنؤ کے قدیم وضعداروں میں ایک بیچارے مولوی مرزا سجاد حسین بھی ہیں جو ہیں تو غریب اور معلمی کرکے پیٹ پالتے ہیں۔ جوانی میں خط نسخ کے خوشنویس تھے۔ اب آنکھوں نے جواب دیدیا تو لڑکے پڑھانے لگے۔ آجکل نہ تو اس پیشے کی قدر ہے نہ ضرورت اسلیئے کہ گلی گلی اسکول موجود ہیں لیکن ان سب باتوں کے بعد بھی دیکھئے تو مولوی صاحب ایک زندہ دل آدمی ہیں۔ تہذیب کے پابند اخلاق کے بندے جہاں بیٹھ جاتے ہیں اگلی چہل پہل۔ اگلی وضعداریوں کا ماتم کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارا پرانا مکان کٹرہ خدا یار خاں میں تھا۔ یہ جگہ بہت آباد تھی۔ محلے میں چار گھر مسلمانوں کے تھے، اسی کے قریب آغا ابو صاحب کی ڈیوڑھی تھی۔ باقی سب گھر ہندوؤں کے تھے۔ ہندوؤں میں سب ریلوے میں ملازم تھے مگر سب کے سب شریف اور نیک مزاج تھے۔

ہندو مسلمانوں میں اسقدر میل اور ایسا ارتباط تھا کہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ ایکدوسرے کا ہمدرد اور معین و مددگار تھا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو سب خوشحال، ملازمت پیشہ اور دولتمند تھے۔ ہم نے اپنے محلے میں گائے کا گوشت بیچنے والے کو منع کردیا تھا کہ آواز نہ لگایا کرے۔ صرف مسلمانوں کے دروازے پر وہ پوچھ لیتا تھا اور جسکو ضرورت ہوتی تھی وہ لے لیتا تھا۔ سب مسلمان نماز پڑھتے تھے اور سب ہندو پوجا پاٹ کرتے تھے مگر کسی کو کسی سے مطلب نہ تھا۔ شام کو کام کاج سے فراغت کرکے ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور دو چار گھڑی ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔

ہمارے گھر میں دو چار مرغیاں پلی ہوئی تھیں جو دن بھر محلے میں چُگا کرتی تھیں۔ ایک دن پنڈت گوپال داس ڈھائی سیر کے قریب روٹیاں میرے پاس لائے اور کہنے لگے کہ لیجئے انھیں مرغیوں کو کھلا دیجئے گا۔ میں نے تعجب سے پوچھا "پنڈت جی! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ مرغیوں کے واسطے اتنی روٹی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی" کہنے لگے "آپ کے سمجھنے کی کوئی بات

نہیں ہے۔ آج جب ہم روٹی پکا چکے تو آپکی مرغی ہمارے چوکے میں گھس گئی اسلئے روٹی ہمارے کام کی نہیں رہی" میں نے کہا " مجھے اس واقعہ سے بہت شرمندگی ہوئی۔ کم سے کم اپنے نقصان کی قیمت تو مجھ سے لے لیجئے"۔ کہنے لگے " آپ کی بھی کیا باتیں ہیں کچھ آپنے مرغیوں کو سکھا کر تو بھیجا نہیں تھا کہ میں آپ سے روٹیوں کے دام لے لوں۔ میں تو روٹیاں بھی آپکے پاس نہ لاتا نہ آپ کو خبر کرتا مگر میرے یہاں کوئی کتا بھی نہ تھا جسے کھلا دیتا۔ میں نے خیال کیا کہ آپ کی مرغیاں کھالیں گی انکا پیٹ بھر جائیگا اور میں پھینک دونگا"۔ میں نے بہت شرمندگی کیساتھ وہ روٹیاں لے لیں۔ اور کہا " پنڈت جی مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ آپکو آج فاقہ ہوگیا"۔ کہنے لگے " میں اکیلا ہوتا تو فاقہ بھی کرلیتا یہ روٹیاں پانچ چھ آدمیوں کے واسطے پکی تھیں، ہم چار بھائی سگے ہیں وہ سب فاقے سے کیونکر رہ سکتے ہیں اب دوبارہ رسوئی کرینگے"۔ اس دن سے مجھے خیال ہوگیا اور ہمیشہ مرغیوں کو دس بجے کے بعد باہر نکالتا تھا۔

اسی محلے میں آغا ابو صاحب کے پھاٹک سے ملا ہوا تپو چور کا عالیشان مکان بہت بلند بنا ہوا تھا۔ کہنے کو تو یہ چور تھا مگر اسکی ذات سے غریب غربا کو بہت فائدہ پہنچتا تھا۔ غربا سے بہت سلوک کرتا تھا۔ اور ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا محلے کے لوگ دروازہ کھولکر سوتے تھے اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہم اپنے مکان میں سو رہے ہیں اور حولدار نے آواز دی " مولوی صاحب جاگتے ہو" ہم نے کہا " ہاں"۔ کہنے لگا " ذرا اپنا دروازہ تو بند کر لو دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں"۔ تپو کا کارخانہ بھی امیروں سے کم نہ تھا کو توال، تھانیدار سب سے دوستی تھی۔ گھر میں دو تین کہار نوکر تھے۔ دو ایک شاگرد، دو چار جان نثار دوست ان سب کا خرچ تپو کے ذمہ تھا۔

لالہ تپو رئیسوں کی پوشاک پہنتے تھے۔ ڈھاکہ کی جامدانی کا انگرکھا۔ باریک جالی کا کرتا۔ پانوں میں سچے کامدار پندرہ بیس روپیہ کی جوتی ہاتھ میں قیمتی انگوٹھیاں۔ دو ایک خدمتگار ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ گورا چٹا دبلا پتلا آدمی تھا۔ صورت شکل سے نہایت شریف معلوم ہوتا تھا۔ صرف ایک خرابی تھی کہ آٹھ دس روپے روز کی برانڈی پیتا تھا۔ کبھی ہزار دو ہزار کی چوری نہیں کی مہاجنوں سے اور تعلقداروں سے بقدر ضرورت خرچ ملجاتا تھا۔ کسی بڑے رئیس کی خبر ملی تو اسکے لئے مہینوں پہلے سے بندوبست ہوتا تھا۔ نوکر چاکر سے حال دریافت کرتا تھا۔ روپیہ رکھنے کا مقام پوچھتا تھا۔ اسکے بعد نہایت اطمینان اور استقلال سے چوری کرتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ پہلے گھر میں مسان کی مٹی ڈال دیتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ کبھی کسی چوری کے بارے میں گرفتار نہیں ہوا تھا۔

اسی محلّے میں میر بادشاہ علی نامی ایک شریف آدمی رہتے تھے۔ کمال عسرت کی حالت میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ بڑودان کی ریاست میں نیوتنی کے ایک حکیم صاحب بارہ ہزار روپیہ ماہوار کے ملازم تھے، وہ میر صاحب کے دوست تھے۔ انھیں کی ملاقات کو تشریف لے گئے۔ آدمی تھے نوجوان۔ پہلوانی کا بہت شوق تھا۔ کسرت چڑھی ہوئی تھی۔ ابھی دو دن سے حکیم صاحب کے مہمان تھے۔ کسرت کے بعد چادر لپیٹے ہوئے میدان کی ہوا کھا رہے تھے کہ شہر میں غل ہوا کہ مہاراج کھانڈے راؤ والیٔ ریاست کا کٹہا گھوڑا چھوٹ گیا ہو اور بہت سے آدمیوں کو زخمی کر چکا ہے۔ کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ اس خبرِ وحشت اثر کو سُنکر خود مہاراجہ کوٹھی سے برآمد ہوئے۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ میر صاحب نے ہمت کر کے مہاراجہ کے سامنے جا کر کہا۔ "حضور اگر حکم ہو تو اس گھوڑے کو پکڑ لاؤں"۔ مہاراجہ نے ایک اجنبی آدمی کو یہ سوال کرتے ہوئے دیکھا تو تعجب سے پوچھا "تم کون ہو؟" میر صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں اور میر بادشاہ علی نام ہے سرکار کے حکیم صاحب کا دو روز سے مہمان ہوں"۔ مہاراجہ نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ ایک پردیسی مہمان میری وجہ سے زخمی ہو یہ گھوڑا کٹہا ہے اور بہت سے آدمی زخمی ہو چکے ہیں۔ میر بادشاہ علی نے کہا حضور اسکی پروا نہ کریں۔ حضور کے اقبال سے میں ابھی گھوڑے کو قابو میں کر لونگا۔ اور کچھ چشم زخم نہ آئیگا۔" مہاراجہ نے فرمایا "اچھا تم جاؤ ہم نے سب اونچ نیچ سمجھا دی ہے"۔

میر صاحب حکم پاتے ہی گھوڑے کے سامنے میدان میں گئے۔ وہ انھیں دیکھکر کاٹنے دوڑا آپنے اپنی چادر کو جو اُوڑھے ہوئے تھے بل دیکر اسکی گردن میں ڈال دیا اور پھندا لگا کر کس دیا جیسے ہی گھوڑے نے گردن پھیر کر چکیت لگانا چاہی آپنے ایک گھونسا زور سے کلّے پر مارا کہ اسکا منہ پھر گیا اور دوسرا گھونسا دوسرے کلّے پر بھرپور لگایا۔ اب تو گھوڑے نے گردن جُھکا دی۔ تمام بازار کے لوگ میر صاحب کی تعریف کرنے لگے مہاراجہ صاحب بھی بہت خوش ہوئے اور اسی وقت پانچسو روپیہ انعام میں مرحمت فرمانیکا حکم دیا اور شرفا پروری کے لحاظ سے پچاس روپیہ ماہوار کی پنشن تاحین حیات مقرر کر دی۔ سال بھر کے بعد بہت سا روپیہ لیکر وہ اپنے گھر واپس آئے۔ اہل محلہ سے صاحب سلامت کی۔ لالہ پتھو سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ انکے لنگوٹیا یار تھے۔ کہنے لگے "اچھا میر صاحب ہم تمھارے یہاں شام کو آئیں گے"۔ میر صاحب بگڑ کر کہنے لگے "ابے شام کو کیا آئیگا میرے پاس تو تیرے ایکدن کا خرچ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ چاہتے ہو ابھی لے لو۔ بھائی ہم تو تمھارے خود احسانمند ہیں۔ تم نے افلاس میں ہمارے ساتھ بہت سے سلوک کئے ہیں"۔ اُس نے کہا "اچھا اب جاؤ شام کو ملاقات ہوگی"۔ میر صاحب گھر میں آئے تو یہ خیال لگا رہا کہ لالہ پتھو کی عادت مسخرے پن کی ہے۔ آج ضرور کچھ شرارت کریں گے۔ رات کو اس خیال سے جاگتے رہے۔ دیر سے آنکھ لگی۔

ابھی اچھی طرح سونے نہیں پائے تھے کہ لالہ تپو گھر میں آئے اور آہستہ آہستہ کھنکارنے لگے۔ عورتوں کی آنکھ کھل گئی اور انھوں نے مارے ڈر کے میر صاحب کو فوراً جگا دیا۔ یہ لالٹین لیکر ڈنڈا بغل میں دبا کر سارے گھر کو دیکھ آئے۔ لالہ تپو گھر کی چھت سے لیٹے ہوئے تھے آواز دی "میر صاحب ہم حاضر ہیں"۔ میر صاحب کہنے لگے "بھائی تم نے اچھی دل لگی نکالی۔ سارے گھر کی نیند حرام کر دی۔ اچھا اسکا بدلہ تم سے دن کو لیں گے، جب تم شراب کے نشہ میں ہوگے۔ وہ سنتا ہوا اپنے گھر چلا گیا"۔

لالہ تپو چوری کی علت میں کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ شہر کی تمام چوریوں کا پتہ کوتوال کو انکے ذریعہ سے ملجاتا تھا۔ محلہ کی کوئی چھوٹی موٹی چوری ہو لالہ تپو فوراً چور کا پتہ لگا کر اسے اپنے گھر میں لاکر جوتوں سے مارتے تھے اور سب اسباب لیکر جان چھوڑتے تھے۔ اور کہتے تھے "نالائقو تم نہیں جانتے ہو کہ اس محلہ میں تپو رہتا ہے۔ یہاں ہاتھ نہ ڈالیں"۔ تپو میں ایک بات اور بھی اچھی تھی کہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا تھا۔ اسکی دوستی اور دشمنی دونوں میں سچائی تھی۔

ایک مرتبہ رات کو نواب لطافت حسین خاں جاگیردار کے یہاں خدا جانے کس غرض سے گیا۔ انکے گھر میں کھٹکا ہوا۔ ایک قوی ہیکل ماما نے تپو کو دیکھا اور فوراً انکو چھاپ لیا۔ دبلے پتلے آدمی اکیلے ماما سے انکا زور نہ چل سکا۔ اس نے فوراً خانصاحب کو جگایا۔ خانصاحب کا مکان کٹرہ ابوتراب خاں میں تھا اور بہت سے سپاہی انکے یہاں نوکر تھے۔ خانصاحب تو اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے مگر نوکروں نے ملکر ان کو باندھ لیا اور کوتوالی لیگئے۔ جب مجسٹریٹ کے اجلاس پر مقدمہ پیش ہوا، لالہ تپو نے کہا "حضور میں نامی چور ہوں اور کبھی ایسی معمولی چوری نہیں کرتا۔ اب مدت سے یہ پیشہ بھی میں نے چھوڑ دیا ہے۔ شہر کے رئیس میری پرورش کرتے ہیں یہ تین سو روپیہ کے جاگیردار بھلا میں انکے یہاں کیوں جاتا۔ ان کے گھر میں تو خاک اڑ رہی ہے، نہ میں نے کوئی چیز انکی چرائی نہ انھوں نے میرے پاس کوئی مال مسروقہ دیکھا۔ نہ عدالت میں کوئی چیز میری چرائی ہوئی پیش کی۔ بات یہ ہے کہ میری ان سے مدت سے ملاقات ہے اکثر ان کے یہاں تاش کھیلنے آیا کرتا تھا۔ اور تنہا آتا تھا۔ آج بھی یہی معاملہ ہوا۔ جب کئی بازیاں مجھ سے ہارے تو مارے ندامت کے مجھکو گرفتار کرا دیا۔ بس یہی وجہ خصومت کی ہے"۔ حاکم نے خانصاحب سے پوچھا "آپنے کچھ مال مسروقہ اسکے پاس دیکھا تھا؟" خانصاحب نے کہا "حضور یہ اسیوقت ہمارے گھر میں آیا اور اسی وقت گرفتار ہو گیا۔ مال مسروقہ کہاں سے آتا"۔

غضب یہ ہوا کہ خود خانصاحب کے نوکروں نے کہدیا کہ اکثر تپو سرکار میں تاش کھیلنے کو آیا کرتا تھا اور رات رات بھر تاش کھیلا کرتا تھا۔ مجسٹریٹ کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ مقدمہ جعلی ہے فوراً

پتو کو رہا کر دیا۔ پتو نے چلتے وقت کہا " اچھا خانصاحب سمجھا جائیگا"

الطاف حسین خاں کو اس بات کا بہت سخت صدمہ ہوا اور اس فکر میں ہوئے کہ اگر پتو گرفتار نہ ہوا تو خدا جانے کس وقت آ کر مجھے قتل کر ڈالے۔ آدمی کا مار ڈالنا تو اسکا کھیل ہے۔ خائف اور ترساں نواب نجم الدولہ وارو غہ حیدر حسین خانصاحب کے پاس گئے۔ اور ان سے کچا چٹھا بیان کر کے کہا کہ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی اور جان کا خوف ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اُنھوں نے کچھ تامل کر کے کہا بیشک پتو کینہ پرور ضرور ہے۔ اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی کہ وہ تم سے بدلہ نہ لے گا۔ بدلہ لیگا اور ضرور لیگا لیکن معاملہ سخت ہے۔ مجسٹریٹ نے مجرم کو بے قصور پا کر چھوڑ دیا ہے۔ اب کیا ہوسکتا ہے اچھا ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ دیکھو اگر بن پڑے تو شاید کام نکل جائے۔ یہ کہکر خانصاحب کو اپنے ساتھ لئے ہوئے آغائی صاحب کے پاس پہونچے۔ ان سے سارا حال بیان کر کے امداد کے طالب ہوئے آغائی صاحب واقعہ سُنکر خاموش ہوگئے اور کوئی پہلو انکی سمجھ میں نہ آیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اس معاملے کا کوئی قانونی پہلو تو سمجھ میں نہیں آتا جبکہ ایک حاکم نے اسکو بے قصور سمجھ کر رہا کر دیا۔ اور آپکے پاس کوئی معقول ثبوت نہیں ہے تو اب کیا ہوسکتا ہے۔ مگر آپ کی حفظ آبرو کے خیال سے حتی الامکان کوشش کرنا ضروری ہے۔ کل صبح کو ہم آپ سب ملکر حمبرلین صاحب ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کرینگے۔ آدمی شریف پرور ہیں شاید کوئی بندوبست کر دیں۔

دوسرے دن صبح کو پانچ سات رئیس ملکر ڈپٹی کمشنر کی ملاقات کو گئے۔ صاحب بہادر بہت اخلاق سے ملے خانصاحب نے اپنا سب حال بیان کیا اور اپنی آبرو ریزی کا خوف بھی ظاہر کیا اور کہا کہ رات بھر سپاہیوں کے پہرے میں رہتا ہوں پھر بھی جان کا خوف لگا رہتا ہے۔ سب رئیسوں نے اسکی تائید کی۔ صاحب نے فرمایا مقدمہ میں تو کچھ جان نہیں ہے جسکی نظر ثانی کی جائے مگر ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ اگر آپ سب رئیس ملکر اس بات کی تحریری شہادت دیں کہ پتو سے ہم لوگوں کو ہمیشہ جان و مال کا خوف رہتا ہے تو بیشک ہم اسے کالے پانی انتظاماً بھجوا سکتے ہیں۔ سب نے باتفاق رائے اپنی اپنی تحریر پیش کر دی۔ صاحب نے پتو کے نام سمن جاری کر دیا۔ وہ اسی تزک اور احتشام سے عمدہ پوشاک پہن کر مع خدم و حشم کے کچہری میں حاضر ہوا۔ صاحب نے اسکو اور اسکے ایک لیر شاگرد کو انتظاماً دس دس برس کے لئے کالے پانی بھجوا دیا۔ پتو کی اولاد تو کوئی تھی نہیں صرف ایک بیوی تھی۔ بیچاری کو بہت غم ہوا اور رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ اسکی زندگی بہت تکلیف سے بسر ہوتی تھی، آخر کو مکان بھی آغا ابو صاحب کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ آغا صاحب نے اس مکان کو

کھدوا ڈالا جس کا ملبہ اب تک پڑا ہوا ہے۔

اسکے بعد چیرمین صاحب نے شہر کے تمام بدمعاشوں کو چن چنکر کالے پانی بھیجدیا۔

حضرت عباس کی درگاہ میں مرزا بتے ایک بدمعاش رہتے تھے۔ نہایت گراں ڈیل۔ پہلوان، قوی تن۔ تین چار سیر کی خوراک تھی۔ اس پر آمدنی ایک پیسہ کی نہ تھی۔ آخر روزی سے تنگ آکر بچوں کی پرورش کے واسطے اُچکاپن کرنے لگے۔ گھر سے نکلے۔ چوک میں آئے۔ جس رئیس کو بچی زردوزی کی ٹوپی پہنے دیکھا اسکے پیچھے پیچھے ہولئے۔ گلی کی موڑ پر ٹوپی پر ہاتھ مارا یہ جا اور وہ جا، لاکھ ڈھونڈو کہیں پتہ نہیں۔

چاندی بازار میں سہ پہر کو ٹہل رہے ہیں۔ کسی نے کوئی چیز مہاجن کے ہاتھ بیچی، روپیہ لیکر چلا۔ پھاٹک کے باہر ہاتھ مارا اور بان والی گلی میں ہو رہے۔ ایک تو چور دوسرے سینہ زور۔ دو چار آدمی لپٹ جائیں تو سب کو گدّے دیں اور آپ صابن کے تار کی طرح صاف نکل جائیں۔ پولیس کا کوئی سپاہی ہاتھ لگائے تو اسے بھی چپتیا دیں۔ شہر بھر میں انکی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ سب لوگ عاجز تھے۔ آخر متعدد درخواستیں گزریں تو چیرمین صاحب نے نوشیرواں کوتوال کے ذریعہ سے انکو بھی پکڑ بلوایا اجلاس پر کچھ ایسی سخت کلامی کی کہ صاحب نے کالے پانی بھجوا دیا۔

کالے پانی پہونچے ابھی دو تین ہی دن ہوئے تھے کہ اندھیرے منھ بیچا نہ پھر رہے تھے کہ ایک گھڑیھا انکی طرف دوڑتا ہوا آیا، اُنھوں نے اس پر بھی جھپٹ کی اور اپنے چادرے کو بل دیکر اسکے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ اور مارے ڈُگوں کے اسکا منھ سُجا دیا۔ آخر کھینچتے ہوئے جنرل سپرنٹنڈنٹ جیلر کے سامنے لائے جیلر صاحب دیکھتے ہی گھبرا گئے اور انکی شجاعت اور ہمت اور جوانمردی کی بہت تعریف کی۔ اس ٹاپو میں اس گھڑیھے نے غدر مچا رکھا تھا۔ تمام جیل خانہ کے لوگ اسکے ہاتھ سے تنگ تھے صاحب نے اسکی گرفتاری کیواسطے انعام کثیر مقرر کیا تھا مگر سب اسکو دیکھتے تھے اور ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ جنرل صاحب نے فرمایا کہ مرزا تمکو بڑا بھاری انعام سرکار سے ملے گا۔ مرزا نے رو کر کہا۔ خداوند مجھے انعام اکرام نہیں چاہیئے۔ میں اپنے بال بچوں سے جدا ہوں اسکا بہت قلق ہے۔ حضور یہی انعام دیں کہ مجھے بال بچوں میں جانیکی اجازت ہو جائے۔ صاحب نے فرمایا کہ تم جوانمرد آدمی ہو اور جوانمرد اپنے قول سے نہیں پھرتے اگر ہم سے وعدہ کرو کہ لکھنؤ میں اب بدمعاشی نہ کروگے تو ہم چھوڑ دینگے مرزا نے بقسم وعدہ کیا کہ اگر فاقہ سے بھی مر جاؤنگا تو آیندہ کوئی حرکت خلاف قانون نہ کرونگا۔ صاحب

نے فوراً انکو جہاز میں سوار کر کے ہندوستان میں بھجوا دیا اور مرزا یہاں آکر محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالنے لگے بدمعاشی یکقلم موقوف کردی۔ پھر تو یہ حالت تھی کہ اگر کوئی بچہ بھی انکو گالی دیتا تو اپنا خون پی کر خاموش ہو جاتے تھے،

مرزا مولوی سجاد حسین کہتے تھے کہ ہم نے ان لوگوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اٹھائیس سیر کا آٹا ہم نے کھایا ہے۔ اب ایک دو باتیں کانوں سے سنی ہوئی مگر سچی اور معتبر مثل چشم دید بھی سنا دیں:-

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے وقت میں لکھنؤ کی چہل پہل کا کیا کہنا۔ دن رات ہن برستا تھا۔ اس زمانے میں خواجہ سرا محلات کے داروغہ ہوتے تھے۔ میاں فیروز خواجہ سرا مٹی کے برتنوں کے داروغہ تھے۔ گرمی کے زمانہ میں روز کورے گھڑے بدلے جاتے تھے۔ میاں فیروز روپے کے دو گھڑے کے حساب سے تمام محلات میں گھڑے بھجوایا کرتے تھے۔ اس حساب سے آپ سمجھ لیں کہ کتنی کثیر آمدنی کے مالک تھے۔ ایک روز نواب تاج محل کی پیش کرنیوالی ماما نے کہا کہ بیگم مجھے تعجب ہے کہ آپ آٹھ آنے کو گھڑا لیتی ہیں۔ بازار میں تو عام طور پر دو دو پیسے گھڑے مارے مارے پھرتے ہیں۔ نگوڑے مٹی کے برتن کی بھی کوئی توقیر ہے۔ آپ حکم دیں تو اپنے بیٹے سے منگوا دوں۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اچھا دس گھڑے منگوا دو۔ اُس نے اُسی وقت دس گھڑے منگوا دیئے۔ اب جو میاں فیروز آئے تو بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ گھڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ماما نے دو پیسہ کو گھڑا منگوا کر دیا ہے۔ آٹھ دس دن کے بعد بیگم صاحبہ کے سلام کو حاضر ہوئے تو پینے کا پانی مانگا۔ بیگم صاحبہ کے حکم سے گلاس میں کورے گھڑے کا پانی منگوا کر دیا گیا۔ آپ جیسے ہی گلاس منہ کے پاس لیگئے گلاس کو فوراً زمین پر پٹک دیا۔ اور کہا حضور عالی خدا کے واسطے ایسے گھڑوں میں پانی نہ پیا کریں، میں حضور کا نمک پروردہ ہوں دو چار گھڑے بے قیمت کے روزانہ نذر کر سکتا ہوں۔ انمیں تو کافور کی بو آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے مردہ نہلا کر گھڑے بیچ ڈالے اور وہ حضور میں آگئے۔ خدا کے واسطے جلدی پانی پھکوا دیجئے۔ بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ محل کے سب گھڑے فوراً پھینکدیئے جائیں اور میاں فیروز سے گھڑے منگوا کر پانی پیا اور اس ماما کو نکالدیا۔

نواب قدسیہ محل کی فیاضی مشہور عام تھی۔ نواب آصف الدولہ کے بعد یہی عورت تھی جس نے دولت کو پانی کیطرح بہا کر اپنے ملازمین کو امیر کبیر بنا دیا تھا۔

گاما۔ اسی سرکار کا رنگریز تھا۔ چار دوپٹہ روز پچاس روپیہ کی رنگوائی کے ہر صبح کو کشتی میں لگا کر روشن چوکی سے محل میں لیجاتا تھا، نواب قدسیہ بیگم دن بھر میں چار دن دوپٹے اوڑھ ڈالتی تھیں

اور یہی اُترن محل کے عملے کو روزانہ تقسیم ہوجاتی تھی - اور لطف یہ تھا ہر روز چار دن دوپٹوں کا رنگ ایک دوسرے سے جدا رہتا تھا اور ایک کا رنگ دوسرے دن کے دوپٹے سے نہیں ملتا تھا - اسی نزاکت اور لطافت پر گاماکی قدر و عزت تھی - تمام رنگریز اسکے سامنے کان پکڑتے تھے اور اسکے کمال کے مقر تھے - ایکدفعہ گاما نے ایک عرضی اس مضمون کی بیگم صاحبہ کی خدمت میں خواجہ سرا کے ذریعہ سے پیش کی کہ فدوی کی لڑکی کی شادی ہونیوالی ہے لہذا اُمیدوار ہوں کہ اتنی پرورش ہوجائے کہ اس فرض سے عزت و آبرو کے ساتھ ادا ہوجاؤں - بیگم صاحبہ نے چٹھی نویس سے عرضی سُنکر خواجہ سرا سے کہا کہ گاما سے پوچھو تجھے لڑکی کی شادی میں کتنا روپیہ چاہیئے - خواجہ سرا نے گاما سے پوچھا اسنے کہا کہ میری برادری تو بہت ہے - اور تمام ہندوستان کے برادری والے جمع ہوں گے - یہی دس ہزار ملجائے تو کام بنجائے گا اور عزت بھی رہجائیگی کیونکہ تمام برادری جانتی ہے کہ گاما محلات شاہی کا رنگریز ہے -

خواجہ سرا نے آکر عرض کی حضور وہ دس ہزار روپیہ کی درخواست کرتا ہے نواب قدسیہ بیگم نے پوچھا کیا ؟ اس نے کہا دس ہزار روپیہ - کہنی لگیں گاما سٹھیا گیا ہے - تمام عمر میں ایک لڑکی کی شادی کرنے اُٹھا ہے اور دس ہزار میں ساری برادری کو رد دیٹ دیگا - اسنے تو اپنی ناک کاٹ ڈالی، اب ہماری بھی عزت کو خاک میں ملانا چاہتا ہے، دنیا تو یہی کہیگی کہ بادشاہی رنگریز اور ایسا محتاج، ایسا فقیر کہ زندگی بھر کما تا رہا اور لڑکی کی شادی فقیروں کی طرح کی - شاید اسے بادشاہی محل سے کچھ آمدنی ہوگی - اسکی سرکار کنجوس مکھی چوس ہوگی - جاؤ گاما کو ابھی ہماری ڈیوڑھی سے نکال دو اور کہنا خبردار آج سے اس دروازے پر نہ آنا -

خواجہ سرا دل میں کہنے لگا - واہ واہ رئیسوں کا بھی کیا مزاج ہوتا ہے - ذرا سی بات میں خوش ہوتے ہیں ذرا سی بات میں ناخوش ہوجاتے ہیں - اس بیچارے گاما نے کیا قصور کیا جو اپنی حیثیت کے موافق مانگا - اب اس نے سوچکر بات بنائی اور کہنے لگا کہ حضور یہ غلطی مجھ سے ہوگئی - اور طنز کی راہ سے کہا کہ وہ ایک لاکھ روپیہ مانگتا ہے - میں بھول گیا تھا - بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اچھا جاؤ ہماری جاگیر کے نام منشی خانے سے حکم بھجوا دو کہ گاما کو ایک لاکھ روپیہ فوراً دیا جائے - اسے لڑکی کی شادی کی ضرورت ہے - اس طرح گاما کو بات کی بات میں ایک لاکھ روپیہ مل گیا - اسے سب سے پہلے اسکے راستہ میں ایک بہت بڑا نالہ پڑتا تھا اسپر پل بنوایا کہ براتیوں کو آمد و رفت میں تکلیف نہو - اسکے بعد برات کے لئے ایک عالیشان عمارت بنوائی اسے خوب سجایا اور برات کو جسمیں تمام ہندوستان کے رنگریز آئے تھے دس دن تک مہمان رکھا - جہیز ایسا دیا کہ اچھے اچھے رئیسوں کو بھی نصیب نہوگا - لوگ تو اس شادی کے خرچ کا کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپیہ تخمینہ کرتے ہیں - تجربہ کار اور جہاندیدہ لوگوں نے گاما کو بہت سمجھایا کہ دیکھو حسن اتفاق سے سخی بیگم کی بدولت

نی کثیر رقم بے مشقت ہاتھ آئی ہے۔ اسے اسطرح برباد کر دینا عقلمندی نہیں ہے۔ یہ روپیہ گورنمنٹ میں جمع کرا دو تو تم کو اور تمھاری اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ اچھا خاصہ وثیقہ ملا کریگا۔ اس نے کہا کہ صاحب میری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ بیگم صاحبہ نے تو محض اپنے نام کے واسطے اتنی دولت دی ہے اور میں آپس سے غبن کرکے کچھ پس انداز کر لوں۔ لوگ اس خست کو دیکھکر مجھے بدنام کرینگے اور میری کنجوسی سے بیگم صاحبہ کی (خدا انکو ہمیشہ زندہ اور سلامت رکھے) ناموسی ہوگی۔ میں نے تو یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جو کچھ سرکار سے ملا ہے اور جو میرے پاس دو چار پیسے اس سرکار کی بدولت جمع ہوئے ہیں وہ سب اسی کام میں لگا دونگا تاکہ کہنے کو تو ہو جائے کہ بادشاہی زنگریز نے لنگوٹی میں پھاگ کھیلا۔ شادی تو ایسی ہوئی کہ لکھنؤ میں اسکا بہت دنوں زبانوں پر تذکرہ رہا لیکن اگر کسی چیز نے گاما کو آج تک دنیا میں زندہ رکھا تو وہ نہ اولاد ہے نہ بی بی ہے، نہ نواسا، نہ عزیز، نہ کنبہ، نہ شادی کا خرچ، صرف گاما کا پل ہے جس نے اسے حیات جاوید بخشی۔ لکھنؤ میں ابتک وہ محلہ گاما کے پل کے نام سے پکارا جاتا ہے اور نہایت استحکام سے آجتک موجود ہے۔ اس نیک نیتی کو دیکھئے کہ شہر کے بہت سے محلے برباد ہو کر لاٹوش روڈ۔ کنگ روڈ۔ ہیوٹ روڈ۔ کمپنی باغ۔ وکٹوریہ پارک کے نام سے مشہور ہو گئے لیکن گاما غریب کا پل دست برد دشمنان آثار سلف سے آج تک محفوظ ہے۔ بیشک گاما نیک نیت تھا اور اپنی خوش نیتی کا پھل کھا رہا ہے۔ یہ تھا قدیم لکھنؤ جسکو زمانہ آج تک یاد کرتا ہے۔

رسید کتب

فکر بلیغ۔ از مولنا شاد عظیم آبادی مرحوم۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ سیّد عبدالحمید لودی کٹرہ پٹنہ

مطلع انوار۔ از بابو مہاراج بہادر برق بی۔ اے۔ دہلوی۔ قیمت ۱۰؍ ملنے کا پتہ۔ منیجر امپیریل بک ڈپو۔ چاندنی چوک دہلی

بسمارک[1]

از جناب چودھری محمد علی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (ایبٹ آباد)

بسمارک کی شخصیت اور اسکی بیشمار خدمات ایسے تاریخی واقعات ہیں جنکی صحت کو کوئی آدمی خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو۔ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لہذا مجھ پر یہ الزام رکھنا کہ میں نے اُسکی قدر نہیں کی قطعاً نا درست ہے حقیقت میں میں اُسکی پرستش کرتا تھا اور میرے دل میں اُسکی بڑی عزت تھی۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ جرمنی کے نوجوان اسکو اپنا ہیرو سمجھکر پوجتے تھے۔ اسنے جرمنی کی سلطنت کی بنیاد رکھی اور اُسکو نہایت مضبوط و مستحکم کیا۔ ہم سب اُسکو دنیا کا سب سے بڑا سیاسی مدبر سمجھتے تھے۔ اور اس بات پر فخر کرتے تھے۔ کہ وہ جرمنی کا باشندہ ہے۔ بسمارک میرے دل کے مندر کا بت تھا۔ جسکو میں پوجا کرتا تھا، لیکن بادشاہ بھی آخر کار انسان ہوتے ہیں۔ ان میں عام انسانوں کی طرح کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ بسمارک نے میری مخالفت کرکے مجھ کو ناراض کر دیا تھا تاہم میرے دل میں اسکی وقعت و عزت اسی طرح رہی جس طرح کہ پہلے تھی۔

جن دنوں میں محض شاہزادہ تھا تو دل میں کہا کرتا تھا۔ کہ اگر میری تخت نشینی کے وقت تک بسمارک زندہ رہا تو میری زندگی بڑے آرام سے گذریگی۔ اسنے اپنی زبردست شخصیت کی وجہ سے حکومت کا ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ اسکی جگہ کوئی اور شخص حکومت کی باگ نہیں سنبھال سکتا تھا۔ یہ صرف اسکی ذاتی طاقت کی برکت تھی۔ کہ جرمنی کی سلطنت معرض وجود میں آئی۔ ورنہ اس سے پہلے جرمنی مختلف خود مختار صوبوں میں منقسم تھا۔ کوئی شخص اپنے ملک کی اتنی خدمت نہیں کرسکتا جتنی کہ بسمارک نے کی ہے۔

ہماری باہمی مخالفت صرف دو امور پر مبنی تھی۔ اول میں مزدور پیشہ جماعت کے واسطے ایک قانون مرتب کرنا چاہتا تھا، جسکو بسمارک ناپسند کرتا تھا۔ دوئم۔ میں اپنے مقبوضات کی

[1] یہ مضمون سابق قیصر جرمنی ولیم دوئم کی سوانح عمری سے ماخوذ ہے جسمیں قیصر سابق نے بسمارک کے متعلق اپنے خیالات درج کئے ہیں جن سے ان دونوں کے باہمی تعلقات کا پتہ لگتا ہے۔ چونکہ قیصر کے تخت نشین ہونے سے چند سال کے بعد ہی بسمارک اپنے عہدے سے مستعفی ہوگیا تھا۔ اس واسطے تمام دنیا کو حیرت تھی کہ انکی باہمی ناچاقی کی کیا وجہ ہوئی قیصر نے اس کشمکش کا دوسرا رخ دکھایا ہے۔

حفاظت کے واسطے ایک طاقتور بحری بیڑا بنانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس تجویز کی صریحاً مخالفت کرتا تھا۔ آخر کار ہمارا اختلاف رائے اس حد تک پہنچ گیا کہ اسکو حکومت سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ لیکن ہمارے ذاتی تعلقات بدستور قائم رہے۔ ہم صرف اصولاً ایک دوسرے کی تجاویز کے مخالف تھے۔ ورنہ ہمارے درمیان کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی۔ کیونکہ ہم دونوں اپنے اپنے خیال کے مطابق جرمنی کو طاقتور بنانے میں کوشاں رہتے تھے۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں پرنس بسمارک نے مجھے دفتر امور خارجہ میں بلایا۔ ان دنوں یہ دفتر اسکے لڑکے کونٹ ہربرٹ بسمارک کے ماتحت تھا۔ اسنے میرا تمام افسروں اور اہلکاروں سے تعارف کرایا اور انکے خصائل اور عادات فرداً فرداً بیان کئے۔ میرے لئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا تاکہ میں دفتر امور خارجہ کے کاموں سے واقفیت حاصل کروں، سب سے پہلے آسٹریا اور جرمنی کے باہمی عہد نامے کی ابتدائی تاریخ اور متعلقہ واقعات کے کاغذات میری سپرد کئے گئے۔ تاکہ میں گزشتہ واقعات سے آشنا ہو جاؤں۔ دفتر امور خارجہ میں آتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ حکومت کی خارجہ پالیسی کی باگ صرف پرنس بسمارک کے ہاتھ میں ہے۔ تمام اہلکار بسمارک کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ کوئی عہدہ دار اپنی ذمہ داری پر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ وہ معمولی ملازم کی طرح بسمارک کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ اس دفتر کے افسروں کی ذاتی رائے کو قطعاً نظر انداز کیا جاتا تھا۔ حالانکہ مولٹکے کے جنرل اسٹاف (فوجی دفتر) کی حالت اسکے بالکل برعکس تھی۔ وہاں نئے افسروں کو باقاعدہ یہ سکھلایا جاتا تھا کہ وہ اپنی رائے بڑی خوشی سے ظاہر کریں۔ اور اس خیال کو عملی جامہ پہنائیں۔ گویا وہاں انکی ذہانت اور قابلیت کی داد دی جاتی تھی۔ اور ہر ممکن طریقے سے انکی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ جس سے وہ کچھ دنوں کے بعد تجربہ کار افسر بنجاتے تھے۔ مگر دفتر خارجہ کا حال دگرگوں تھا۔ وہاں جو احکام چانسلر (بسمارک) سے موصول ہوتے تھے انپر اندھا دھند عملدرآمد کیا جاتا تھا، بسمارک کی شخصیت کسی کھیت میں ایک سنگ خارا کی چٹان کے مانند تھی۔ اگر اس چٹان کو کھیت سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیا جائے، تو اسکے نیچے سے سوائے حشرات الارض کے اور کچھ برآمد نہ ہوگا۔

پرنس بسمارک پہلے ہی سے مجھپر اعتماد رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ بعض اہم معاملات میں مجھ سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ میں بھی اس سے گاہے گاہے نو آبادیات کے مسئلے پر گفتگو کیا کرتا تھا لیکن وہ اسکو چنداں وقعت نہیں دیتا تھا کیونکہ اسکی تمام توجہ یورپ کی سیاسی چالوں میں لگی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ میں نے

اس سے کہا کہ ہمارے لوگوں نے نوآبادیات میں لاکھوں روپیہ خرچ کرکے صنعتی کارخانے قائم کئے ہیں۔ جن سے ان علاقوں میں اقتصادی ترقی ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم ان کو دشمنوں کے حملے سے بچانے کے لئے ایک زبردست بحری بیڑا بنائیں۔ لیکن اسنے اسپر کوئی توجہ نہیں کی، وہ صرف بری طاقت کو مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ مگر میں شروع سے ہی یہ محسوس کرتا تھا کہ جنگی جہاز نہ ہونے کی وجہ سے ہم سمندر میں برطانیہ کے تابع ہیں۔ اس واسطے ہماری بیرونی تجارت اور نوآبادیات سے آمدورفت کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال تھا، کیونکہ برطانیہ ہر وقت اپنے بیڑے کے زور پر ہماری تجارت کو روک سکتا تھا۔

وہ سیاسی معاملات میں کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ کئی دفعہ میرے دادا (قیصر ولیم اوّل) کے مشورے کو بھی نظر انداز کرچکا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ وان البیڈل چیف آف کیبنیٹ قیصر مذکور سے ملنے کے لئے گیا۔ اور اُسے سخت متفکر پایا۔ وزیر مذکور کے دریافت کرنے پر اُسنے جواب دیا کہ بسمارک میری رائے کی مطلق قدر نہیں کرتا۔ بلکہ جو کچھ اُسکی مرضی ہوتی ہے وہی کرتا ہے۔ جب وزیر نے اس سے کہا کہ اگر وہ اتنا خود سر ہے۔ کہ آپ کی بات کو نہیں مانتا تو پھر آپ اُسکو علیحدہ کیوں نہیں کر دیتے تو قیصر نے کہا۔ کہ مجھے کئی دفعہ ایسا خیال ہوا ہے، مگر سچ بات یہ ہے کہ اُسکی موجودگی ملک کے واسطے اشد ضروری ہے۔ کیونکہ سوائے اُسکے یورپ کی سیاسی پیچیدگیوں کو کوئی حل نہیں کرسکتا۔ اُسی کی بدولت جرمنی کی دھاک تمام یورپ پر بیٹھی ہوئی ہے۔

بسمارک میری صاف گوئی اور راستبازی سے بہت خوش تھا۔ اور مجھ پر کلّی اعتماد رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ ہمارے تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میرے والدین مجھ سے کشیدہ خاطر ہوگئے۔ کیونکہ وہ بسمارک کو ناپسند کرتے تھے۔ اور اُنھیں ہر وقت اس بات کا احتمال رہتا تھا کہ میں بسمارک کی صحبت سے متاثر ہو کر کہیں شاہی خاندان کے خلاف نہ ہو جاؤں۔ میں نے اُسکی خاطر سینکڑوں دفعہ اپنے والدین کے طعنے سُنے۔ اور طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھائیں جنکو میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔ کیونکہ بسمارک کو میں اپنا سیاسی گرو تصور کرتا تھا۔ اور اُسکے خیالات کی قدر کرتا تھا۔

جب زار نکولس دوئم (جو ۱۹۱۶ء کے روسی انقلاب میں قتل ہوا) سن بلوغت کو پہنچا تو مجھے بسمارک کے ایماء سے روس بھیجا گیا۔ تاکہ میں زار روس کو "آرڈر آف بلیک ایگل" کا خطاب قیصر کی طرف سے پہنچاؤں۔ اور اُسکو مبارکباد دوں۔ بسمارک اور قیصر بڑی دیر تک مجھے جرمنی اور روس کے باہمی تعلقات کے متعلق لیکچر دیتے رہے، جب میں برلن سے روانہ ہونے لگا۔ تو بسمارک نے مجھے یہ نصیحت

کی کہ مشرق میں جو آدمی اپنی قمیص کو پتلون سے باہر رکھتا ہے شریف سمجھا جاتا ہے اور جو قمیص کو پتلون کے اندر رکھتا ہے اور اپنے سینہ کو تمغوں سے آراستہ کرتا ہے وہ ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے اور اُسے "پھرے دار کتا" کہا جاتا ہے۔ مَیں سینٹ پیٹرزبرگ سے قیصر اور بسمارک کو باقاعدہ اطلاعات بھیجتا رہا ان دنوں رُوس میں جرمنی کے خلاف ایک عام تحریک پھیل رہی تھی جسکا اثر ان حکومتوں کے سیاسی تعلقات پر پڑتا تھا، مَیں نے بسمارک کو صاف صاف لکھدیا۔ کہ یہاں ہمارے ملک کے خلاف ہمارے دشمن زہر اُگل رہے ہیں۔ اور رُوسی افسروں کو ہمارے خلاف اُبھار رہے ہیں جب مَیں واپس آیا تو بسمارک کو مَیں نے اپنے سفر کے تمام حالات بالتفصیل سُنائے۔ آپنے میرے مشاہدات کی بڑی داد دی۔

اگست [illegible]ء میں مجھے دوبارہ زار کے پاس بھیجا گیا۔ تاکہ اُسکے ساتھ ترکی اور بحیرۂ روم کے متعلق کوئی فیصلہ کیا جائے۔ چونکہ بسمارک ترکی کا سخت دشمن تھا اور اسے یورپ کے نقشہ سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ اِس لئے اُس نے مجھے ہدایت کی۔ کہ مَیں ترکی اور درۂ دانیال کو زار کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کردں۔ یعنی اگر وہ اِس مُلک پر قبضہ کرنا چاہے تو جرمنی کو اِس میں کچھ اعتراض نہوگا۔ زار میرے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور مجھے روسی فوجوں کی چھوٹی لڑائی دکھانے کے لئے لیگیا اُسکی فوجیں بالکل تیار نظر آتی تھیں۔ اور اُنکے پاس ہر قسم کا سازوسامان موجود تھا۔ گویا وہ ہر وقت میدانِ جنگ میں جانے کے لئے تیار تھیں۔ جب مَیں نے زار سے ترکی کے متعلق گفتگو کی۔ تو اسنے مجھ سے کہا: "اگر مَیں قسطنطنیہ کو لینا چاہوں۔ تو جس وقت میری خواہش ہوگی مَیں اُس پر قبضہ کرلونگا۔ اور اِس وقت مجھے بسمارک سے اجازت لینے کی ضرورت نہ پڑیگی"۔ میں مایوس ہوکر واپس چلا آیا۔ مَیں نے رُوس میں یہ محسوس کرلیا تھا۔ کہ رُوسی افسروں کا رویّہ پہلے سے بھی زیادہ معاندانہ ہے۔ کیونکہ اب وہ مجھ سے گریز کرتے تھے۔ اور میرے پاس سے آنکھ بچا کر چلے جاتے تھے۔ اُنکی ہر بات میں تکبّر اور سرد مہری پائی جاتی تھی۔ اِن میں سے صرف چند پُرانے جرنیل تھے، جو محض قیصرِ اوّل کی ذاتی واقفیت کی وجہ سے جرمنی کی قدر کرتے تھے۔ اِن میں ایک جرنیل نے دَوران گفتگو میں ایک ایسی پیشینگوئی کی۔ جو بعد میں درست ثابت ہوئی۔ اُس نے کہا تھا کہ "رُوس جرمنی کی سیاسی چالوں سے برافروختہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ اُسکی وجہ سے برلن کانگریس میں رُوس کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ بسمارک نے بڑی کوشش کرکے اسکے خلاف فیصلہ کروایا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جرمنی اور رُوس کے دوستانہ تعلقات قریباً منقطع ہوگئے

ب رُوسی گورنمنٹ کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ ۱۸۷۸ء کی لڑائی (جنگ مابین روس اور ترکی) کا نتیجہ محض جرمنی کی شرارت سے اسکے خلاف ہوا۔ اِس لئے وہ اب انتقام لینے پر آمادہ ہے۔ چنانچہ اب اُسنے فرانس سے اتحاد کرلیا ہے۔ جو جرمنی کا قدیمی دشمن ہے۔ اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روس کا شاہی خاندان تباہ ہو جائیگا اور یہاں بھی فرانس کی طرح جمہوریت کا دَور دَورہ ہوگا"

فرانسیسی افسروں کے میل جول سے رُوسیوں کے دلوں میں ہمارے خلاف سخت نفرت پھیل گئی تھی، کیونکہ اُنکو یقین دلایا گیا تھا، کہ جرمنی، روس کی ترقی میں سدِّ راہ ہے۔ معلوم نہیں بسمارک کے دل میں کیا خیال تھا کہ وہ ترکی کو اس وقت روس کے حوالے نہ کرسکا۔ شاید وہ اس چال سے برطانیہ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اور بعد ازاں کسی اور طریقے سے روس کی اشک شوئی کرنے کی فکر میں تھا۔ جس سے روس کو یقین دلا سکے۔ کہ اسے محض جرمنی کی مدد سے ہی ایشیائی مقبوضات اور ترکی پر قبضہ کرنے میں آسانی ہوئی، لیکن بعد میں کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے کہ رُوس اور جرمنی کی مخالفت دن بدن بڑھتی چلی گئی۔

۱۸۹۰ء میں مجھے پھر زار روس سے ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا۔ اُسنے مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے بسمارک کو کیوں علیحدہ کردیا۔ میں نے اُسے تمام حال کہ سنایا۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ جب میں سب کہہ چکا تو اُسنے بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملاکر کہا "میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ وہ آخر آپ کا ملازم ہی تھا۔ جونہی اُسنے آپکے احکام کی خلاف ورزی کی آپ نے اُسے علیحدہ کردیا میں تو اُسے ہمیشہ ناپسند کرتا تھا۔ جب کبھی وہ مجھ سے سیاسی معاملات پر گفتگو کرتا تھا، تو میں اُسکی باتوں پر قطعاً اعتبار نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا، کہ وہ مجھے کبھی نہ کبھی دھوکا دیگا۔ مجھے امید ہے کہ اب آپکے اور ہمارے تعلقات زیادہ مضبوط ہو جائینگے۔ مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ اور آپ بھی مجھ پر اعتبار رکھیں۔ سچ پوچھئے۔ تو جرمنی اور رُوس کی باہمی مخالفت کا بانی مبانی بسمارک ہی تھا" زار مرتے دم تک اپنے وعدے پر قائم رہا۔ مگر روسی گورنمنٹ کی پالیسی میں اُسکے ذاتی خیالات کو بہت کم دخل تھا۔ پھر بھی اسکے عہد میں جرمنی رُوسی حملے سے محفوظ رہا۔ مگر اسکے لڑکے (نکولس) کے زمانۂ حکومت میں گزشتہ حالات بالکل متغیر ہو گئے کیونکہ وہ اپنی طبعی کمزوری اور توہم پرستی کی وجہ سے وزراء کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی بن گیا تھا

اگرچہ رُوس برلن کانگریس کی وجہ سے جرمنی سے سخت ناراض تھا اور فرانس سے سازباز کر رہا تھا لیکن محض بسمارک کی شخصیت کی وجہ سے جنگ کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔ برلن کانگریس ۱۸۷۸ء میں

منعقد ہوئی تھی مگر اسکے بعد وہ بارہ سال تک چانسلر کے عہدے پر متمکن رہا۔ اور اپنی غیر معمولی سیاسی قابلیت کی بدولت یورپ کو جنگ وجدل سے بچاتا رہا۔ ورنہ ان دنوں میں تمام ملک جنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسکے دشمن بھی باتفاق رائے یہ کہا کرتے تھے۔ کہ بسمارک جیسا صحیح دماغ رکھنے والا تمام یورپ میں کوئی سیاست داں نہیں۔ کیونکہ وہ مصائب کے وقت بھی اپنی سلیم عقل سے کام لیتا تھا۔ وہ غصہ میں بھر کر بھی کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا جس سے اسکو بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔ الغرض وہ اپنی شخصیت کے زور پر یورپ کے تمام سیاست دانوں کو انگلیوں پر نچاتا تھا۔

شہنشاہ (ولیم اول) نے مرنے سے چند گھنٹے پہلے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اور بسمارک کی موجودگی میں مجھے یہ وصیت کی۔ کہ میں روس کے ساتھ اتحاد بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کروں۔ چنانچہ اسکی وفات کے بعد بسمارک نے مجھے سینٹ پیٹرز برگ بھیجا۔ اور میرا پروگرام خود مرتب کیا۔ جب ملکہ معظمہ وکٹوریا کو (جو میری نانی تھیں) میرے پروگرام کا علم ہوا۔ تو انھوں نے مجھے لکھا۔ کہ مجھے پہلے برطانیہ آنا چاہیئے۔ کیونکہ نانی ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اسکا حق سب سے افضل ہے۔ میں نے ملکہ کا خط بسمارک کو دکھلایا۔ وہ پڑھکر سخت ناراض ہوا۔ اور کہا کہ برطانیہ ہمارے خانگی معاملات میں کیوں مداخلت کرتا ہے۔ پھر مجھ سے کہا۔ کہ مجھے اپنے ملکی معاملات میں اپنے رشتہ داروں کی پند و نصائح پر کان نہیں دھرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے شائستہ الفاظ میں ملکہ کی دعوت کو مسترد کر دیا۔

میں ۱۸۸۹ء میں سلطنت ترکی کی سیر و سیاحت کے لئے گیا۔ اور بسمارک کے دریافت کرنے پر جب میں نے ترکوں کی عادات و خصائل اور انکے امرا و اکابر کا اس سے تذکرہ کیا تو مجھے یہ دیکھکر نہایت افسوس ہوا کہ بسمارک ترکی سے سخت نفرت کرتا ہے وہ اسکے وزراء کی قابلیت کا مطلقاً معترف نہیں تھا، میں نے بڑی کوشش کی۔ کہ اسکو ترکوں سے ہمدردی پیدا ہو جائے، مگر میری کوشش رائیگاں ثابت ہوئی۔ مگر میں خود ترکوں کو پسند کرتا تھا۔ اور مجھے انکے سیاسی ارادوں سے خاص طور پر ہمدردی تھی، لیکن بسمارک ان خیالات کو ناپسند کرتا تھا، اور مجھے فریڈرک اعظم کے نقش قدم پر چلنے سے منع کرتا رہتا تھا۔

جب میں تخت نشین ہوا تو میں نے کوشش کی کہ تمام وزراء کو اپنے اپنے دفتر میں مکمل اختیار دیدوں۔ تاکہ وہ بلاخوف و خطر اپنی اپنی ذمہ داری پر سلطنت کے کاروبار کو انجام دے سکیں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ جب تک بسمارک اپنے عہدے پر قائم ہے کوئی وزیر آزادی سے کام نہیں کر سکتا کیونکہ

تمام وزیروں پر اسکا اتنا رعب و دبدبہ تھا کہ وہ بغیر اُسکے حکم کے کوئی کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے میں جو اصلاحات نافذ کرنا چاہتا تھا۔ تمام وزیر اُسکی مخالفت کرتے تھے۔ کیونکہ بسمارک اُن اصلاحات کے خلاف تھا۔ اِسمیں کوئی شک نہیں کہ بسمارک نے جرمنی کو ایک معمولی ملک سے ترقی دیکر ایک زبردست طاقتور سلطنت بنا دیا تھا، جسکا تمام یورپ پر رعب چھایا ہُوا تھا، اور اُسکی خود مختارانہ پالیسی سے کوئی شخص ناراض نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جرمنی کے ہر ایک فرد بشر کو یقین تھا کہ وہ جو کچھ کریگا اُس میں تمام قوم کی بہتری ہوگی۔ لیکن میری جان سخت مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی کیونکہ میں جب کبھی کوئی تجویز پیش کرتا تھا تو مجھے ہر طرف سے یہ جواب ملتا تھا کہ چونکہ بسمارک اِسکے خلاف ہے۔ اِس واسطے اِسپر عملدرآمد نہیں کیا جا سکتا۔ تمام وزیر اپنے آپ کو میرا ماتحت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی پرانی عادت کی وجہ سے بسمارک کو اپنا آقا تسلیم کرتے تھے۔

میں بسمارک کے عہد کا ایک واقعہ سُناتا ہوں، جس سے تمام وزراء کے رویّہ کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ حکومت نے سوشلزم کو تباہ کرنے کے متعلق ایک قانون بنانے کی تجویز کی۔ میں نے اسمیں ایک مختصر سی ترمیم پیش کی لیکن بسمارک نے اُسکو مسترد کر دیا جس سے ایوانِ وزارت میں کھلبلی مچ گئی۔ بعد ازاں میں نے شاہی کونسل کو طلب کیا۔ اجلاس کے روز بسمارک نے میرے ایڈیکانگ سے کہا۔ کہ قیصر کو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اُسکے پاس تلوار بھی ہے۔ اور فوج بھی۔ اگر سوشلسٹ بغاوت کرنے کی تیاری کرینگے تو اسے اپنی فوج لیکر انپر حملہ بھی کرنا پڑیگا۔ بریں وجہ قیصر کو چاہئے کہ اس قانون میں کوئی ایسی ترمیم پیش نہ کرے جس سے قانون کمزور ہو جائے، اور اسے امن قائم رکھنے کے لئے قطعی اختیار دیدے۔

جب شاہی کونسل کا اجلاس ہُوا، تو وہاں بھی بسمارک اپنی ضد پر قائم رہا۔ بالآخر جب ووٹ لئے گئے تو تمام وزیروں نے میرے خلاف ووٹ دئے۔ میں اُنکے طرزِ عمل سے سخت برافروختہ ہوا لیکن جب اُن سے دریافت کیا گیا تو اُنھوں نے صاف کہدیا کہ وہ کسی صورت میں بھی بسمارک کے خلاف رائے دینے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

جب کبھی میں مزدور پیشہ جماعت کے فوائد کے واسطے کوئی اصلاح پیش کرتا۔ تو وہ عام طور پر اُسکی مخالفت کرتا لیکن میں نے اُسکی مخالفت کی چنداں پرواہ نہ کی۔ مزید براں میں نے اپنے ملک میں بین الاقوامی سوشل کانفرنس کے اجلاس کی اجازت دیدی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح ان غریب لوگوں کو فاقہ کشی اور مصائب سے بچایا جائے۔ چنانچہ میں نے انکی خاطر سینکڑوں سیونگ بنک اور

آپریٹو اسٹور کھلوائے - اور اُنکی یومیہ مزدوری بڑھا دی - بسمارک کہتا تھا کہ اگر سوشلسٹ جماعت
یں فساد برپا کرنے کی تحریک کرے - تو اس صورت میں گولہ باری کرکے اُسکو کچل دیا جائے
اُسکے ساتھ کسی قسم کی نرمی نہ برتی جائے - مگر میں کہتا تھا کہ میں اپنی حکومت کے اولیں سالوں
اپنی رعایا کا خون بہانا نہیں چاہتا - لیکن وہ مُصر تھا - کہ اگر اُسے ان معاملات میں کلی اختیار
ئے جائیں - تو وہ ہر طرح کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہوگا - آخر کار میں نے تنگ آکر اُس سے
یا کہ ایک دن مجھے خدا کو بھی جواب دینا ہے - اور میں اپنے ضمیر کا خون نہیں کرسکتا کیونکہ مجھے معلوم
- کہ مزدور پیشہ جماعت کی حالت بہت نازک ہے، اور میں اُنکی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہوں -
میری اور چانسلر (بسمارک) کی کشمکش محض اس جماعت کی خاطر ہوئی تھی - جسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ بسمارک
بہت سے سرکاری افسر میرے مخالف ہو گئے - بسمارک کہا کرتا تھا - کہ اشتراکی سیاست نرم
ویزا اور کمزور قوانین سے قائم نہیں ہوسکتی - بلکہ ڈنڈے کے زور سے قائم ہوسکتی ہے - وہ محبت عامہ
اصول کو لغو سمجھتا تھا - اور اسکا مذاق اُڑاتا تھا -

جو کچھ میں اوپر لکھ آیا ہوں - اُس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بسمارک اس جماعت کا دشمن تھا - بلکہ
اُسکی طاقت کو محسوس کرتا تھا اور اُسکی حالت کو بہتر بنانا چاہتا تھا - لیکن وہ مختلف طریقے
ر کرتا تھا جنکو میں پسند نہیں کرتا تھا، کیونکہ مجھے یقین تھا - کہ ان سے اس جماعت کی غربت جلدی
نہیں ہوسکتی - وہ اس مسئلہ کو بحیثیت ایک سرکاری ملازم دیکھتا تھا - وہ کہا کرتا تھا - کہ گورنمنٹ
چاہئے کہ ہر ممکن طریقے سے اس جماعت کے حقوق کی نگہداشت کرے - مگر وہ سرکاری معاملا
ں اُسکی اعانت کو ہرگز پسند نہیں کرتا تھا - اور سلطنت کے انتظام میں اُسکی مداخلت اُسکو
ار تھی - وہ باغیانہ تحریک کو سختی سے دبانا چاہتا تھا - الغرض ایک طرف وہ حکومت کا فرض سمجھتا
ا کہ ان لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے - اور اُنکے جائز حقوق کو پامال نکرے - اور دوسری
ف وہ تلوار کے زور سے اُن لوگوں کی مفسدانہ تحریک کو دبانا چاہتا تھا - مگر میں اپنی رعایا سے اتنی
ختی برتنا پسند نہ کرتا تھا - مجھے اِن لوگوں کی خاطر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - اور اپنے دوستوں اور
رگوں کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہُوا - مگر میں نے ہمت نہ ہاری - اور اپنے فرائض منصبی برابر ادا کرتا رہا -
سمارک کسی صورت میں مزدور پیشہ جماعت کو مالی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا - بلکہ وہ ہمیشہ یہ کوشش
تا تھا کہ اُنکو بے روزگاری سے بچایا جائے -

۱۸۸۰ء کا واقعہ ہے کہ ایک روز میں نے یہ سُنا کہ وللن کمپنی کی حالت بہت نازک ہے اُسکا کاروبار بند

ہو رہا تھا۔ کیونکہ جرمنی کی تجارتی کمپنیاں دوسرے ملکوں سے اپنے واسطے جہاز تعمیر کراتی تھیں۔ اس کارخانہ کے مزدوروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اور مصیبت کے دن انکے سامنے آرہے تھے۔ اگر انھیں کسی تجارتی جہاز کی تعمیر کا حکم مل جائے تو انکی مصیبت دُور ہو سکتی تھی میں ہمیشہ یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ ہمارے جہاز برطانیہ سے بن کر آتے ہیں جسکو ہمیں کروڑوں روپیہ دینا پڑتا تھا۔ میں اپنے ملک کو اس غلامی سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ انہی دنوں میں میں نے یہ سُنا۔ کہ نارتھ جرمن لائڈ کمپنی مسافروں کے واسطے ایک بڑا جہاز بنوانا چاہتی تھی لیکن اسنے ولکن کے کارخانے کو ٹھیکہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور آسنے یہ جواب دیا تھا۔ کہ اس سے بہتر جہاز برطانیہ میں تعمیر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ برطانوی کاریگر جرمنی والوں سے زیادہ کاریگر ہوتے ہیں۔ میں یہ قصہ سنکر آگ بگولا ہو گیا۔ اور فوراً بسمارک کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ میری کہانی سُنتے ہی وہ تلملا اُٹھا۔ اُسکی آنکھیں غصہ کے مارے بجلی کی طرح چمکنے لگیں۔ اور اُسنے زور سے میز پر ہاتھ مار کر کہا "اچھا تو مطلب یہ نکلا کہ یہ لوگ برطانیہ کے کارخانوں کو جرمنی کے کارخانوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اور ہمارے ملک کا ایک کارخانہ محض اس لئے خراب ہو رہا ہے کہ اُسکے پاس کام نہیں۔ میں جرمنی کے لوگوں کو بھوکے مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ اور میں ہرگز کسی آدمی کو اجازت نہیں دُونگا۔ کہ وہ جرمنی کے کارخانوں کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں اپنے جہاز تعمیر کرائے"۔ چنانچہ اسنے اسی وقت ایک افسر کو بلوایا۔ اور اُسکو حکم دیا۔ کہ نارتھ لائڈ کمپنی کو فوراً اطلاع دیجائے کہ وہ نیا جہاز ولکن کمپنی سے بنوائے۔ بعد ازاں اُس نے میرا بہت شکریہ ادا کیا۔ اور کہا "آپ نے اس معاملہ میں اپنے ملک کی بڑی خدمت کی ہے۔ آئندہ ہمارے جہاز اسی جگہ تعمیر ہوا کرینگے۔ آپ ولکن کے کارخانہ کو یقین دلائیں کہ بسمارک اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ آئندہ تمام جہاز اسی کارخانے میں بنوائے جائینگے"۔ جب اس کارخانے کے مزدوروں نے یہ خوشخبری سُنی۔ تو مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے۔ آخر اس حکم کا یہ نتیجہ ہوا کہ جرمنی کے جہاز اپنے ہی ملک میں بننے لگے۔

رسید کتب

نور اللغات جلد نمبر ۳۔ مؤلفہ مولوی نور الحسن صاحب نیّر وکیل لکھنؤ۔ **قیمت** عـہ

رام چرچا۔ از منشی پریم چند بی۔ اے۔ (لالہ لاجپت رائے اینڈ سنز بک سیلرز۔ لاہور)

تذکرۃ الخواتین۔ از مولانا عبد الباری آسی ⎫
دیوانِ درد۔ از خواجہ میر درد ⎭ مطبوعہ منشی نول کشور پریس لکھنؤ

منشی نند لعل گویا

از مسٹر ہری کرشن سی-ٹی-آر-اے

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قائم ہو جانے کے بعد عربی و فارسی زبانوں کا رواج پانا ایک قدرتی بات تھی چونکہ فارسی درباری زبان ہونے کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام تھی اس لئے اسمیں دادِ سخنوری دینے کا شوق ہر موزوں طبع کے دل میں جوش زن رہتا تھا۔ اگرچہ مروجہ تذکرہ جات کے گلدستے عموماً اسلامی پھولوں سے مزین ہیں لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ ہندو شعراء کسی طرح اپنے ہمعصر اسلامی شعراء سے کم نہ تھے تذکرہ جات میں انکا نام نہ آنا اسلامی مصنفین کی دریا دلی کا ثبوت ہے۔ اور یہ حقیقت اُس وقت اور بھی زیادہ روشن ہو جاتی ہے جب ہم آبحیات جیسے تذکروں کو پنڈت دیا شنکر نسیم جیسے مسلم الثبوت شاعر کے ذکرِ خیر سے خالی پاتے ہیں۔ جنکی بابت یہ مشہور ہے کہ آتش کو نسیم اور صبا نے چمکایا ہے۔

منشی نند لعل صاحب گویا کا تعلق شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار سے تھا۔ آپ قوم سے کھتری اور پنجاب کے رہنے والے تھے۔ آپ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ادیبِ کامل اور عالمِ فاضل تھے۔ آپ کے کمالاتِ ظاہری و باطنی سے متاثر ہو کر عالمگیر نے انکو شاہزادہ معظم کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ عالمگیر شاہزادوں کے اتالیقوں میں کن کن خوبیوں کا ہونا لازمی سمجھتا تھا۔ ذیل کے واقعہ سے بخوبی معلوم ہو جائیگا۔

مُلا جیونؔ عالمگیر کے اُستاد تھے۔ جب عالمگیر کے تخت نشین ہونے کی خبر اُن تک پہنچی تو وہ تہنیت دینے کی غرض سے اپنے عزیز شاگرد کے پاس گئے تاکہ شاہی فیاضیوں سے بہرہ اندوز ہوں۔ ملاقات کے وقت مُلا صاحب نے فرمایا کہ حضور کو تخت پر جلوہ آرا دیکھکر جو مسرت مجھکو حاصل ہوئی ہے اُسکے اظہار میں قوتِ گویائی قاصر ہے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا کہ جناب کے اس محبت آمیز پیغامِ مسرت کا تہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ لیکن میری موجودہ حالت جناب کے فیضِ تعلیم کی اس قدر ممنون نہیں ہے جس قدر عنایاتِ ایزدی کی۔ جناب نے مجھکو محض عربی صرف و نحو و ادب اور کلام پاک و فقہ و تفاسیر و احادیث کی تعلیم دی جو مسجد کے

مُلّاؤں کے لئے تو نہایت ضروری ہے لیکن ایک مُغلیہ تختِ شاہی کے وارث کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے دربار میں مختلف ممالک کے سفیر رہتے ہیں کیا آپ نے مجھکو اُنکی زبانیں سکھائیں، تاکہ میں اُنکے ممالک کی سیر و سیاحت سے اپنے تجربہ و معلومات میں معتدبہ اضافہ کرسکتا۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ سلطنتِ مغلیہ کے طول و عرض میں مختلف زبانوں میں گفتگو کرنے والی قومیں آباد ہیں۔ کیا آپ نے مجھکو اُن کی زبانوں میں گفتگو کرنے کی تعلیم دی جس سے میں بہ تبدیلِ لباس اپنی رعایا کی حقیقی تکلیفات و دلی جذبات کا حال معلوم کرسکتا؟ آپ نے مجھکو مختلف ممالک و اقوام کی تواریخ کی تعلیم نہیں دی جس سے مجھکو قوموں و سلطنتوں کے عروج و زوال کے اسباب سے واقفیت حاصل ہوتی۔ اور میں اپنی سلطنت کو اُن اثرات سے پاک و صاف رکھ سکتا جن سے بادشاہوں اور سلطنتوں کو زوال کا منحوس چہرہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ اور اپنے کاروبارِ حکومت کو اُن اصولوں پر چلا سکتا جن سے ممالک کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ علومِ ریاضی و اقتصادیات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سلطنت کی آمدنی و اخراجات اور اُنکے مختلف ذرائع و صیغہ جات کے حقیقی حالات کی جانچ بطرزِ احسن نہیں کرسکتا اور نہ حکامانِ صیغہ جات مال کی رپورٹوں پر محاکمہ کرسکتا ہوں۔ جناب کو اسکا بخوبی تجربہ ہے کہ اکثر دربارِ شاہی سازشوں کا گہوارہ بنا رہتا ہے اور امراء دربار کی دورنگیاں اس مرقع کی نیرنگیوں کا سبب ہوتی ہیں۔ آپ نے مجھکو اصولِ سیاسیات و عملی سیاسیات کی تعلیم نہیں دی جو میں اُن سازشوں کا قلع و قمع کامیابی کے ساتھ کرسکتا۔ مجھکو کامیاب حکمراں بننے کے لئے اپنی رعایا کے مختلف فرقوں کے مذہبی عقائد و مجلسی رواجات سے واقف ہونا نہایت ضروری تھا لیکن آپ نے ان کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اب آپ ہی غور فرمائیں کہ آپکی تعلیم شاہراہِ حکومت میں میرے لئے کہاں تک مشعلِ ہدایت ثابت ہوسکتی ہے؟ ملّا جیون کے پاس اسکا جواب سوائے خاموشی کے اور کچھ نہ تھا۔ ایسے ماہرِ فنِ تعلیم شاہنشاہ عالمگیر نے منشی نند لعل کو اپنے لڑکے شہزادہ معظم کا اتالیق مقرر کیا تھا۔

منشی نند لعل صاحب علوم عربیہ کے متبحر عالم تھے۔ ایک مرتبہ عالمگیر کے رُوبرو علماء اسلام میں قرآنِ مجید کی ایک آیت کے معنی کے متعلق مباحثہ چھڑ گیا۔ منشی صاحب موصوف بھی اس جلسہ میں موجود تھے آپ نے بھی عالمگیر کی اجازت سے اس مباحثہ میں حصّہ لیا۔ اور مختلف و احادیث و تفاسیر کے حوالہ جات سے اس آیۂ کریمہ کی تقریباً ایک درجن طریقوں سے

تاویل کی اور کتبِ تواریخ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی بیان فرمایا کہ مختلف اسلامی فرقوں کے کون کون سے عقائد آیتِ مذکور کی تاویلات مختلفہ کے نتائج ہیں۔ آپکے غیر متوقع تبحر سے حاضرین تصویرِ حیرت بنگئے۔ مگر آپکی یہ روشنیٔ طبع آپ کے لئے بلا ثابت ہوئی۔

اورنگ زیب کا دربار اکبری دربار نہ تھا جہاں بغیر مذہبی رنگ آمیزی کے علم و اہلِ علم کی قدر ہوتی تھی۔ منشی صاحب کی علمی قابلیت و مذہبی عقائد کی نسبت طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ علماء دین نے شہنشاہ عالمگیر سے اس مضمون کا فرمان منشی صاحب موصوف کے نام جاری کرادیا۔ کہ منشی صاحب کی ذات ستودہ صفات کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ اس قدر زبردست عالم ہوتے ہوئے اہلِ ہنود کے حلقہ میں رہیں۔ اس لئے وہ یا تو مشرف باسلام ہوکر اہلِ جنت کے زمرہ میں داخل ہوں ورنہ تلوار کے گھاٹ اتر کر ابدی جہنم کے منازل طے کرنے کو آمادہ ہوجائیں۔

اس حکم کے جاری ہوتے ہی منشی صاحب کے مکان پر پہرہ لگا دیا گیا۔ مگر ایک روز رات کو شہزادہ معظم منشی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں حقِ شاگردی ادا کرنے کو حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ اس زندانِ بلا سے رہائی چاہتے ہیں تو باہر گھوڑے موجود ہیں، بہ تبدیل لباس سوار ہوکر روانہ ہوجائیے۔ چنانچہ منشی نند لعل صاحب اس طرح حراست سے آزاد ہوکر کلغی دھر گرو گوبند سنگھ جی مہاراج کے جان نثاروں میں شامل ہوگئے۔

آپ کا کلام جو اس وقت ملتا ہے تعداد میں بہت کم ہے۔ قیاس غالب ہے کہ شاہزادۂ مذکور کی اتالیقی کی اہم ذمہ داریاں اور مابعد کی گرو گوبند سنگھ جی کی ہمرکابی کی پریشانیاں آپکے کلام کی قلت و تضیع کا باعث ہوئیں۔ بہرحال آپ کا جس قدر کلام دستیاب ہوتا ہے اس سے آپکی کہنہ مشقی و دقیقہ نظری ثابت ہوتی ہے۔ آپکی غزلیات دیگر صوفی شعراء کی طرح جورِ معشوق، ستمِ رقیب، مسئلہ جبر و قدر، شکایتِ واعظ، گلۂ فلک وغیرہ خیالات مختلفہ و متضاد کی معجونِ مرکب نہیں ہیں۔ بلکہ آپ تصوف کے ان اعلیٰ منازل میں نغمہ زن ہیں جہاں صحرائے فراق ختم ہوکر گلشنِ وصال کی روح پرور نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے دل و دماغ کو تقویت و فرحت بخشتے ہیں۔ جہاں وصال و فراق کے جھگڑے، جو دوئی کا نتیجہ ہیں مٹ کر ہمہ اوست کی تنویر سے ذرہ ذرہ آفتاب بن جاتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مرا در منزلِ جاناں ہمہ عیش و ہمہ شادی
جرس بیہودہ مے نالد کجا بندیم محملہا

لسان الغیب خواجہ حافظ کی غزلیات بھی دنیوی امور سے خالی نہیں ہیں۔ حضرت شیخ سعدی

شیرازی کی غزلوں میں معشوقانِ حقیقی و مجازی کے شوقِ وصل و غمِ ہجر کا تذکرہ کچھ اس خوبی سے موجود ہے جس طرح کہ سپیدۂ سحر میں نور و تاریکی کا ایک عجیب و دلکش مرقع نظر آتا ہے۔ لیکن حضرت گویا کا کلام رُوئدادِ عشق کے روشن پہلو سے منوّر ہے۔ اسمیں خوفِ رقیب۔ رنجِ فراق، خوفِ رسوائی، شکایتِ زمانہ، دار و گیرِ عسس وغیرہ کا جو دنیائے عشق کی تاریک منازل ہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

ما بندۂ عشقیم خدا را نشناسیم　　دشنام ندانیم دعا را نشناسیم
آشفتۂ آنیم کہ آشفتۂ ما است　　ما شاہ ندانیم گدا را نشناسیم

آپ کا کلام وسعتِ نظر و تصوّف کی جان ہے اور ایک عالمِ باعمل کے مشاہداتِ باطنی و وارداتِ قلبی کی دلاویز تصویر ہے۔ بطور نمونہ کچھ کلام پیش کیا جاتا ہے ؎

ہوائے بندگی آورد در وجود مرا　　وگرنہ ذوقِ چنیں آمدن نبود مرا
خوش است عمر کہ در یاد بگذرد ورنہ　　چہ حاصل ست ازیں گنبدِ کبود مرا
دریں زماں کہ نیائی بیاد سے میرم　　بغیرِ یادِ تو زیں زیستن چہ سود مرا
فدا است جان و دلِ من بخاکِ مقدمِ پاک　　ہر آں کسے کہ بسوئے تو رہ نمود مرا
بغیرِ یادِ تو گویا نے توانم زیست　　بسوئے دوست رہائی و ہند زود مرا

---×---

بدہ ساقی مرا یک جامِ جاں رنگینئ دلہا　　بجانِ پاک ہیں آساں کنم ایں جملہ مشکلہا
مرا در منزلِ جاناں ہمہ عیش و ہمہ شادی　　جرس بیہودہ می نالد کجا بندیم محملہا
خدا حاضر بود دائم ببیں دیدارِ پاکش را　　نہ گرد آبے در و حائل نہ دریاؤ نہ ساحلہا
چرا بیہودہ مے گردی بصحرا و بدشت اے دل　　چو آں سلطانِ خوباں کردہ اندر دیدہ منزلہا
چو غیر از ذاتِ پاکش نیست در ہر جا کہ می بینم　　بگو گویا کجا بگذارم ایں دنیا و آملہا

---×---

دل اگر دانا بود اندر کنارش یار ہست　　چشم گر بینا بود در ہر طرف دیدار ہست
ہر طرف دیدار اما دیدۂ بینا کجا ست　　ہر طرف طور است ہر سو شعلۂ انوار ہست
سر اگر داری ببر و سر را بنہ در پائے او　　جاں اگر داری نثارش کن اگر در کار ہست
دست اگر داری ببر دامانِ جاناں را بگیر　　سوئے او میرو اگر پا را سرِ رفتار ہست

گوش گر شنوا بود جز نامِ حق کے بشنود گر زباں گویا بود در ہر سخن اسرار ہست
برہمن مشتاقِ بُت زاہد فدائے خانقاہ ہر کجا جامِ محبت دیدہ ام سرشار ہست
بے ادب پا را منہ منصور وش در راہِ عشق رہروایں راہ را اوّل قدم بردار ہست
ہر چہ داری در بساطِ خود نثارِ یار کُن گر ترا مانندِ گویا طبعِ گوہر بار ہست

درمیانِ بزمِ ما جز قصۂ جانانہ نیست بے حجابانہ درآ اینجا کسے بیگانہ نیست
بگذر از بیگانگان و شو بخود تو آشنا ہر کہ با خود آشنا شد از خدا بیگانہ نیست
شوقِ مولا ہر کرا باشد ہماں صاحبدل است کارِ رہرو دانا نباشد کارِ رہرو دیوانہ نیست
ناصحا تا چند گوئی قصہ ہائے وعظ و پند بزمِ مستان است جائے قصہ و افسانہ نیست
چند میگوئی تو اے گویا خمش شو زیں سخن شوقِ مولا منحصر بر کعبہ و بتخانہ نیست

من از جواں کہ پیر شدم در کنارِ عمر اے یا تو خوش گذشت مرا در کنارِ عمر
دمہائے ماندہ را تو چنیں مغتنم شمار آخر خزاں بیاورد ایں نوبہارِ عمر
ہاں مغتنم شمار دمے را بہ ذکرِ حق چوں با دمے رَوَد ز نظر در شمارِ عمر
باشد رواں چو قافلۂ موج پے بہ پے آبے بجوش یک نفس از جویبارِ عمر
صد کار کردۂ کہ نیاید بکارِ تو گویا بکن کہ باز بیاید بکارِ عمر

جملہ عالم بے تو حیران است و بس سینہ از ہجرِ تو بریان است و بس
طالبِ مولیٰ ہمیشہ زندہ است بر زبانش ذکرِ سبحان است و بس
خالِ مشکینش دلِ عالم ربود کفرِ زلفش دامِ ایمان است و بس
زود بنما آں رُخِ چوں آفتاب ایں علاجِ چشمِ گریان است و بس
دل نثارِ قامتِ رعنائے او جاں فدائے کوئے جانان است و بس

کسے بحالِ غریبانِ پارسا نرسد رسیدہ ایم بجائے کہ پادشا نرسد
[illegible] ولہا نرسد

طبیبِ عشق چناں گفتہ است می گویند | بحالِ دردِ غریباں بجز خدا نرسد
برائے روشنیِ چشمِ دل اگر خواہی | بخاکِ درگہِ او ہیچ کیمیا نرسد
بیا و دست تواں عمر را بسر بردن | کہ در برابرِ آں ہیچ کیمیا نرسد
تمام دولتِ گیتی فدائے خاکِ درش | کہ تا فدائش نگردد کسے بجا نرسد
فدائے خاکِ درش می شود ازاں گویا | بہر کہ خاک نگردد کسے بجا نرسد

ما بندۂ عشقیم خدا را نشناسیم | دشنام ندانیم دعا را نشناسیم
آشفتۂ آنیم کہ آشفتۂ ما است | ما شاہ ندانیم گدا را نشناسیم
چوں غیرِ تو کس نیست بہ تحقیق و تنقیح | ایں تفرقۂ ما و شما را نشناسیم
سر پا شدہ یا سر شدہ در راہِ محبت | گوئیم ولیکن سر و پا را نشناسیم
ما نیز چو گویا ز ازل مستِ الستیم | ایں قاعدۂ زہد و ریا را نشناسیم

رباعیات

ہر کس کہ ز شوقِ تو قدم از سر تاخت | بر نہ طبقِ چرخ علم بفراخت
شد آمدنش مبارک و رفتن ہم | گویا آں کس کہ راہِ حق را بشناخت

ہر دل کہ براہِ دوست تاباں شدہ است | تحقیق بداں کہ عینِ جاناں شدہ است
یک ذرہ ز فیضِ مقدمش خالی نیست | نقاش درونِ نقش پنہاں شدہ است

رسیدِ کتب

الہام منظوم (جلد اول - دوم - سوم) قیمت فی جلد عہ مطبوعۂ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور

سادھو اور بسوا - از مسٹر کشن پرشاد کول - قیمت ۱۲ر مطبوعۂ انڈین پریس الہ آباد

رقعات عالمگیری (اردو) قیمت مطبوعۂ فیروز پرنٹنگ ورکس - لاہور

طوفان شاعری

از بابو کرشن سہائے تھکاری وکیل

کمالِ اہلِ حرم مستند سہی لیکن کوئی تو باخبرِ جلوۂ بتاں ہوتا

نہ معلوم سازِ فطرت کا کون سا پردہ ڈھیلا ہوگیا ہے کہ فضائے شاعری میں آجکل ایک بےسُری آواز گونج رہی ہے، نہ معلوم ہر شخص کو آجکل یہ خبط کیوں ہوگیا ہے کہ جس طرح بھی ہو اس جذبات کی دیوی کو جو فطرت کے خوشنما گہواروں میں آرام کر رہی ہے سوتے سے جگایا جائے اور اگر وہ اسکے جگائے نہ جگے تو خواہ مخواہ اسکی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹی جائے۔ نہ معلوم ہر شخص نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ خواہ فطرت کو منظور ہو یا نہ ہو مگر اسکے لئے شاعر بننا امر لازمی ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ کسی نے صحیفۂ فطرت کا بغور مطالعہ کیا یا نہیں۔ اس سے مطلب نہیں کہ اسکو ذوقِ سلیم حاصل ہوا یا نہیں۔ قافیہ پیمائی آگئی اور اس فنِ لطیف کے مدعی بن بیٹھے۔ الفاظ کا الٹ پھیر سیکھ لیا۔ اور استادی کا دعوےٰ کرنے لگے۔ لیکن الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہوئے حضرات کو شاید یہ معلوم نہیں کہ "نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند" ایسے مدعیانِ بےخبر کا اگر شمار کیا جائے تو بلا مبالغہ انکی تعداد حشرات الارض سے کسی طرح کم نہوگی مگر جس طرح وہ جراثیم جنکی نشو و نما گندی اور ناپاک سرزمین میں ہوئی ہے جب اتفاق سے صاف اور خوشگوار ہوا میں ملجاتے ہیں تو اپنے زہریلے مادہ سے تمام فضا کو خراب کر دیتے ہیں بالکل اسی طرح یہ مجاز کی دلدل میں رہنے والی ہستیاں جب فطرت کی کسی صاف اور دلکش فضا میں آجاتی ہیں تو اسکو بھی اپنے کثیف خیالات سے مکدر کر دیتی ہیں۔ تاہم فضا سرسبز نہیں تا اب ایسے اساتذہ مستقبل کے لئے کتنی ہی لطیف شاہراہ کیوں نہ قائم کریں مگر زبان صاحبِ شیدائی بھی اسپر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح شگفتہ آب و ہوا وبائی جراثیم کے لئے سمِ قاتل ہوتی ہے شاید اسی طرح فطرت کی خوشگوار فضا بھی ان کثافت پسند ہستیوں کے لئے نہایت مضر ہوتی ہے۔ جب یہ بیچارے دیکھتے ہیں کہ ان مقدس سرزمین میں انکے برانگیختہ جذبات کی گنجائش نہیں۔ نہ یہاں انکا مزار آسانی سے بن سکتا ہے اور نہ شاہدانِ بازاری کی لکد کوبیوں سے وہ متزلزل ہوسکتا ہے نہ رسیبا

رُوسیاہ سے انکی خانہ جنگیاں ہو سکتی ہیں - اور نہ آئے دن آنکا جنازہ نکل سکتا ہے تو انکے حوصلے اور بھی پست ہو جاتے ہیں - اگر کوئی انھیں زبردستی لیجا کر اس فضائے دلکش کی سیر بھی کرائے جس میں ہر طرف یہ صدا گونج رہی ہو ؎

بادہ از ما مست شد نے ما ازو	قالب از ما ہست شد نے ما ازو

جسکا ذرّہ ذرّہ باآواز بلند یہ کہہ رہا ہو ؎

جلوہ آرائے ازل کی منتشر تھیں قوتیں	شوقِ خود بینی سے یکجا ہو کے انساں ہو گئیں

تو یہ بیچارے اُسے صدائے مبہم سمجھ کر وہاں سے اُلٹے پاؤں بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں گویا جس طرح ایک قفسِ تنگ میں پلا ہوا طوطا رہا ہو کر بھی اُسی میں واپس آنے کی بار بار کوشش کرتا ہے اسی طرح یہ محدود خیالات والی ہستیاں گلشنِ فطرت کی وسیع فضا میں پہونچکر بھی اسی تنگ خیالی سے کام لینا چاہتی ہیں مگر جب اِس چمنِ فطرت کے طیور کی یہ آواز انکے کانوں میں آتی ہے ؎

مَیں وہ ہرگز نہیں جسکو قفس میں موت آتی ہے	مَیں وہ ہوں جسنے خود دیکھا نہ سُوئے آشیاں ہوں

تو یہ بیچارے بدحواس ہو کر پھر اسی قفسِ تنگ میں پناہ لیتے ہیں اور پھر اُسکی تیلیوں سے اپنا سر ٹکرانے لگتے ہیں -

الغرض حسینوں کی چوٹیاں گوندھنے والوں، اُنکے فراق میں تڑپنے والوں اور پھر انکی عدم التفاتی پر خودکشی کرنے والوں کی تعداد آجکل اس قدر بڑھگئی ہے کہ نغمہ پردازانِ فطرت کو کسی گلشنِ سخن میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی جو جانؔ صاحب کے ورثاء کو حاصل ہوتی ہے - چونکہ فطرت نے اپنی بہترین نعمت سے جسے ذوقِ سلیم کہتے ہیں انھیں محروم رکھا ہے اس لئے یہ بیچارے ایک فطری شاعر کے جذبات کو نہ سمجھکر کبھی اُسپر کفر کا فتوے عائد کردیتے ہیں اور کبھی اُسکے اشعار کو لایعنی اور مہمل کہکر ٹھکرا دیتے ہیں - انکی رُوح پر مجاز اور بوالہوسی کے اتنے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ آفتابِ فطرت کی خوشنما کرنیں اُس تک پہونچ ہی نہیں سکتیں - انکو کبھی اِس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ لفظی گورکھدھندے والی مگر جذبات سے خالی شاعری مثل اُس قالب کے ہے جسمیں رُوح کا نزول ہنوز نہیں ہوا - جب تک نبات کے ساتھ مصری کی ڈلی نہ ہو ان حضرات کو شاعری تلخ معلوم ہوتی ہے جبتک لفظی رعایت نہ ہو شعر نامکمل نظر آتا ہے - انکی نکتہ رس نگاہ اسی لفظی تکرار تک محدود رہتی ہے - یہی انکے پروازِ تخیل کی آخری منزل ہے جسکے آگے قدم رکھتے ہوئے انکا خیال ہوتا ہے ؎

اگر یک سرِ مُوئے برتر پرم	فروغِ تجلّی بسوزد پرم

انکے جذبات کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی موسمی بے اعتدالی یا تعجیل گور وکفن کے لحاظ سے انکا جنازہ کوچۂ جاناں سے نہ گذر سکا تو پھر انکی بیقرار روح کی تسکین صرف انھیں لکد کوبیوں سے ہوسکتی ہے جو انکا معشوق انکے مزار پر جاکر وقتاً فوقتاً کیا کرے - ان طالبانِ موت کو مطلق خبر نہیں کہ ایک فطری شاعر اسکی حقیقت کو کس طرح بے نقاب کرتا ہے -

توڑ کر نظمِ عناصر کے ہر اک بندِ قیود آخر بش لے ہی اڑی میری لطافت مجھکو
وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

حقیقت میں یہ حضرات اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہیں کیونکہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" کے مطابق جس طرح فطرت نے تمام فضا کو خوشگوار بنانے کا مشن دیکر ایک حقیقی شاعر کو اس دنیا میں پیدا کیا ہے اسی طرح ان خطرناک ہستیوں کی آفرینش کا مقصد بھی شاید یہ رکھا ہے کہ یہ اسکے خلاف عمل پیرا ہوں - یہ فرق اس طرح پر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک نفیس جذبات کی مصوری کرتا ہے تو دوسرا کثیف خیالات کا پتلا بنا تا ہے - اگر ایک گلاب کا خوشنما پھول بنکر چمنِ فطرت میں کھلتا ہے تو دوسرا اسکی پنکھڑیوں کا کانٹا بنکر کھٹکتا ہے -

حقیقی شاعری اپنے اثرات کی برقی لہریں انکے طرف کتنی ہی کیوں نہ دوڑائے یہ وہ ناقابلِ تربیت ہستیاں ہیں جو لطیف جذبات کی بجلیوں کے اثر سے متاثر ہی نہیں ہوسکتیں - ان میاں چرکین اور جان صاحب کے دلدادگان کو کون سمجھائے کہ حقیقی شاعری صرف الفاظ کی بندش، استعارات اور تشبیہات کا نام نہیں ہے بلکہ در اصل اُن جذبات کا نام ہے جو انکے لباس میں آکر روح کو سرور اور زندگی کو تازگی عطا کرتے ہیں - نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی، فلسفۂ حیات ہو یا ممات ہر ایک میں صدہا ایسی لطیف حقیقتیں اور نفیس جذبات پنہاں ہیں جنکے سمجھنے سے انسان مکمل انسان بن سکتا ہے - اور انھیں حقائق اور جذبات کی تصویر بلا کسی تصنع کے کھینچنا حقیقی شاعری ہے -

اس طوفانی دور میں بھی ایسی مایۂ ناز ہستیاں موجود ہیں جو بجا طور پر دورِ حاضرہ کے مجدد کہلائے جانے کی مستحق ہیں مگر بدقسمتی سے انکی تعداد اس قدر کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے - بجائے اسکے کہ ان مغتنم ہستیوں کے روح پرور کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اس سے اخلاق ظاہری و باطنی کی درستی کیجائے - اسکا مضحکہ اڑایا جارہا ہے اور اسکو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کی بے سود کوششیں کیجارہی ہیں - ان فضائے شاعری کو مکدر کرنے والی ہستیوں کو کون بتائے کہ انکی شاعری کا گور وکفن انکے ساتھ ہی ہوجائیگا اور انکے بعد کوئی یہ بھی نہ جانیگا کہ وہ

غزل گو تھے یا ہزل گو۔ لیکن مجددین دور حاضرہ کا ہمیشہ زندہ رہنے والا کلام غالب اور میر کی طرح انکے بعد بھی انکی یاد دلاتا رہے گا۔

ان کثیف خیالات کے متعلق اگر ان حضرات کا یہ خیال ہے کہ بلحاظ تولید نسل انسانی دل و دماغ میں انکا نشو و نما پانا فطرتاً لازمی ہے تو انھیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ انکا اپنی حد سے تجاوز کر جانا بھی قاطع نسل انسانی ہے۔ بہر کیف کچھ بھی ہو اگر شاعری سے مقصود صرف کثیف جذبات کی ترجمانی کرنا ہی ہے تو یہ حضرات اپنے دل و دماغ کو بیکار پریشان کرتے ہیں جب کہ آجکل ہر گلی کوچہ میں ایسے مجرّب نسخہ جات بکثرت دستیاب ہو سکتے ہیں جو اس مرض کے لئے تیر بہدف ثابت ہو سکتے ہیں۔ مگر شاعری کا مقصد صرف اخلاقِ انسانی کو درست کرنا ہے نہ کہ انسان کو عیاش اور نفس پرست بنا دینا۔ اس لئے ہر شخص کا جو شاعر بننا چاہتا ہے یہ فرض ہے کہ وہ ایسے نفیس جذبات تلاش کرے جن سے رُوح متاثر ہو سکے مگر آہ یہ جذبات کب اور کس کو حاصل ہو سکتے ہیں اسکا جواب حضرت سرمد کی مبارک زبان سے سُنئے ؎

سرمد غم عشق بو الہوس را ندہند   سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار   ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

یہ فطرت کی بہترین نعمت صرف اُسے ملتی ہے جسکو فطرت کی موہنی دیوی اپنے اعجاز تبسم سے اپنا شیدائی بنا کر اپنے آغوش میں لیتی ہے اور پھر اُسکے سینہ کو اپنے جذبات کی اُس مقدس آگ سے روشن کرتی ہے جسکی ایک چنگاری دنیائے مجاز کی تمام کثافتوں کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالتی ہے یہ فطرت کی چیدہ نعمت صرف اُسی شخص کے حصے میں آتی ہے جسکی قربانگاہ عقیدت کے گرد خلوص و محبت کی دیوی از خود رفتہ ہو کر پروانہ وار رقص کرتی ہے پھر جسکو استغنا کی دیوی اپنا سر بمہر خزانہ حوالہ کر کے تمام دنیوی دولت و عزت سے بے نیاز کر دیتی ہے ایسی مقدس ہستیاں جنکی رہنمائی خود فطرت کرتی ہے فنِ شاعری سے کتنے ہی بے بہرہ کیوں نہوں جو کچھ اُنکے لب شیریں سے نکلتا ہے آبحیات بنکر نکلتا ہے۔ استعارات و تشبیہات انکے کلام کو اپنا لباس پہنانے کے لئے ہر وقت انکے سامنے کھڑے رہتے ہیں بقول مولانا رُوم ؎ من ندانم فاعلاتن فاعلات + شعر می گویم بہ از آب حیات +

اگر اس راز سے ہمارے شعراء متذکرۂ صدر بھی آگاہ ہو جائیں اور ذوقِ سلیم عطا کرنے کے لئے فطرت کی دیوی سے ملتجی ہوں تو یقین ہے کہ دنیائے شاعری سے یہ طوفانِ بدتمیزی بہت جلد دُور ہو جائے۔ خدا انھیں اسکی توفیق دے۔ آمین +

چمار

(ایک قصہ)

(از پروفیسر آسارام کوشنگ ترا ایم۔ اے (دہلی و آگرہ) و ایم۔ آر۔ اے۔ ایس)

ہوڑا اسٹیشن پر کلکتہ میل آپہونچی اور مانک چند اول درجہ کے خانے سے نیچے اُترے۔ انکی آن بان اور شان و شوکت دیکھکر ایک سیاہ فام دُبلا پتلا لڑکا انکے قدموں پر گر پڑا اور رگڑ گڑا کر ایک پیسہ خیرات مانگنے لگا۔ مانک چند نے ایک سیکنڈ بوٹ کی نوک کو دیکھا گویا میلی ہوگئی ہے اور پھر ٹھکرا کر بولے "دیکھتا ہے کہ ہنٹر سے خبر لوں۔ اُلّو کا پٹھا۔ کپڑے چھو کر ناپاک کردئے۔ اور پیسہ مانگتا ہے! چمار کہیں کا"

یہ الفاظ انکے ہمراہی منیم جی کے لئے اشارے کا کام کرگئے۔ اسنے بھی چند فحش گالیاں دیں اور غرور کے ساتھ پیچھے دیکھتا ہوا سیٹھ جی کے ساتھ ہولیا۔

بچہ فاقہ کشی کے صدموں سے پہلے ہی سے نہایت کمزور تھا۔ ٹھوکر سے ادھ مُوا سا ہوکر سڑک پر گر پڑا۔ گھٹنا خون سے تر تھا مگر آنکھوں سے بیکسی ترشح ہو رہی تھی۔ نگاہیں رحم کی ملتجی تھیں۔ آنسوؤں سے معلوم ہوتا تھا کہ امیدوں کا خون ہوگیا ہے۔ اور قلب مضطر ہمدردی کے لئے بیقرار تھا مگر...... مانک چند حقارت سے ٹھکرا کر آگے بڑھگئے اور اپنی موٹر کار میں سوار ہوکر آناً فاناً نظروں سے غائب ہوگئے۔

(۲)

کلکتہ میں سیٹھ رتن چند نامی آدمی تھے۔ کیوں نہو۔ خیرات میں دل کھول کر روپیہ دیتے تھے۔ ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ انھوں نے دو لاکھ روپیہ سے مارواڑی یتیم خانہ بنوایا تھا۔ نوزجیت پور روڈ پر ایک سنسکرت پاٹ شالہ بھی انھیں کی فیاضی کی بدولت چلتا تھا۔ علاوہ اسکے ہزاروں غریبوں اور بھکاریوں کا پیٹ پلتے تھے۔ مگر انکے فرزند سیٹھ مانک چند کو خیرات سے سخت نفرت تھی انکا قول تھا کہ خیرات سے مفت خوروں کی تعداد میں اضافہ ہونے کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور اسکی غایت محض شہرت طلبی ہوتی ہے۔ انکا خیال تھا کہ میں کافی مشہور ہوں مجھے خیرات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب تک رتن چند زندہ رہے مانک چند کی نازبرداری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اکلوتا لڑکا۔ گنڈے تعویذوں کی اولاد۔ پھر ہر معاملے میں اسکی ضد کیوں نہ پوری

کیجاتی - نتیجہ یہ ہوا کہ مانک چند اعلیٰ درجہ کا سرکش و خود پرست ہوگیا اور سیٹھ جی کے مرتے ہی اپنے ارمان نکالنے شروع کئے۔

(۳)

جب دیکھا کہ میدان خالی ہے اور گھر دولت سے بھرا ہوا ہے تو مانک چند نے کاروبار کو توخیرباد کہا اور ہمہ تن عیاشی میں مبتلا ہو گئے - بچپن کا زمانہ ناز و نعمت میں گذرا تھا - کام سے دلچسپی کیوں لیتا - رفتہ رفتہ کوٹھی اور کارخانے سب ہی بیٹھ گئے - دولت کے بھی پر لگ گئے - تھیلیاں خالی ہو گئیں - اور اسکے ساتھ ہی وہ خوشامدی دوست بھی غائب ہو گئے جو برقی پنکھوں کے نیچے اکثا نمبر ایک کی بوتلوں سے لطف اندوز ہو کر ڈینگیں مارا کرتے تھے - رشتہ داروں نے کنی کاٹنا شروع کی - غریبوں کے کوئی رشتہ دار ہی نہیں ہوتے ہیں - الغرض یہ اکیلے رہگئے - لیکن دولت کا خمار ابھی باقی تھا - مینوشی کی ذلیل عادت پڑ گئی تھی - آخرکار انجام یہ ہوا کہ روٹی ہو یا نہو - کپڑا ملے یا نہ ملے مگر شراب کا پیالہ ضرور ہو - گھر کا اثاثہ ٹھکانے لگانے لگے - جب کچھ نہ رہا تو برتنوں پر ہاتھ صاف ہوا کہتے ہیں بڑے برتن کی کھرچن بھی بہت ہوتی ہے - چنانچہ برتنوں کی بدولت بھی کچھ دنوں تک دور چلا - بیوی کا زیور تو پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا - اب کپڑوں کی نوبت آئی - اچھے اچھے بھاری بھاری جوڑے اونے پونے داموں پر کلال کے یہاں گرو ہوئے - مگر بقول غالب ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور دل میں کہتے تھے کہ ہاں　　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

دانہ وانہ کرتے کوٹھیاں خالی ہو جاتی ہیں - آخر ایک روز . . . . سر شام آئے - منہ پر ہوائیاں چھٹ رہی تھیں - داڑھی بڑھی ہوئی تھی - کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے - آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی - آتے ہی شراب مانگی - بیوی نے (جسکا نام ساوتری تھا) لجاجت سے کہا "آپ کو خیال نہیں ہا شراب تو سویرے سے ہی ختم ہو چکی تھی - اتنا سننا تھا کہ مانک چند نے غریب ساوتری کو پکڑ پانچ سات تھپڑ نہایت زور سے رسید کئے - اور نہ معلوم کیا کیا بکا - ننھے ہیرا نے شامت اعمال سے انکی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اسکو بھی خوب ہی پیٹا - بچے کی ننھی سی جان اور اس دیوانے شرابی کے طمانچے - نیم جاں ہو گیا اسپر مستزاد یہ کہ باپ نے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا اور گلی میں ڈال دیا۔

اندھیرا ہو چکا تھا گھر میں چراغ کے لئے تیل نہ تھا - بچہ گلی میں سسک رہا تھا - بیوی آنگن میں کراہ رہی تھی - مگر مانک چند گھر کی تلاشی لے رہے تھے کہ کچھ ملے جب کچھ نہ ملا تو بیوی کے کان سے سونے کی بالیاں نکالنے لگے - غصہ اور کمزوری سے ہاتھ کانپ رہے تھے - کو کچ نہ کھلی تو جھٹکا دیکر نکالی کان لہو لہان

ہو گیا۔ ساوتری چیخ رہی تھی مگر مانک چند سب کو چھوڑ کر چل دئے۔

(۴)

یوں تو ہر بڑا شہر اپنے شور وغل کے لئے بدنام ہوتا ہے لیکن کلکتہ کے بعض بازاروں میں صبح شام قیامت کا شور برپا رہتا ہے۔ تانگے۔ گاڑیاں۔ فٹن موٹر بائیسکل ٹرام کا غرض ایسا طوفانِ بے تمیزی رہتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ رام باپولین کی جہاں مانک چند کا مکان تھا یہی کیفیت تھی۔ شام کو یہاں خصوصیت سے بڑی رونق رہتی ہے۔ شہر کے باغات اور عام سیرگاہوں کا یہی راستہ ہے ننھا ہیرا مانک چند کا اکلوتا بیٹا اس گذرگاہ عام میں ایک طرف بیہوش پڑا ہوا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ دوسروں کی فکر کریں۔ دوسرے کسی نے اسکو دیکھا بھی تو کسی محتاج کا لڑکا سمجھ کر پروا نہ کی۔ اسی طرح جب کافی وقت گذر گیا تو اچانک ایک فٹن پر سے ایک معزز عیسائی نے آواز دی۔ بچے! الگ ہٹ جا! سائیس نے بھی للکارا۔ مگر وہاں کسے ہوش تھا۔ حتیٰ کہ گھوڑے کی ٹاپوں نے اسکو چھو لیا۔ اس شریف آدمی نے گاڑی روک لی۔ اور فٹن سے نیچے اتر کر ہیرا کو جھاڑ پونچھ کر اٹھا لیا۔ اور پیار سے اسکا پتہ پوچھا۔ مگر جب اسنے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ بچہ کچھ تو اجنبی چہرے سے خوف زدہ اور کچھ فاقہ کشی سے نیم جاں تھا۔ خاموشی سے انکا منھ تکتا رہا تو معزز عیسائی نے راہگیروں سے بھی دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی شخص اس بچے کا پتہ نہ بتا سکا۔ ناچار لاوارث سمجھ کر اسکو اپنے ساتھ لے گیا۔ اور اخبار میں اشتہار دیدیا۔ جب کامل دو ماہ گذر گئے اور کوئی وارث پیدا نہوا تو انھوں نے اپنا سمجھ کر اسکی پرورش شروع کر دی۔

(۵)

ساوتری نے بچے کی بہت تلاش کی جب کچھ خبر نہ ملی (اور خبر بھی کیسے ملتی۔ وہ غریب اخبار پڑھنا تو جانتی ہی نہ تھی) اور مانک چند اس روز کے بعد پھر تین ماہ میں لوٹے۔ اس عرصہ میں تہی ورتا ساوتری نے کیونکر اپنی گذر اوقات کی اور کس طرح اپنے دن کاٹے اسکی داستان تمام صنف نازک کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔

رات کے دو دو بجے تک کپڑے سیتی تھی۔ صبح اٹھکر پھر سینے بیٹھ جاتی تھی اور اس طرح جو پانچ سات آنے پیسے آتے تھے اسی میں گذران کرتی تھی۔ تین ماہ میں شاید تین دفعہ بھی وہ گھر سے باہر نہ نکلی ہوگی۔ ہاں جب بچے کی یاد آتی تھی۔ خاموشی سے چار آنسو بہا کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی تھی۔ آہ آنسوؤں میں کتنی بجلیاں چھپی ہوتی ہیں۔ کتنی مقناطیسی قوت مخفی رہتی ہے اور کتنی ٹھنڈک ہے اسکا اندازہ

کچھ غمزدہ انسان ہی کر سکتے ہیں۔ یہ آنسوؤں ہی کے چھینٹے ہیں کہ قلب کی آتش سوزاں کو لمحوں میں بجھا کر رکھدیتے ہیں یہی گرم گرم آنسو پتھر کو بھی موم کر دیتے ہیں۔ غریب ساوتری کی بیکسی میں بھی گریہ زاری ہی آسکا دم بھرتی رہی۔

(۶)

کہتے ہیں ایشور کے ہاں دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں ہوتا۔ بچے اور بیوی کو مارپیٹ کر مانک چند سونے کی بالیاں لیکر شراب کی دکان پر پہونچا۔ اور خوب سیر ہو کر پی۔ سورج چھپے تک سیاہ مست ہو کر بازار کی نالی پر نہ گر پڑے۔ بوتل ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ کسی رہرو نے آوازہ کسا۔ اسپر یہ اتنے چڑھے کہ اینٹ ہی تو دے ماری اور اتفاق سے وہ نشانہ لگا کہ اُس غریب کی بائیں آنکھ مانک چند کی عقل کی طرح ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ ایک مجمع ہو گیا۔ اور مانک چند بحالت بیہوشی "بڑے گھر" پہونچ گئے۔ مقدمہ قائم ہوا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تین ماہ قید سخت کا حکم ملا۔ مگر انھوں نے کسی سے اپنے گھر کا پتہ تک نہ بتایا۔ رہائی کے بعد یہ اور بھی چکنے گھڑے ہو گئے۔ ہفتوں گھر سے غائب رہنے لگے۔ بچے کی یاد نے ماں کو تڑپا دیا مگر اس کم بخت نے بھولے سے بھی ذکر نہ کیا۔ سچ ہے مایوسیاں انسان کو سنگدل اور سرد مہر بنا دیتی ہیں۔

(۷)

وقت کو گذرتے اور قرض کو بڑھتے دیر نہیں لگتی۔ پندرہ سال گذر گئے۔ مگر مانک چند نہ سنبھلے۔ ساوتری محنت کرتی تھی اور یہ اسکے خون پسینے کے پیسوں سے شراب خرید کر پیتے تھے۔ حادثات مفلسوں کو زیادہ ستاتے ہیں۔ ساوتری بیمار ہو گئی۔ اور اسکی کمائی بھی بند ہو گئی مگر مانک چند کی شراب بند نہوئی۔ پیسے نہ ملنے پر وہی مارپیٹ کی نوبت آئی۔ دیوانے کے ہاتھ اس مرتبہ چاقو آگیا۔ وہی دے مارا۔ کئی زخم کاری لگے۔ مگر واہ ری وفاداری۔ ساوتری ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی لیکن مُنھ سے اُف تک نہ کی۔ اتفاق اور تائید غیبی اسے کہتے ہیں کہ جب مانک اس سانحہ کے بعد فرار ہونا چاہتا تھا۔ ایک اور شرابی اسی کا ملاقاتی اسکو بلانے آیا اور اسنے چپکے سے جا کر پولیس کو اطلاع دیدی۔ وہ شرابی ضرور تھا مگر اخلاق میں ابھی اتنی کمزوری نہیں آئی تھی۔ پولیس نے مانک چند کو گرفتار کر لیا۔

(۸)

صاحب جج کی عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تل دھرنے کی کہیں جگہ نہ تھی۔ ہفتہ بھر اسپتال میں رہنے کے بعد ساوتری عدالت میں پیش ہوئی۔ اپنے بیان میں اسنے سب معاملہ صاف صاف کہدیا کہ میرا خاوند پکا شرابی ہے۔ اور چاقو سے اسنے نشہ کی حالت میں زخم لگائے ہیں۔

مانک چند نے کہا "یہ بکواس ہے میں اس عورت کو پہچانتا بھی نہیں"۔

اسپر عدالت میں قہقہہ کی آواز آئی۔ کسی نے کہا۔ واہ اچھا شوہر ہے کہ بیوی کو نہیں پہچانتا۔
عدالت کے مجبور کرنے پر مانک چند نے اپنے والد کا نام بتایا۔ رتن چند کا نام سنتے ہی سامعین پہ سکتہ سا طاری ہوگیا۔ اکثر لوگوں کی زبان پر تھا "بھگوان کی لیلا ہے۔ رتن چند کا بیٹا اور ایسا شرابی۔ سیٹھ جی کی اولاد اور یوں برباد ہو۔ قدرت کے کھیل ہیں"۔

عدالت نے پھر طرفین کو بولنے کا موقع دیا۔ مانک چند نے کہا۔ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔
مگر ساوتری بولی کہ۔ حضور اگر مجھ ابھاگن کا یقین کر سکتے ہیں تو میں نے سب سچ سچ عرض کر دیا ہے اور اب میں ہاتھ جوڑ کر رحم کی التجا کرتی ہوں۔ یہ میرے پتی اور مالک ہیں۔ اور مالک کو نوکر پر ناراض ہونے اور اسکو مارنے کا حق ہے۔

عدالت۔ انگریزی راج میں کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی آزادی پر حملہ کرے۔

ساوتری۔ سرکار۔ یہ قید ہوگئے تو کیا ہوگا۔ اب یہ سدھر نہیں سکتے۔ جو کچھ میری تقدیر میں لکھا ہے بھگتنا پڑیگا۔ اب حضور مجھ پر رحم کریں۔ (رو کر) ہائے بیٹا یوں گیا۔ پتی یوں چلے جائینگے۔

عدالت۔ کیا تمھارا بیٹا مر گیا ہے؟

ساوتری۔ کچھ معلوم نہیں حضور مر ہی گیا ہوگا۔ ایک روز شام کو انھوں نے مار پیٹ کر سڑک پر ڈالدیا تھا۔ پھر خبر نہ لگی۔

عدالت۔ تم نے اُسے تلاش نہیں کیا؟

ساوتری۔ بہت کیا۔ سرکار میں اکیلی تھی۔ اور یہ اُس دن سے گھر سے جا کر پھر تین مہینے میں لوٹے تھے۔ صبر کر کے بیٹھ رہی۔ کلکتہ شہر ہے۔ لاکھوں آدمی ہیں۔ کیا پتہ چل سکتا تھا؟

جج نے چند منٹ کچھ سوچا اور پھر قلم اُٹھا کر ایک ماہ سخت قید اور سو روپیہ جرمانہ کا فیصلہ سنایا۔ ساوتری رونے لگی۔ جرمانہ کے سو روپیہ کہاں سے آئینگے؟

مگر ایک بندۂ خدا نے جرمانہ وہیں ادا کر دیا۔ جب مانک چند کا جیل میں آخری دن تھا۔ تو وہی جج صاحب آئے اور اسکو چھڑا کر اپنے ساتھ کوٹھی پر لے گئے۔ جج صاحب کا اس قدر مہربان ہونے کا راز مانک چند کی عقل سے باہر تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھا۔ مگر جج صاحب کے اصرار پر انکے ساتھ ہو لیا۔
کوٹھی پر پہونچ کر اور اطمینان سے بیٹھکر جج صاحب نے مانک چند سے پوچھا۔

جج۔ جیل میں آپکو تکلیف تو نہیں ہوئی؟

مانک چند- ہاں اور تو کچھ نہیں داروغہ بڑے مہربان تھے۔ لیکن تنہائی سے بڑھکر اور کونسی تکلیف ہو سکتی ہے؟

جج- مَیں آپکو کھانے کی دعوت دیتا لیکن مجبور ہوں شاید آپ میرا کھانا کھانا پسند نکریں۔

مانک چند سے اب نہ رہا گیا ہمّت کرکے پوچھا "معاف کیجئے۔ لیکن آپ مجھ ناچیز پر کیوں اتنے مہربان ہیں؟ مَیں واقعی حیران ہوں"؟-

جج- یہ آپ کو ابھی معلوم ہو جائیگا اور مَیں اسی غرض سے آپکو یہاں لایا ہوں۔

یہ کہکر ہترو! ہترو! پکارا۔ اور اسکے جواب میں ایک نوجوان لڑکا کوٹ پتلون پہنے وہاں آکر پوچھنے لگا- "بابا مجھے بلایا ہے؟"

جج- ہاں تمھیں ہی بلایا ہے۔

مانک چند نے اپنی آنکھوں کو لڑکے کے چہرہ پر ایسا جمایا گویا وہ ایک غیر معمولی انسان یا فرشتہ تھا۔ برابر ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

جج- آپ میری طرف متوجہ ہوجئے؟ اس لڑکے کو کیا دیکھ رہے ہیں یہ میرا لڑکا ہے۔

مانک چند- ہاں بیشک آپ ہی کا لڑکا ہوگا۔ مگر میں حیران ہوں اسکی شکل وصورت میرے گم شدہ لڑکے ہیرا سے ملتی ہے!

جج- خیر۔ اب میں آپ سے اپنی مہربانی کا سبب بتانا چاہتا ہوں۔ ہترو! ذرا وہ چھوٹا سا بنڈل جو ٹرنک پر رکھا ہے اُسے اُٹھالاؤ۔

سنیئے! مَیں اب سے پندرہ برس پہلے ایک چمار کا یتیم لڑکا تھا اور ہوڑا کے اسٹیشن کے قریب بھیک مانگ کر گذارا کیا کرتا تھا۔ ایک روز آپ اوّل درجہ کی گاڑی سے اُترے۔ میں نے بڑھکر قدم چھوئے اور آپ سے ایک پیسہ مانگا۔ آپ نے ٹھوکر مارکر میرا گھٹنا زخمی کر دیا تھا۔ مَیں رو رہا تھا اور آپ موٹر میں سوار ہوکر چل دیے تھے۔

مانک چند- آہ! بھگوان! مجھے یاد ہے۔ بس بس جج صاحب۔ رہنے دیجئے۔ اب آگے نہ کہئے اس سے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔

جج- اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے؟ سبھی ہندوستانی چمار کو بُرا سمجھکر اُسکو دُور دُور کرتے ہیں۔ ہاں تو مَیں وہیں پڑا ہوا چیخ رہا تھا کہ ایک رحم دل پادری نے مجھے گود میں اُٹھالیا اور یہ سُنکر کہ مَیں یتیم ہوں۔ میری پرورش کی اور مجھے ہندو سے عیسائی بنالیا۔ ترقی کرتے کرتے

میں آپ کے سامنے ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ اُس وقت آپ مجھے ٹھوکر مار کر اپنے بوٹ کو دیکھنے لگے تھے کہیں میلا تو نہیں ہو گیا۔ اور اب مجھ سے ہاتھ ملانا آپ فخر سمجھتے ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟

مانک چند۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ لیکن بھگوان کے لئے آپ اِس سے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔

جج نہیں۔ لالہ مانک چند۔ ابھی اِس ڈرامہ کا آخری اور ضروری ایکٹ باقی ہے۔

یہ کہکر وہ چھوٹا سا بنڈل کھولا۔ اور ایک چھوٹا سا کرتہ اور میلی سی ٹوپی نکال کر کہا۔

"ذرا اِن کپڑوں کو پہچاننے کی کوشش کیجئے"۔

مانک چند نے دو منٹ غور کیا اور پھر ایسے انداز سے گویا اسکو قارون کی دولت ملگئی ہے چلّا کر بولا۔

"جج صاحب! یہ میرے لڑکے کے کپڑے ہیں۔ اور یہ میرا لڑکا ہے"۔

یہ کہکر تبرو کی طرف دوڑا۔ مگر جج نے اُسکو روک کر کہا "ٹھہرئے! آپ دھرماتما ہندو ہیں۔ اس لڑکے نے پندرہ برس تک ایک چمار کے گھر رہکر اُسکی روٹی کھائی ہے۔ کیا اب بھی آپ اسکو اپنا لڑکا کہہ سکتے ہیں؟ کیا یہ اچھوت نہیں ہو گیا ہے؟

مانک چند۔ یہ لڑکا میرا ہے۔

جج۔ اس سے کسی کو انکار نہیں مگر پہلے میرے سوال کا جواب دیجئے؟

مانک چند۔ جج صاحب! میں اور کچھ نہیں جانتا۔ یہ لڑکا میرا ہے اور کچھ بھی ہو۔ میرا رہیگا۔

جج۔ افسوس ہے۔ کیا آپ اِسی کو دھرم کہتے ہیں۔ چونکہ یہ آپ کا بیٹا ہے تو چمار کا کھانا کھانے پر بھی ہندو ہی بنا رہا اور چونکہ چمار کا بیٹا تمھارا بیٹا نہیں ہے اس لئے وہ ناپاک ہے اور یہ ناپاک ہونے پر بھی ناپاک نہیں۔

ہزار افسوس ہے اس تنگ خیالی پر! اگر اُس روز اسٹیشن پر آپ مجھے اپنا سمجھکر کچھ خیرات دیدیتے اور اسی نگاہ سے جس سے اس وقت اِس لڑکے کو جو در اصل چمار کہلانے کا مستحق ہے دیکھ رہے ہیں مجھے بھی دیکھتے تو آج ہندو قوم سے ایک فرد کم نہ ہوتا۔

دنیا میں حرص وطمع سے زیادہ کوئی عیب نہیں ہے۔ غیبت سے بڑھکر کوئی برائی نہیں ہے۔ راست گفتاری سے بڑھکر کوئی عبادت نہیں ہے۔ جس کا دل صاف ہے اُسکے لئے تیرتھ جاترا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو شریف طبیعت ہے وہ دولتمند اور عالی خاندان شخص سے بھی بہتر ہے۔ غیروں کے ساتھ بھلائی کرنے سے بہتر دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔ جسکے پاس علم ہے اُسکے لئے مال و دولت کی خواہش [illegible]

تنقید کتب

کلیّات وفا نتیجۂ فکر رسا مولوی حکیم عبدالہادی خاں صاحب وفا مرحوم رامپوری۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۲۱۴ صفحات
قیمت فی جلد ۱۲/- ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ - دہلی۔

حضرت وفا مرحوم اگرچہ دنیائے سخن میں عام طور پر مشہور نہیں لیکن بالکل غیر معروف بھی نہیں ہیں۔ چند سال پیشتر وہ بزم سخن میں موجود تھے۔ اور اپنے دلنشین و دل پذیر کلام کی بدولت رونق محفل بنے ہوئے تھے۔ وہ میر، مومن اور غالب کے متبعین و مقلدین میں تھے۔ اور ایسا کون سخنور ہے جو ان اساتذہ کی اتباع کو باعث فخر نہ سمجھتا ہو؟ ؎

اے وفا شیفتۂ غالب و مومن ہوں میں
میں نے کچھ رنگ اڑایا ہے غزل خوانی کا

وفا مرحوم ایک متبحر عالم اور فاضل طبیب تھے۔ سخنور ازل نے طبیعت بھی نکتہ سنج عطا کی تھی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے جو "کلیات وفا" کی صورت میں اسوقت ہمارے پیش نظر ہے۔ ان کو گستاخانہ و مبتذل کلام پسند نہ تھا۔ زبان و اصول زبان پر عبور حاصل تھا، فن شعر گوئی سے بخوبی واقف تھے۔ صرف اردو ہی پر نہیں بلکہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے چنانچہ "کلیات وفا" میں فارسی کلام بھی شامل ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات وغیرہ اصناف سخن موجود ہیں۔

کلام وفا میں اگرچہ انتخاب کی گنجائش ہے کیونکہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں کوئی کیفیت نہیں لیکن کلام کا بیشتر حصہ پُرلطف و سرور انگیز ہے۔ خصوصاً غالب کی تقلید میں جو کچھ کہا ہے وہ بہت خوب ہے ؎

یارب وہ داغ دے کہ تمنا کہیں جسے
رشک ہزار نقش سویدا کہیں جسے

کس سے کہوں کہ لاکھ امیدیں مٹا گئی
وہ ایک بات رنجش بیجا کہیں جسے

ناچار اس خیال پہ جینا پڑا مجھے
امید سوز حوصلہ فرسا کہیں جسے

حیرت نے امتیاز کے پردے اٹھا دئے
فرصت طلب ہوں شوخیٔ برق نگاہ سے

آیا ہے بحر ناز میں طوفان دلبری
کیا تموج حسن اٹھی ہے طرف کلاہ سے

عجز گدا کی ہمت عالی کو دیکھنا
لیٹا ہے بازوئے کرم بادشاہ سے

خیال اب کسی پہلو سے کامیاب نہیں — مجھے اجل سے بھی اُمید انقلاب نہیں
دعائیں جینے کی دیتے ہیں کس محبت سے — سمجھ لیا ہے کہ مرنے کی ہمیں تاب نہیں
عدم میں درد کا پہلو کوئی نہیں نکلا — مجھے وہ راحت آغوشِ اضطراب نہیں
وفا تباہیٔ دنیا فلاحِ عقبیٰ ہے
خراب ہے مری حالت مگر خراب نہیں

یہ چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر نقل کئے گئے ہیں ورنہ "کلیاتِ وفا" میں اہلِ سخن کی دل بستگی کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ نیز فارسی کلام بھی لطف سے خالی نہیں۔ ؎

گلچین آہ از چمنم کامیاب بود — لختِ جگر گُلِ سبدِ اضطراب بود
شوخی ببیں کہ جلوہ بدستِ شباب بود — عکسیں نگر کہ آئینہ اندر نقاب بود
از بہرِ ماست گرمیٔ ہنگامۂ جزا — در پردہ پرسشِ دل خانہ خراب بود
در پردہ ہائے چشم عجب نقش بستہ است — دل کارنامۂ نگہ بے حجاب بود
در جوئے اُمید وفا خاک ساز زند
سیراب لے وفا بہ نگاہم سراب بود

دیال باغ (انگریزی) ہندوستان کے جدید مذاہب میں رادھا سوامی مت بھی ہے جس کے ماننے والوں کی تعداد برابر ترقی کر رہی ہے۔ اس مذہب کے بنیادی اُصول پرماتما کی ہستی کو ماننا، اسکو واحد الوجود جاننا اور حیات بعد ممات پر یقین رکھنا ہیں۔ مورتی پوجا اور دوسرے مراسم اس مذہب میں نہیں ہیں چھوت چھات بھی اسکے دائرہ سے خارج ہے۔ اور ہندو مذہب کی جتنی شاخیں ہیں اُن میں سے ہر ملت کا شخص جو مذکورہ بالا اصول پر اعتقاد رکھ سکے اس مذہب میں داخل ہو سکتا ہے۔ شادی کے معاملہ میں بھی انتہائی آزادی حاصل ہے یعنی "سول میرج" قانون کے مطابق شادی ہوتی ہے۔ غرض برھمو سماج کی طرح اس مذہب میں بھی آزاد خیالی اور خدا پرستی کو یکجا کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔

اس عقیدہ کے بانی سری سوامی جی مہاراج نے ۲۴۔ اگست ۱۸۱۸ء کو آگرہ میں جنم لیا تھا اور ۱۸۶۱ء میں اپنے عقیدہ کی تبلیغ کے واسطے رادھا سوامی ست سنگ کی بنیاد ڈالی تھی۔ سوامی جی مہاراج کے بعد اُنکے جانشینوں نے ست سنگیوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دئے مگر ایک مدت تک ست سنگ مختلف مقامات پر تبدیل ہوتا رہا۔ آخر ۱۹۱۰ء میں اسکو ایک مرکزی حیثیت دینے کی تجویز کی گئی اور ۱۹۱۳ء میں دیال باغ

کے نام سے آگرہ میں ایک نئی آبادی قائم کی گئی جو چند سال کی مدت میں کافی ترقی کر چکی ہے ۔ انٹرمیڈیٹ کالج دستکاری کا اسکول۔ نسوانی مدرسہ، شفاخانہ، بینک وغیرہ کی شاندار عمارتیں لاکھوں روپیہ کے صرف سے طیار ہو چکی ہیں اور رادھا سوامی عقیدہ کے ماننے والوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ عوام الناس کی بہبودی کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ اس پمفلٹ میں رادھا سوامی مذہب اور ست سنگ وغیرہ کے متعلق تمام ضروری باتیں درج ہیں گورو مہاراج صاحبان اور عمارتوں کی تصاویر بھی ہیں۔ شائقین آنریری سکریٹری، رادھا سوامی ست سنگ۔ دیال باغ۔ آگرہ سے اسکو طلب کریں۔ جو غالبًا بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

فیضان شوق

از حضرت شوق قدوائی لکھنوی مرحوم ۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ضخامت ۲۲۸ صفحات کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت ۱۲؍ ۔ ملنے کا پتہ :۔ خان بہادر شیخ رضی الدین احمد بیرسٹرایٹ لا۔ گونڈہ۔

حضرت شوق قدوائی اُردو زبان کے ایک مستند و کہنہ مشق سخنور تھے۔ انسانی جذبات خصوصًا صنف نازک کے واردات قلبی کی ترجمانی کرنے میں اُن کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ متعدد مثنویاں، منظوم ڈرامے اور نظمیں اس حقیقت کی بیّن دلیل ہیں کہ شوق صاحب کو عورتوں کی پیاری زبان اور محاورات پر کافی عبور تھا اور اُن کے جذبات کی مصوّری کچھ اس انداز سے کی ہے کہ اس سے بہتر صورت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے چنانچہ ترانۂ شوق۔ قاسم و زہرہ۔ رشید و امینہ وغیرہ اسکی شاہد ہیں اور عالم خیال تو ایک ایسی نظم ہے جسکو شوق صاحب کا ماسٹر پیس کہا جا سکتا ہے۔

شوق صاحب شعرائے متاخرین کے دیکھنے والوں میں سے تھے۔ حضرت امیر لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ جناب امیر مینائی اور حضرت تسلیم کی صحبت میں رہکر بہت کچھ حاصل کیا تھا، اور انھیں بزرگوں کا اتباع کرتے تھے۔ اس لئے اگرچہ اُن کی نظموں میں ایک خاص جدّت، شوخی اور دلکشی ہے مگر غزل گوئی میں وہ قدما ہی کی پیروی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "دیوان شوق" میں جو اسوقت ہمارے سامنے ہے، لکھنؤ کے روزمرّہ، محاورات اور لطف زبان کے سوا کوئی خاص کیفیت نہیں بلکہ وہی باتیں ہیں جو اگلے زمانہ کے سخنوروں کے یہاں عمومًا پائی جاتی ہیں۔

دیوان ہذا کے مقدمہ سے ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمانے کے بعد ناظرین خود اندازہ کر سکیں گے، کہ غزل گوئی میں شوق صاحب کا انداز بیان کیا ہے۔

"دیوان کا اگر محض اس اُمید پر مطالعہ کیجئے کہ اس میں طبیعت کو پھڑکا دینے والے اشعار زیادہ ملیں گے اور جو غزل ہوگی دلکشی اور مقبول عام بننے کی صلاحیت رکھتی ہوگی تو یقینًا مایوسی ہوگی اور

اگر محض مندرجات دیوان ہی مصنف کی جولانی طبع شاعرانہ قوت، پرگوئی اور ساحرانہ کمال کو قیاس کیجئے گا تو اُنکے بارہ میں جو رائے قائم ہوگی تمام تر صحیح نہ ہوگی۔"

"اس حصۂ کلام (غزلیات) کا پایہ اپنی عام شعریت کے لحاظ سے اُنکے دوسرے اجزائے کلام کے دیکھتے ہوئے بعض اوقات بہت گرا ہوا پایا جائیگا لیکن پھر بھی مشاقی اور فنی قابلیت کو بدرجۂ اتم ظاہر کرتا ہے .... صدہا اشعار محض الفاظ وغیرہ کی تحقیقات کو محفوظ کرکے قلمبند کئے گئے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات اس کوشش میں اشعار کی شعریت زائل ہوگئی ہے اور جا بجا فصاحت کا دامن بھی ہاتھ سے جاتا رہاہے۔"

اسکے بعد شوق صاحب کی غزلوں کے متعلق مزید رائے زنی کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ صرف چند اشعار بلا انتخاب نمونہ کے طور پر پیش کرنا کافی ہوگا۔

مدد کو ہجر میں دل یا جگر نہیں آتا　　اُغل بغل مجھے کوئی نظر نہیں آتا
کہاں یہ ہوش جنوں میں کہ اسکا گھر پاؤں　　مرے خیال میں اپنا ہی گھر نہیں آتا
طبیب عشق یہ کہتا ہے ہجر کی تپ کو　　کہ چڑھ تو آتا ہے اسکو اُتر نہیں آتا
مروں جو حسن پہ کوئی حسین مرنے دے　　نہیں تو یوں مجھے بیکار مر نہیں آتا
خزاں میں گُل نہیں ملتا اگر چڑھانے کو　　قدم بھی کیا تمہیں تربت پہ دھر نہیں آتا
نہ پوچھو حال مرے دل کا تم کہ آنکھوں سے　　سوا لہو کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا
بگڑکے شکل ڈرانی ہوئی ہے کچھ ایسی،　　کہ رنگ چہرۂ غمناک پر نہیں آتا
شبیں تو سینکڑوں آتی ہیں میرے گھر لیکن　　شب فراق کا پچھلا پہر نہیں آتا

کھڑے ہیں شوق سب اُسکی محل کی دیواریں ؎
تو کیا یہاں کوئی شوریدہ سر نہیں آتا ؎

میں مجنوں کو مجنوں مجھے جانتا ہے　　ولی کو ولی خوب پہچانتا ہے،
نہ مانے وہ لیکن محبت ہے مجھکو　　نہ جانے وہ لیکن خدا جانتا ہے
ہوئی اتنی الفت کسی کو کسی سے　　کہ دیکھا نہیں اور پہچانتا ہے
میں کس دل سے الفت جتانیکو جاؤں　　وہ بے رحم کب دل کو دل جانتا ہے"
بڑا ہی سڑی ہوگیا شوق اب تو　　بہت خاک گلیوں کی وہ چھانتا ہے

عربوں کا تمدن

مترجمۂ سید نذیر نیازی بی۔ اے۔ (جامعہ) ضخامت ۱۹۴ صفحات قیمت ۶/ر
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرول باغ۔ دہلی

یہ ڈاکٹر جوزف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی (جرمنی) کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ اسمیں مسائل تمدن کے متعلق فلسفیانہ مباحث نہیں ہیں اور نہ کوئی ایسی بات ہے جو تمدن عرب کے متعلق معلومات میں اضافہ کا موجب ہو سکے۔ تاہم عربی تمدن کے متعلق جسقدر مواد فراہم ہو سکا اسکو صاف و سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے اور اسلام سے قبل عرب کے تمدن کی جو حالت تھی اسکو بیان کرنے کے بعد پیغمبر اسلام۔ اسلامی فتوحات۔ اندلس اور شمالی افریقہ وغیرہ کے حالات تحریر کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ہیل نے اکثر باتیں عام مستشرقین کے انداز میں ہی لکھی ہیں مگر مجموعی حیثیت سے پوری کتاب ایک غیر مسلم عالم کی وسیع الخیالی کا مرقع ہے۔ اصل واقعات کے خلاف جو باتیں مصنف نے بیان کی ہیں انکی تردید و تصحیح مترجم نے حاشیہ پر کردی ہے نیز آخر میں ایک ضمیمہ شامل کرکے اکثر تشریح طلب واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ غرض اسلام سے قبل و بعد از اسلام عربوں کے تمدن کے متعلق یہ ایک عمدہ کتاب ہے، اہل اسلام کے علاوہ عام شائقین بھی اسکے مطالعہ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

مطلع الانوار (فارسی)

مصنفۂ حضرت امیر خسرو۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ حجم ۲۳۸ صفحات قیمت ۸/ر
ملنے کا پتہ:۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

حضرت امیر خسرو دہلوی جنکے متعلق ایک طولانی مضمون حال ہی میں زمانہ میں شائع ہو چکا ہے، ایک بلند پایہ صوفی ہونے کے ساتھ ہی اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز و سخنور بھی تھے، کون شخص ہے جو آپکے نام نامی سے واقف اور آپکے کمال فن کا معترف نہیں ہے۔ "خمسۂ نظامی" کے جواب میں دوسرے اہل سخن کی طرح آپنے بھی پانچ مثنویاں تصنیف کی تھیں، اُن ہی میں سے ایک یہ ہے جسکو مولوی مقتدیٰ خانصاحب شروانی نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تصحیح کرکے شائع کیا ہے۔

"کلیات خسرو" کی اشاعت کے لئے ۱۹۱۴ء سے علی گڑھ میں ایک انجمن قائم ہے اور اسوقت تک متعدد کتابیں اس سلسلہ کی طبع ہو چکی ہیں۔ پیش نظر مثنوی مفید عام اخلاقی اور تصوف و معرفت کے مضامین پر مشتمل ہے۔ زبان سادہ اور انداز بیان شیریں و دلکش ہے۔ جو حضرات فارسی زبان کا مذاق رکھتے ہوں اُن کو یہ مثنوی ضرور پڑھنی چاہئے۔

تاریخ الامت - (حصہ ششم)

مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری۔ حجم ۳۱۲ صفحات۔ قیمت عہ
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرول باغ دہلی،

"تاریخ الامت" اسلامی تاریخ کا ایک بہترین سلسلہ ہے جسکو خصوصیت سے طلباء نیز عام شائقین کے مطالعہ کے واسطے مولانا محمد اسلم صاحب پروفیسر تاریخ اسلام جامعہ ملیہ نے مرتب کیا ہے۔ اس سلسلہ کے پانچ حصہ اب سے پہلے شائع ہوکر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ اس حصہ میں "مصری خلافت عباسیہ" کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اور طوفان نوح کے بعد سے اسوقت تک کی مجمل تاریخ لکھی ہے جب کہ خلافت عباسیہ آل عثمان کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی، پوری کتاب حقیقی بصیرانہ و مورخانہ انداز تحریر کا ایک دلکش مرقع ہے۔
مسلمانوں کے علاوہ جو حضرات اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہوں اُنکے واسطے بھی اسکا مطالعہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔

رام چرچا۔

از منشی پریم چند، بی۔ اے۔ چھوٹی تقطیع۔ حجم ۲۴۹ صفحات۔ سرورق رنگین و مصوّر
ملنے کا پتہ۔ لاجپت رائے اینڈ سنز۔ بک سیلرز۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور

ہمارے دوست پریم چند صاحب نے یوں تو اردو زبان کو اپنی بے نظیر تصانیف سے مالامال کر دیا ہے لیکن انکی یہ کتاب خاص طور پر بچوں کے پڑھنے کے واسطے لکھی گئی ہے اسکی زبان خاص طور پر سلیس و سادہ ہے۔ طرز بیان ایسا ہے کہ رامائن کے تمام واقعات ننھے ننھے بچے بھی اسے پڑھکر ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ "رام چرچا" میں مریادا پرشوتم سری رامچندر جی مہاراج کی لاثانی زندگی کے پورے حالات اور واقعات قلم بند کئے ہیں۔ پیدائش۔ شادی۔ بن باس۔ سیتا جی کا ہر جانا۔ لنکا پر حملہ۔ اجودھیا میں واپسی۔ بھرت ملاپ۔ سیتا جی کا بن باس وغیرہ۔ تمام واقعات نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں بچوں کے علاوہ کم استعداد اصحاب اور عورتوں کے لئے بھی اسکا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

رسید کتب

سلیم - از مسٹر محمد امیر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ متصل دیوان ڈیوڑھی۔ اورنگ آباد۔ قیمت عہ
بجلی کی کتاب - از مسٹر محمد سبحان اللہ۔ قیمت عہ پبلیشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور۔
اسرار شریانیہ - از حکیم محمد عبدالوہاب انصاری۔ جامع مسجد دہلی قیمت ملے،
سوانح عمری بابا ست رام - (انگریزی) از بابو پال گوبند۔ قیمت عہ

ترانۂ گنہگار

از جناب آنند نرائن ملا صاحب ایم اے ایل ایل بی

فطرت ناشکیب ہوں، خاطر بیقرار ہوں — روح پُر اضطراب ہوں، دیدۂ اشکبار ہوں
کشتۂ آرزو ہوں میں، محوِ تلاشِ یار ہوں — سینۂ ریش ریش ہوں، دامن تار تار ہوں
روزِ ازل سے طالبِ جلوۂ آشکار ہوں

ہوں شہید جستجو، تاب دوام مجھسے ہے — خندۂ صبح مجھسے ہے، گریۂ شام مجھسے ہے
محفل روزگار کا حسنِ نظام مجھسے ہے — لطف صراحی و مے و شیشہ و جام مجھسے ہے
میکدۂ حیات میں کیفیت خمار ہوں

اہلِ طرب کے واسطے بزم نشاط خیز ہوں — طالبِ زخم کے لئے معرکۂ ستیز ہوں
میں ہوں کبھی شرر فشاں اور کبھی مشکبیز ہوں — گاہ میں فتنہ خیز ہوں۔ گاہ میں نغمہ ریز ہوں
سیلِ رواں ہوں دشت میں باغ میں جوئبار ہوں

مجھ کو نہ دیر سے غرض اور نہ کچھ حرم سے کار — میری حیات سے مراد ایک ہے بس تلاش یار
میری اُمید و بیم کا اپنے ہی دل پہ ہے مدار — میں ہوں نہ طالبِ بہشت اور نہ خائفِ مزار
نے میں زمیں کا بوجھ ہوں نے میں فلک کا بار ہوں

میری نظر وسیع ہے۔ میرا خیال ہے بلند — خاطرِ ناصبور کو خوفِ مآل ناپسند،
نوشتۂ چشم میں نہاں صورت اشک تا بچند — چڑھکے مژہ پہ ایکبار دیکھ لوں سب کشاد و بند،
یا تو سپرد خاک ہوں۔ یا دُر شاہوار ہوں

مجھ میں نہاں ترا وجود۔ مجھسے عیاں ترا ظہور — عکس سیاہ میں ترا۔ تو ہے مرا جمال نور
میری نظر پہ کس لئے ہے یہ حجاب نزد و دور — ایک نہ ایک روز میں اسکو اُٹھاؤں گا ضرور
چشم پُر آرزو پسِ پردۂ انتظار ہوں

ختم بس اک اڑان پر میری رہِ سفر نہیں — موت مرے لئے بجز ریزش بال و پر نہیں

نورِ سحر کو ظلمتِ شام سے کچھ خطر نہیں　　میری فنا فنا نہیں۔ مجھ کو خزاں کا ڈر نہیں
گلشنِ کائنات میں قافلۂ بہار ہوں

مجھکو ہے دل سے ڈر یہی شوق وصال دیکھکر　　تاب نہ لاسکیگا یہ شکل خیال دیکھکر
میری شکست ہے ضرور نورِ جمال دیکھکر　　آپ لرز رہا ہوں میں اپنا مآل دیکھکر
ابرِ سیاہ کی مثال برسرِ کوہسار ہوں

مجھکو نہیں خطا کی شرم سامنے تیرے اے خدا　　میں ہوں تیری شبیہہ اک۔ اسکو بگاڑ یا بنا
میرے لئے یہ ننگ ہے ڈھونڈوں کسی کا آسرا　　میں ہوں نہ پیروِ مسیحؑ اور نہ مُریدِ مصطفاؐ
اپنے ہی دوش پر لئے اپنے گنہ کا بار ہوں

لذت درد کون دے لطف وصال کے لئے　　میں نے تو چھوڑ دی بہشت تاب خیال کیلئے
روح مری ہے مضطرب اپنے جمال کے لئے　　جلوۂ دوجہاں ہے کم چشم سوال کے لئے
آرزوئے کلیمؑ کی دہر میں یادگار ہوں

نقش برآب ہوں مگر عشق کا رازدار ہوں　　ہوں تو ذرا سی مشتِ خاک برق سے ہمکنار ہوں
تو بھی بجھا نہ پائیگا جسکو میں وہ شرار ہوں　　ہستیٔ بے ثبات ہوں، جلوۂ پائدار ہوں
جسمیں ہے شان کردگار میں وہ گناہگار ہوں

جگر پارے

از بابو شیام موہن لال جگر بی۔ اے۔ بریلوی

ماجرا میری زندگانی کا　　راز ہے ان کی بدگمانی کا
وہ سمایا ہوا ہے رگ رگ میں　　فیض ہے یہ غم نہانی کا
زندگی کیا ہے اک فسانۂ غم　　موت اک خواب زندگانی کا
کرتے دیکھا انھیں مگس رانی　　زعم تھا جن کو حکمرانی کا
قطرۂ اشک اک خلاصہ ہے　　میری دنیائے کامرانی کا
چاہیے اس کو ایک عمر جگر
غم اگر کیجئے جوانی کا

خودی

از مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔اے (آکسن)

تو بوئے وفا کی جا ہے رنگ کا شیدائی — میں کیسے کہوں تجھکو ہے حُسن شناسائی
لے دردِ دلِ مضطر درماں کی توقع کیا — دنیا میں مسیحا کون اور کسکی مسیحائی
انجام ہر اک شے کا ہے وقفِ فنا ہونا — دنیا میں بشر ہو کیوں پھر محوِ خود آرائی
اوروں کی محبت کا کیوں بھرتا ہو دم انساں — وہ اپنے پہ ہے مفتوں وہ اپنا ہے شیدائی
کیا لطف ہے جینے کا ہستی کا مزا کیسا؟ — جب آئے جہاں میں ہم تو ساتھ قضا آئی
ہستی تو بھلا کیا ہے تربت کا نشاں تک بھی — ٹھوکر سے مٹا دیگی افلاک کی کجرائی
عاشق تو بنا ہے تو پر دیکھ سنبھل کر چل — انجامِ رہِ الفت ہے ذلت و رسوائی
تو چشمِ بصیرت سے یہ نور حقیقی دیکھ — کیوں عشق میں دنیا کے تو ہو گیا سودائی
دو دن میں اجل آ کر کر دے گی فنا تجھکو — کب تک یہ خودی کی لَو کب تک یہ منی مائی
عاشق ہو اگر صادق قسمت کا گلہ مت کر — ہے طرزِ ستم بھی اک معشوق کی رعنائی
کس چین سے بیٹھے تھے گوشے میں عدم کے ہم — رسوا ہمیں کرنے کو تقدیر اٹھا لائی

ناشاد مجھے کب ہے انکار اطاعت سے
منت کشِ درباں ہوں، ہو فکر جبیں سائی

رنگیں تر است قصۂ دل خوں شدن زگل — لیکن بپاس خاطر دلبر نہ گفتہ ام
نامحرم است خضر بجائے کہ مے روم — نام مقام دوست بہ رہبر نہ گفتہ ام
سودا برائے جرعۂ آبے دریں دیار،
ہرگز بخضر ہم چو سکندر نگفتہ ام

سودا

ترانۂ وطن

از جناب محمود اسرائیلی

گو فتنۂ و فساد سے مسموم ہے فضا، — اک حشر ہے بپا
اے ہند پھر بھی کیسے کہوں تجھ کو میں بُرا — تو ہے وطن مرا
مانا کہ اپنے تیر کا تو خود نشانہ ہے — ننگ زمانہ ہے
لیکن مجھے عزیز ہے تیری ہر اک ادا — تو ہے وطن مرا
ہر موج آب ہے تیری شمشیر تشنہ کام — جنبش میں صبح و شام
تیری خوشی یہی ہے تو کر دے مجھے فنا — تو ہے وطن مرا
کب تک رہینگی تجھ میں ہیہا نہ یہ صفات — اے رشک کائنات
تجھ کو تو خوئے لطف سے ہونا تھا آشنا — تو ہے وطن مرا
موجوں کے اضطراب سے پیدا ہوا تو جوش — اے قلزم خموش
ہے مژدۂ حیات تیرا دور ابتلا — تو ہے وطن مرا
تاریکیوں میں جلوۂ مقصد کا ہے ظہور — چھننے لگا ہے نور
مشرق کے آفتاب! درخشانیاں دکھا — تو ہے وطن مرا

دارم من آشنائے کز روز آشنائی — ہر گہ دو چار گشتم پرسیدم از کجائی
اُمید وصل جاناں این طالعم نباشد — عمرم رسید پایاں در بخت آزمائی

دیر و حرم بعالم فانوس یک چراغ اند
بہر درے کہ آئی پروانہ وش در آئی

سودا

غریب کی آرزو

از پنڈت اندر جیت شرما چھرہ ضلع میرٹھ

مفلسی نے مجھکو رکھا کبر و نخوت سے بری　　ٹھیک ہے مولا مرے جو تو نے مجھکو دیدیا
خاکساروں کو نہیں ہے نیچے گرنے کا خطر　　عاجزوں کے واسطے بنتا ہے تو خود رہنما

راستبازوں پر برقرار رہتا ہے ظلِ عاطفت　　راستی کر دی عطا یہ ہے مرے دل کو لگی
مال و زر کا زندگی میں رہتا ہے گردن پہ بار　　یا الٰہی ہے مجھے درکار روحانی خوشی

(ترجمہ از انگریزی)

بیانِ ہستی

از منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی

ایک ایک سے کہتی ہے زبانِ ہستی　　بے کار ہیں سب نام و نشانِ ہستی
سودا نہ ہو سودا نہ کرو اے بسمل　　بڑھ جائے گی اک روز دوکانِ ہستی

کیا تذکرۂ وہم و گمانِ ہستی　　مٹ جائیگا اک روز نشانِ ہستی
مٹی کا گھروندا اسے سمجھو بسمل　　ذرّوں سے بنا ہے یہ مکانِ ہستی

کرتا ہوں بیاں سُنئے بیانِ ہستی　　کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں شانِ ہستی
اِس سانس کی بنیاد ہی کیا اے بسمل　　کندھے پہ ہوا کے ہے مکانِ ہستی

معلوم بھی ہے کچھ تمہیں شانِ ہستی　　تم کس لئے سُنتے ہو بیانِ ہستی
رُکنے کا نہیں تیرِ قضا اے بسمل　　ٹوٹے گی کبھی جُھک کے کمانِ ہستی

لطفِ سخن

حضرت آرزو لکھنوی

جیسی جسکی طینت ہو گی ویسا ہی سکوتا آئیگا
داغی آئینہ جب دیکھو گے دھبا منہ پر آئیگا

دل کہ ہے شیشہ سے نازک تر شوق کی ضدیں سہتا ہے
اُتنی ہی ہمت بڑھجائیگی جتنی چوٹیں کھائیگا

ضبط سے لیں گے کام وہیں تک جتنی ہمکو ضرورت ہو
آہ زباں پر آجائے گی نام نہ لب تک آئیگا

کل نہ سہی دیدار کا وعدہ حشر کے بھی کچھ بعد سہی
جا ہی رہا ہے جاتا زمانہ وہ دن بھی آجائیگا

عشق کی بیتابی ہے نتیجہ حُسن کی بڑھتی شوخی کا
مفت کی بدنامی ہم کیوں لیں خود پردہ اُٹھ جائیگا

خوف میں بدنامی کے جسکو در سے اُٹھائے دیتے ہو
جب وہ پھریگا مارا مارا پھر کس کا کہلائیگا

یا تو لگاوٹ کر کے نہ چھیڑو۔ یا یہ بتا دو پہلے سے
جوشِ دل کا اُبلتا چشمہ کس دنیا میں سمائیگا

وصل کا خواہشمند بنے کیوں حُسن کا سچّا پروانہ
دل سے لگی ہے لاگ تو اکدن خود شعلہ بنجائیگا

وقتِ اجل دریافت کریں وہ پوچھنے جو یہ آئی ہیں
راتوں کی نیند اُڑانے والے چین تجھے کب آئیگا

پردہ نے بیتاب کیا تھا جلوہ نے بیہوش کیا
آرزو وارفتہ طبیعت آپ میں اب کیا آئے گا

جناب فرخ بنارسی

درد کا عیش پسندوں کو جو عرفاں ہو جائے
خندۂ گل سبق آموز گلستاں ہو جائے

بے حجاب آج اگر جلوۂ جاناں ہو جائے
پرتوِ حسن میں گم عالم امکاں ہو جائے

سازِ ہستی مرا پھر مائل خاموشی ہے
یاس و اُمید میں اب پھر کوئی پیماں ہو جائے

یہ بڑی بات ہے عصیاں کی تلافی کے لئے
کہ گنہگار خطا کر کے پشیماں ہو جائے

ماتمِ عشق میں کھل جائیں اگر گیسوئے حُسن
ابھی شیرازۂ کونین پریشاں ہو جائے

آئیں بے پردہ نظر حسن ازل کے جلوے
اپنی ہستی کی حقیقت کا جو عرفاں ہو جائے

منحصر خندۂ گل ہی پہ نہیں جوشِ بہار
دل شگفتہ ہو تو ہر خار گلستاں ہو جائے

میری ہستی ہے اک اسرارِ حقیقت کا حجاب اُٹھے یہ پردہ تو سب رازِ نمایاں ہوجائے
تو جو چاہے تو بنے داغِ گنہ حسنِ عمل تیرگی کفر کی خالِ رخِ ایماں ہوجائے
یہ اثر ہم نے محبت ہی میں دیکھا فوتخ
آپ ہی درد بنے آپ ہی درماں ہوجائے

جناب جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی

شعلۂ عشق تھا نہاں جلوۂ جاں گداز میں آگ لگا دی حسن نے دل کے شکستہ ساز میں
خرمنِ ہوش جل گیا ایک ادا کے ناز میں مستیاں برق پاش تھیں دیدۂ نیم باز میں
رازِ تجلیٔ ازل کھل نہ سکا کسی طرح جلوے تڑپ کے رہ گئے دیدۂ امتیاز میں
ایک ہی تیر میں بندھا دل بھی ہے اور جگر بھی ہے تو بھی کس بلا کا تھا ان کے خدنگ ناز میں
تلخیٔ ضبط سے ملا جذبۂ عشق کو فروغ
دیکھا ہے طولِ روزِ حشر غم کی شبِ دراز میں

جناب سید احمد اثر بانسوی

رہا ہے بسملوں کے لب پہ شورِ الاماں برسوں بہا ہے کوچۂ قاتل میں خونِ کشتگاں برسوں
مرادِ شمن رہا صحنِ چمن میں باغباں برسوں نگاہِ برق میں کھٹکا ہے خارِ آشیاں برسوں
کچھ آساں کام ہکا نا نہیں اُس رند کو واعظ رہا ہو جو شریکِ حلقۂ پیرِ مغاں برسوں
نہ پاتا تھا پتہ شاخِ نشیمن کا نہیں پایا چمن میں برق لیکر لاکھ ڈھونڈھا آشیاں برسوں
اثر کیا پوچھنا اُس بت کی شانِ بے نیازی کا
رہا ہو سجدہ گاہِ خلق جسکا آستاں برسوں

از مسٹر منوہر لعل طالب بی۔ اے (آنرز) ایل ایل بی وکیل جکوال

سمجھتا ہوں کہ کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا مقدر میں نہ ہو کوشش تو پھر کوشش کروں کیسے؟
نہ جینے کا مزا جب ہو تو مرنے ہی کی ٹھنتی ہے نہ ہو جب موت پر قابو، تو بن آئی مروں کیسے؟
سمجھ رکھا ہے شاید گلشنِ بے باغباں بھارت جو گلچیں کہہ رہا ہے اور دامن کو بھروں کیسے؟

مقدّر ساز پر الزام دینے کی تمنّا ہے
خدا والوں سے ڈرتا ہوں کہ میں ایسا کروں کیسے؟

کسی کو فکر جینے کی، کسی کو شوق مرنے کا
یہ دُھن اُسکو جیوں کیسے یہ وہم اُسکو مروں کیسے؟

قفس میں پر بُریدہ، رشتہ بر پا بہر بر لب ہوں
چمن کے واسطے چاہوں تو میں ظالم مروں کیسے؟

بابو ہریش چند رضیا بی-اے-دیوانند پوری

نہ نکلی بزمِ جہاں میں قیام کی صورت
ہمارے بخت میں گردش تھی جام کی صورت

دُعا نکلتی ہے صُبحِ شبِ فراق یہی
خدا دکھائے نہ اب مجھ کو شام کی صورت

بہارِ گُل میں مجھے کیوں ملے نہ کیفِ شراب
ہر ایک پھُول چمن میں ہے جام کی صورت

نگاہِ خاص رہے اپنے جاں نثاروں پر
وہ لطف کیا ہے جو ہو لطف عام کی صورت

زمانہ ہوگیا توبہ کیے مجھے لیکن،
نظر میں پھرتی ہے ابتک وہ جام کی صورت

جناب سکھ دیو پرشاد سنہا۔ بسمل الہ آبادی

وہ کسی پردہ دار کا عالم،
نگہہ شرمسار کا عالم،

دیکھ لیتا ہوں میں خزاں میں بھی
گئی گذری بہار کا عالم،

نا اُمیدی بھی دیکھ لے آ کر،
دلِ اُمیدوار کا عالم،

سو طرح کے کھلے چمن میں پھوُل
رنگ لایا بہار کا عالم،

رات بھر وہ سرورِ بادہ کشی،
صُبح دم یہ خمار کا عالم،

ایک حالت پہ رہ نہیں سکتا،
گردشِ روزگار کا عالم،

خوب رو ہیں کہ پھول قدرت کے
حُسن ہے یا بہار کا عالم،

میں کہاں اب وہ لطفِ باغ کہاں
یاد ہے بس بہار کا عالم،

لوٹ جائے گا دیکھ کر قاتل،
بسملِ جاں نثار کا عالم،

علمی خبریں اور نوٹ

گذشتہ صدی میں یورپ کی مختلف زبانوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے خصوصاً انگریزی زبان کو تو اسقدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ شائد اسوقت دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اسکے جاننے والے کافی تعداد میں موجود نہ ہوں ذیل کے اعداد وشمار سے مختلف یورپین زبانوں کی ترقی کا حال ظاہر ہوگا

نام زبان	ایک صدی قبل بولنے والوں کی تعداد	آجکل کسقدر آدمی بولتے ہیں	سمجھنے والوں کی تعداد
انگریزی	تقریباً دو کروڑ	تقریباً سولہ کروڑ	ہر ملک میں سمجھی جاتی ہے
جرمنی	" تین کروڑ بیس لاکھ	" نو کروڑ	تقریباً دو کروڑ
فرانسیسی	" تین کروڑ چوبیس لاکھ	" چار کروڑ پچاس لاکھ	پچھتر ہزار
اسپینش (اسپانوی)	" تین کروڑ بادن لاکھ	" پانچ کروڑ	....
لاطینی	" دو کروڑ چودہ لاکھ	" چار کروڑ اکیاون لاکھ	....
ڈچ	" تریسٹھ لاکھ	" پچھتر لاکھ	....
سویس (سویڈن کی زبان)	" بتیس لاکھ	" " "	....
ڈینش	" اکیس لاکھ	" ساٹھ لاکھ	....

پچھلے سو سال کے اندر ترکی زبان کو غیر معمولی طور پر زوال ہوا ہے۔ اب سے سو سال پہلے تقریباً تین کروڑ آدمی ترکی بولتے تھے مگر آجکل انکی تعداد دو کروڑ چالیس لاکھ کے قریب ہے۔

مسٹر کالی داس ساہنی، ایم۔ ایس۔ سی، اُن مایۂ ناز فرزندان وطن میں سے ہیں جو اپنی علمی و عملی جد وجہد کے سبب سے بیرون ہند میں بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ آپنے حکومت عراق کے محکمۂ زراعت میں روئی کی کاشت کے شعبہ کے افسر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور آپکی کوشش بلیغ سے اس شعبہ میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اس سے متاثر ہوکر حال میں ریاست حیدر آباد (دکن) نے ساہنی صاحب کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔

عراق سے روانگی کے وقت ساہنی صاحب کو متعدد الوداعی دعوتیں دی گئیں- اس سلسلہ میں اپریل ۱۹۲۹ء میں خانصاحب عبداللطیف خاں نے بھی سروے ڈپارٹمنٹ بغداد میں ایک شاندار پارٹی دی تھی، جسمیں حسن اتفاق سے ہمارے محترم دوست سید سجاد حیدر بی- اے- یلدرم بھی شریک تھے سید صاحب کا علمی ذوق بھی ہر وقت انکے ساتھ رہتا ہے- چنانچہ ممدوح نے اس موقعہ پر بھی ایک دلکش قطعہ منظوم پڑھا تھا جو ہم نہایت خوشی کے ساتھ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں-

لہلہانے جب لگا باغِ عراق — صحنِ گل جب ہو گیا صحنِ جناں
ہو گیا ریگِ طلا صحرا کا ریت — بن گیا سیمِ رواں ریگِ رواں
روئی کے گٹھے بنے چاندی کا ڈھیر — ہو گیا فلاح قارونِ زماں
ساہنی سحر آفریں نے پھیر دی — کس کی جانب اپنی ہمت کی عناں؟
باغباں کو باغ سے ہے بے کلی — کس کی الفت اسطرح دامن کشاں!
جذبۂ الفت سے ہو کر مضطرب — یہ ترا فرزند محبوبِ زماں
تیری خدمت کیلئے آتا ہے اب
ہو مبارک تجھ کو اے ہندوستاں

خدا کرے جو توقعات ساہنی صاحب کے ذات والاصفات کیساتھ قائم ہیں وہ پوری ہو کر رہیں'

مسٹر رام بابو سکسینہ ایم- اے- ایل- ایل- بی- رکن ہندوستانی اکیڈمی نے اُردو ادب کی جو جامع اور قابل قدر تاریخ لکھی تھی، اسکا اُردو ترجمہ لکھنؤ کے فاضل ادیب مرزا محمد عسکری صاحب بی- اے نے کیا ہے' اور ترجمہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ قابل مترجم نے اپنی طرف سے جا بجا متن اور حواشی میں قابل قدر اضافے کر کے اصل کتاب کے محاسن دوبالا کر دیئے ہیں' یہ اُردو ترجمہ جسکی حیثیت بجائے خود ایک اصل تصنیف کی ہو گئی ہے "تاریخ ادب اُردو" کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ میں طبع ہو کر شایع ہو گیا ہے' اسکی قیمت لعہ رکھی گئی ہے مگر اسکی چھپائی حجم اور دلچسپیوں کو دیکھتے ہوئے یہ قیمت کسی طرح زیادہ نہیں کہی جا سکتی ہے- اس اُردو ترجمہ میں مزید دلچسپی کے لئے مشاہیر شعرا اور نامور ادیبوں کی ہاف ٹون تصاویر بھی دیگئی ہیں جن سے اس قابل قدر کتاب کی دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے- بہر نوع یہ کتاب ہر طرح سے قدردانان اُردو کی سرپرستی کی مستحق ہے'

مرزا محمد عسکری صاحب نے "ادبی خطوط مرزا غالب" کا مجموعہ بھی بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب فرمایا ہے جو عنقریب ہی شایع ہونے والا ہے۔

اس صوبے کے قدر دانان علم ادب یہ سنکر خوش ہونگے کہ نامور ادیب مسٹر سچدانند سنہا صاحب (سابق ممبر مال صوبہ بہار) کا مشہور و معروف رسالہ "ہندوستان ریویو" جولائی سے پھر الہ آباد سے ایک ماہوار علمی رسالہ کی صورت میں شایع ہونے لگا ہے۔ ہندوستان ریویو جب شروع میں کایستھ سماچار کے نام سے جاری ہوا تھا۔ تو صوبہ آگرہ و اودھ میں اسکے علاوہ ہندوستانیوں کا صرف ایک ہی اور انگریزی اخبار منشی گنگا پرشاد مرحوم کا "ایڈوکیٹ" لکھنؤ تھا۔ "ہندوستان ریویو" نے اپنے قابل ایڈیٹر کی حسن کوشش سے جلد ہی تمام ملک میں اپنی اعلیٰ قابلیت و جامعیت و حب وطنی کا سکہ دلونمیں بٹھا لیا تھا لیکن جب اسکے فاضل ایڈیٹر پر حکومت کے مالی مشیر کی ذمہ داریاں عائد ہوئیں تو "ہندوستان ریویو" کے انتظام میں اسکے پرانے قدر دانوں کے نقطہ خیال سے ایک دل شکن تبدیلی ہوئی یعنی ماہوار رسالہ کے بجائے یہ سہ ماہی رسالہ کی حیثیت سے کلکتہ سے شایع ہونے لگا مگر جیسے ہی مسٹر سنہا گورنمنٹ ملازمت کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوئے آپنے اس رسالہ کو پھر اپنی پرانی شان پر لانے کا تہیہ کر لیا، اسوقت اس قابل قدر رسالہ کا جولائی نمبر ہمارے سامنے ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نمبر کو دیکھکر آیندہ کے لئے اسکی نسبت بڑی امیدیں قائم ہوتی ہیں خصوصاً جبکہ مسٹر سنہا کو پنڈت پرکاش نرائن سپرو صاحب بیرسٹر اور مسٹر ماتھر جیسے معاونین ملے ہیں۔ "ہندوستان ریویو" کی سالانہ قیمت مبلغ ۷ روپیہ ہے۔ شایقین منیجر ہندوستان ریویو البرٹ روڈ الہ آباد سے طلب فرمائیں۔

منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے نامی پریس کے قدر دان منشی بالک رام صاحب گوہر خوشنویس کے نام سے ناواقف نہونگے۔ نامی پریس کی مستند و معروف مطبوعات دیوان حافظ۔ مسدس حالی وغیرہ سب گوہر صاحب ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، آپ لکھنؤ کے ایک معزز کایستھ خاندان کے رکن تھے، اور مدت العمر سے کانپور کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جہاں آپنے اپنی علمی قابلیت، خوش معاملگی اور وضعداری سے اپنے ہمعصروں میں ایک خاص عزت حاصل کر لی تھی، آپ نے اس طرف کئی ماہ سے اس پیرانہ سالی میں رسالہ زمانہ کی کتابت کا بار اپنے ذمہ لیا تھا، آپکی عمر ستر سال سے متجاوز تھی لیکن اس عمر میں بھی آپکی کتابت نہایت صاف و پختہ ہوتی تھی، اور علمی قابلیت کے وجہ سے آپکی کاپیوں میں شاذ و نادر غلطیاں ہوتی تھیں، جنگ پانی پت کا مضمون جو زمانہ مارچ و اپریل میں شایع ہوا۔ ایسا باریک لکھا ہوا تھا کہ آپکے

سوا کا نمونہ کے کسی کاتب کو اسے لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ افسوس موت نے اس صاحب کمال کو بھی ہم سے چھین لیا۔ آخر شروع اگست میں منشی صاحب نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ منشی بالک رام صاحب کی وفات سے فن خوشنویسی کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ خداوند تعالیٰ منشی صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ اور آپکے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ناظرین زمانہ یہ سنکر خوش ہونگے کہ ایڈیٹر رسالہ ہذا کے دوسرے فرزند مسٹر کشن نرائن نگم ایم۔ اے ایل ایل۔ بی۔ امتحان انڈین سول سروس میں کامیاب ہوکر ستمبر کو دو سال کے پروبیشن کے لئے انگلستان جارہے ہیں۔

اس ماہ پہلی تصویر جو زیب رسالہ کیگئی ہے انگلستان کے نامور مصور آرتھر ہیوز کے فن مصوری کا قابل قدر نمونہ ہے۔ قابل مصور نے اسوقت کا منظر دکھایا ہے جبکہ حضرت آدم و حضرت حوا بحکم رب العالمین باغ جنت کو چھوڑ رہے ہیں۔ انکے چہروں سے دلی پریشانی و پشیمانی ظاہر ہے اور چار فرشتے اپنے نورانی بازو پھیلائے واپسی کا راستہ روکے ہوئے کھڑے ہیں۔ انکی خاموشی اور حضرت آدم و حوا کی پشیمانی کو جس کمال سے اس تصویر میں دکھایا گیا ہے، اسکی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے۔ تصویر میں باغ ارم کا ایک دھندلا سا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے؟

منزل زندگی: یہ تصویر انیسویں صدی کے مشہور انگریزی مصور واٹس (WATTS) کے کمال فن کا بہترین نمونہ ہے بقول باکمال مصور یہ تصویر اسکے معیار ذہنی اور مصوری کا اعلیٰ ترین نقش ہے جسمیں اسنے اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے کہ انسانی زندگی فرشتہ عشق کے سہارے کے بغیر دنیا کی دشوار گذار منزلوں کو جنمیں قدم قدم پر نشیب و فراز ہیں راہ میں آسانی کے ساتھ طے نہیں کرسکتی ہے، محبت ہی اسکے سفر کو سہل بناسکتی ہے ورنہ ہزاروں مشکلات راہ میں ہیں۔ ہاں محبت کی امداد سے انسان اس بلندی تک پہونچ جاتا ہے جہاں خیال بھی مشکل سے پہنچ سکتا ہے۔ اس مرحلے کی مشکلات کا منظر اس مصور نے نہایت کمال کیساتھ ظاہر کیا ہے۔ زندگی اپنی فطری حالت میں برہنہ پا برہنہ سر ہے۔ ایسی صورت میں یہ دنیا کے خارزار کو کسطرح طے کرسکتی تھی لیکن فرشتہ عشق اسے اوج عروج پر لئے جارہا ہے۔ قلب انسانی کے ماہرین بھی اسی حقیقت پر پہونچے ہیں جسکو چابکدست مصور نے اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اس تصویر میں ظاہر کیا ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ۲۱۱

جملہ حقوق محفوظ ہیں

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۳	ستمبر ۱۹۲۹ء	جلد ۵۳

فہرست مضامین

تصاویر:۔ ایاّن، ہمدردی و اُمید۔ منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی۔

۱- اُردو شاعری کی ذہنی تاریخ
از جناب اصغر گونڈوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳۵

۲- نان کوآپریشن پر ایک سرسری نظر
از پنڈت کشن پرشاد کول بی۔ اے ۔ ۔ ۱۴۱

۳- خلجی بغاوت
از مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم اے ایل ایل بی ۔ ۱۴۸

۴- پیغمبر اسلام کا حُسن اخلاق
از مولانا سعید انصاری سابق رفیق "دارالمصنفین" ۱۵۴

۵- وضع اصطلاحات
از جناب "گلزار" حیدرآبادی ۔ ۔ ۔ ۱۵۹

۶- دلاور چور (قصہ)
مترجمہ ڈاکٹر اعظم کریوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۶۳

۷- تنقید کتب
شکر گزار ... مطلع انوار۔ نذر ادب۔ ... منظوم ۔ ۱۷۰
... چند منظوم ... کلیات عارف وغیرہ

۸- بیابن ناگن کالی رات
از معتو نظرت حضرت جوش ملیح آبادی ۔ ۔ ۱۷۵

۹- رباعیات۔
از جناب ریاض خیرآبادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷۹

۱۰- کشمیر کی قومی ندی
از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی بی۔ اے ۔ ۱۷۷

۱۱- عورت
از بابو شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے ۔ ۱۸۱

۱۲- لطف سخن
از حضرات آرزو۔ جگر۔ آہ۔ بسمل ۔ ۔ ۱۸۲
ناشاد۔ ثاقب جالندھری ۔ ۔

۱۳- علمی خبریں اور نوٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۸۵

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

چندہ سالانہ

قیمت ملک غیر سے سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کے لئے ششماہی ...

قیمتیں کم ہوگئی ہیں!

ہم اپنے مال کے خریداروں کو خوشی سے اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے بہت کوششوں کے بعد اپنی مشہور زمانہ لال املی لوئیوں کی قیمتیں کم کردی ہیں۔

یہ لوئیاں اپنی دائمی عمدگی کے باعث ہندوستان بھر میں مشہور ہیں تینتیس سال گذرے جب یہ لوئیاں بننی شروع ہوئی تھیں ۔ اُس وقت یہ سو فیصدی خالص اُون سے طیار کیجاتی تھیں ۔ اور اِن کا یہ وصف آج، اِتنے عرصہ کے بعد بھی اُسی طرح قائم ہے۔

ہر شخص تسلیم کرتا ہے ۔ کہ لال املی لوئیاں دیکھنے میں دلکش ہیں ۔ اور اب جبکہ اِنکی قیمتوں میں تخفیف کردی گئی ہے ۔ وہ خریدنے میں بھی دلکش ہوگئی ہیں۔

LALIMLI
PURE WOOL

لال املی لوئیوں کی قیمتیں

نمبر			طول گز	طول گرہ	عرض گز	عرض گرہ	قیمت روپیہ	قیمت آنہ
نمبر ۳	لوئیاں	(سفید اور رنگین)	۳	–	۱	۸	۸	۰
نمبر ۲۶	"	(" " ")	۲	۱۵	۱	۶	۶	۱۲
نمبر ۲۶	"	(" " ")	۲	۸	۱	۴	۵	۷
نمبر ۱۸۱	"	(" " ")	۲	۱۲	۱	۵	۵	۱۲
نمبر ۳۱۶	"	(" " ")	۲	۱۵	۱	۶	۷	۸
نمبر ۲۶	"	(چارخانہ دار)	۲	۱۵	۱	۶	۷	۳
نمبر ۶۰	"	(سفید اور رنگین)	۳	..	۱	۶	۱۳	۰

نوٹ:۔ اِن لوئیوں کا طول و عرض جو اُوپر بیان کیا گیا ہے اُس میں جھالر کا طول شامل نہیں ہے۔

اِن قیمتوں میں محصول ڈاک کا خرچ بھی شامل ہے

کانپور وولن ملز کمپنی (شاخ برٹش انڈیا کارپوریشن لمیٹڈ) پوسٹ بکس نمبر ۵ کانپور

اپنے شہر کی لال املی ایجنسی میں جاکر نمونے دیکھئے اور پسند فرمائیے ۔ اگر وہاں ایجنسی نہ ہو ۔ تو ہمیں لکھئے ۔ ہم نمونے مفت بھیجدینگے۔



امید — همدردی — ایمان

زمانہ

جلد ۵۳ ستمبر ۱۹۲۹ء نمبر ۳

اُردو شاعری کی ذہنی تاریخ

دہلی اور لکھنؤ اسکول

از جناب اصغر (گونڈوی)

اُردو شاعری کی یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ تنقید و تبصرہ کے نام سے عام طور پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں اُن میں زبان و محاورہ یا علم معانی و بیان کے چند فرسودہ اصولوں کو معیار قرار دیکر داد سخن فہمی دیجاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس طریق بحث میں اسقدر گنجایش ہے کہ موافقت و مخالفت کا کوئی سا پہلو اختیار کر لیجئے اور قیامت تک اس قضیہ کو برابر چلاتے جایئے۔ تنقید شعر کا یہ ایک عام نقص ہے کہ یا تو واہ وا! سبحان اللہ سے آگے بات نہیں بڑھتی یا پھر یہ کہ زبان غلط ہے۔ محاورہ صحیح نہیں۔ ایطا ہے۔ اشد اللہ خیر صلاح۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ابھی ملک میں صحیح تنقید کا مذاق پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے بس یہی حق ملے تو کہیں وہاں پہونچی ہیں جہاں مغربی طرز تنقید کا آوازہ بلند ہو۔ وہاں ترتیب بحث و آہنگ دلیل کے بلاشبہہ تمام عناصر موجود ہیں جو ان موقعوں پر کام میں لائے جاتے ہیں لیکن غضب یہ ہے کہ جن آ... ما علم کی مدد سے بے راہ روی کی گرفتاری عمل میں آتی ہے وہی تمام سائنٹفک اعداد و آلات جمالیات

وبے راہ روی کی حمایت میں بھی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ مغربی علوم وفنون نے ہمارے ہاتھوں میں کارآمد آلات ضرور دیدیئے مگر اُن کے منصفانہ استعمال کا سلیقہ ابھی ہمیں حاصل کرنا باقی ہے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ، جسکے پیش نظر کالرج اور ڈرائڈن وغیرہ کا طرز تنقید ہے اور جس سے یہ اُمید تھی کہ وہ تنقید عالیہ کے زور سے ملک میں صحیح مذاق پھیلائیگا، اسکے ایک حصہ نے تو اُردو شاعری کو قطعاً بیجان وبیکار سمجھ کر بالکل طاق نسیاں کے حوالہ کردیا۔ دوسرا حصہ وہ ہے کہ جسکے مذاق شعر وادب میں رفعت و بلندی کی بجائے ایک قسم کی "سیاسیت" کار فرما ہے۔ وہ اسلاف کے کارناموں کو نمایاں کرنا چاہتا ہے مگر اُسے اخلاف کی بربادی مذاق کی چنداں پروا نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اپنی روایات واعتقادیات کی کل کائنات انھیں شورشوں کی تشہیر پر موقوف ہے۔ اس لئے مغربی طرز کے مسالے لگا لگا کر اسنے ممی تیار کرنا شروع کردیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو شاعری کا بیشتر حصہ ملک کے زمانۂ غفلت وپستی کی ایک افسوسناک یادگار ہے اس لئے اول تو اُسمیں ایسی چیزیں ہی بہت کم ہیں جو سنجیدہ توجہ اور تنقید عالیہ کی حقیقی طور پر مستحق ہوں، اُسپر مذکورہ "ممی نوازیوں" کا انجام یہ ہوا کہ ایک نقاد فن کو جان صاحب کے کلام میں اخلاق وسیاسیات کے گہرے اور غامض مسائل نظر آنے لگے انتہا یہ کہ اُنھوں نے اُس حیاسوز دفتر سے ترک موالات کے اُصول تک ماخوذ ومستنبط کرکے رکھدیئے۔ ایک صاحب کو بے روح چیزوں میں فلسفۂ زندگی کی تڑپ اور لفظ پرستیوں میں دشت ایمن کی مقدس تجلیاں نظر آنے لگیں۔ ممکن ہے کہ یہ پرواز خیال کسی خاص قومی وجماعتی زاویۂ نگاہ سے بہت بڑی زیرکی ودانشمندی ہو لیکن اسکی داد "تنظیم یا سنگٹھن" سے لینا چاہیئے۔ "مذاق صحیح" کو اس مآل اندیشی ومصلحت بینی سے کیا غرض!

بہرصورت تنقیدوں میں اگر صحت رائے اور احساس توازن کا یہی عالم رہا اور غلطیوں اور نافہمیوں کی تائید اسی عاقلانہ طور پر کیگئی اور خاک اُڑا اُڑا کر اسی طرح اندھیر مچایا گیا تو معلوم نہیں کہ حقیقت واصلیت کی صبح جمیل کب تک عام نظروں سے پوشیدہ رہیگی۔

عام طور پر بے خبر انسان اپنی تنگ ومحدود اغراض کے لئے حقیقتوں کو مسخ کرتا اور اصلیتوں کو چھپاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسکے کھوٹے سکے بازار میں اشرفیوں کے مول بکنے لگیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام انسان اپنی بینائیوں سے قطعاً محروم ہوجائیں اور سکۂ قلب کی شناخت کا سلیقہ یک لخت دنیا سے معدوم ہوجائے۔

آج ہم صاف طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ وسعت نظر ورفعت خیال کے ساتھ ساتھ نئے نئے میدانوں کی تلاش وجستجو میں سرگرداں ہے۔ یہ صلاحیت کہیں تو مغربی لٹریچر کے برکات۔ سے عدا

ہوتی ہے اور کہیں غیر صالح ملکی لٹریچر کی بغاوت سے۔ بہرصورت شعر و ادب کی حقیقی عظمتوں کی جانب اُنکی توجہ مائل ہو چکی ہے جسے اب پست ملمّع سازیوں کے زور سے روکا نہیں جا سکتا، یہ کہنا بھی کہ ملک میں مذاقِ تنقید کہیں باہر سے لایا جائیگا قطعاً صحیح نہیں۔ اگر شعر و ادب کا مذاق کسی وجہ سے نکھر رہا ہے تو مذاقِ تنقید بھی اسکے ساتھ ہی غیر ارادی طور سے ترقی کرتا جائیگا۔ شعر کا مفہوم جسوقت تک صرف الفاظ کی ترتیب و تنظیم ہو اسوقت کا مذاق تنقید بھی "لفظ و محاورہ" سے آگے نہیں بڑھا لیکن جس زمانہ میں لوگوں کی نظر خیالات کی تازگی، جذبات کی صحت اور مطالب کی ارواحِ مخفیہ کی جانب بھی مائل ہو چکی ہو اسوقت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ صرف "بولی ٹھولی" اور "زبان و محاورہ" کی سطحی فرمانروائی ختم ہو چکی اور خود ساختہ فن کی ژولیدہ بیانیوں اور کج بحثیوں کی عمریں تمام ہو گئیں۔

اس سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ زبان، محاورہ اور فن کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے اور یہ تمام چیزیں سرے سے ناقابل توجہ ہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آخر اس مکتبی بحث کے کچھ تو حدود قائم ہونے چاہئیں۔ یہ کیا ہے کہ آپکے یہاں کا بڑے سے بڑا شاعر یا تو زبان و محاورہ خوب کہتا ہے یا پھر کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ بھی اسی زبان و محاورہ کی۔ اس طرح اگر شعر و ادب کی کل کائنات اور اس کا تمامتر مفہوم صرف زبان و محاورہ ہے تو آخر اسکے حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے؟

آج یہی ہندوستانی ہے کہ غیر ملکی زبانوں کو اس کمال کے ساتھ حاصل کر لیتا ہے کہ اُس ملک کے بڑے بڑے شعرا و ادبا اسکے کمال کے معترف ہو جاتے ہیں مگر اسی ملک میں رہکر اور صبح و شام یہیں کی اُردو بول کر بھی وہ اس زبان و محاورہ میں بالکل ہی طفلِ مکتب ہے، پھر اگر یہ چیز اسقدر مشکل اور ناقابل حصول ہے تو بعض ہندو دوستوں کی یہ تجویز کیا بُری ہے کہ مُلک میں ہندی زبان رائج کر دی جائے، اس لئے کہ ایسی بیکار زبان جسکے شعرا و ادیب آج تک اسکو صحیح صحیح استعمال کرنے پر قادر نہ ہو سکے قابلِ ترک نہیں تو اور کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر "زبان" اظہارِ خیال کا آلہ ہے تو آلہ کی اس شدید دیکھ بھال میں آلہ کا صحیح مقصد یعنی اظہارِ خیال و جذبات نہ فوت ہونے دیجئے! اور اگر خیال و جذبات کی طرف سے بالکل سناٹا ہے تو "زبان" کی آڑ لیکر اپنا اور دوسروں کا وقت بیکار نہ ضایع فرمائیے۔ اسلئے کہ اگر زبان و محاورہ کی تحصیل میں اتنا وقت صرف ہو سکتا ہے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ خیالات و جذبات اس سے کہیں رفیع تر ہیں اور انکی جلا و تربیت میں بھی ایسی باتیں درکار ہیں جو کسی لغت اور عروض کی کتاب میں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ الفاظ کو نظم کر لینے کی صلاحیت حاصل کر کے اسوقت سینکڑوں انسان ایسے موجود ہیں جن کی استعداد ذہنی اب تک "شعر" کے تصور سے بھی قاصر ہے ؎

آں شعلہ کہ افتد بہ خس و خار۔ نہ عشق است
ہر سوختہ زیں نشہ خبردار نہ باشد

پھر اگر زبان اور محاورہ ایسی چیز ہیں جس کی حیثیت عرض و سطح سے زیادہ نہیں اور لوگوں کو بجا طور پر جینے کا حق حاصل ہے تو پھر جو کچھ "محاورہ اور زبان کی حدوں" میں فرمایا جاتا ہے اسکی معنویت و لطافت کا بھی اسی سختی کے ساتھ کیوں نہ جائزہ لیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسکے جائزہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ زمانہ خود بہت بڑا نقاد ہے۔ اس نے لوگوں کو انکا اٹھتا ہوا جنازہ انکی آنکھوں سے دکھا دیا ہے۔ اس سے زیادہ "نقد" اور کون سی تنقید ہو سکتی ہے۔

انگلستان کا زبردست ادیب جان رسکن جب وینس کی سیاحت سے واپس ہوا ہے تو اس نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "دی اسٹونس آف وینس" شائع کی، اسمیں جن اُمور سے اس نے بحث کی ہے وہ تنقید کی جان ہیں۔ اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک قوم جو فنون لطیفہ و صنائع جمیلہ کے آثار چھوڑ جاتی ہے ان میں اسکے اخلاق و روحانیت کا ایک ایک خال و خط موجود ہوتا ہے جسکے دیکھنے سے پوری طرح یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کو وہ حقیقی شادمانی اور وہ سچی مسرتیں جو ایک اعلیٰ و مہذب زندگی اور ایک شاندار رفعت خیال کے لوازم ہیں، حاصل ہوئی تھیں یا نہیں؟

ایک ماہر نفسیات اور ایک قیافہ شناس باوجود غازہ و روغن کی فراوانی کے اگر خال و خط کے انداز اور پیشانی کی ہلکی ہلکی شکنوں سے نفس کی چھپی ہوئی شقاوتوں اور خباثتوں کو پڑھ سکتا ہے اور مختصر یہ کہ جب آج کل چہرے تک پہچان لئے جا سکتے ہیں تو شعر و ادب کے اس طولانی دفتر سے شعرا کی اصل حقیقت کیونکر پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ خیر یہ ذکر تو ارباب نظر کے چیدہ چیدہ حلقوں کا ہے مگر عام طور پر جو غلط مبحث رائج ہے اسکا کیا علاج؟ کچھ نقائص بتا کر تمام خوبیوں پر پانی پھیر دینا یا کچھ محاسن کا ذکر کر کے تمام معائب پر پردہ ڈالدینا وہ الزامات ہیں جو ہر ناقد ایک دوسرے پر عائد کیا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو کسی نہ کسی جہت و پہلو سے کچھ معائب و محاسن دونوں کی حامل نہو اس لئے بظاہر اس جرم سے کسی طرح مفر نہیں۔ جس طرح ایک حقیقی و خوشگو شاعر کے مجموعۂ کلام سے زبان، محاورہ، نقطے اور مرکز کی غلطیاں نکالی جا سکتی ہیں اسی طرح ایک یاوہ گو و ہرزہ سرا کے دفتر مزخرفات سے کچھ اچھے اشعار بھی تلاش کر کے پیش کئے جا سکتے ہیں اور اسطرح گمراہیوں کا سلسلہ برابر قائم رہ سکتا ہے۔ اب رہا انصاف و اعتدال یعنی معائب و محاسن کا ساتھ ساتھ تذکرہ وہ بھی خدشہ سے خالی نہیں اسلئے کہ فن تحریر کی لوچ لچک میں ہر قسم کی گنجائش موجود ہے۔ اور فرض کیجئے کہ وہ بھی نہ سہی تو بقول اکبر مرحوم ع

"جو اعتدال کہئے تو وہ ادھر نہ اُدھر"

اگر معائب و محاسن کے چکر میں شائقین تحقیق کسی نتیجے تک پہونچ ہی نہ سکے تو وہ بھی ایک کاوش مہمل اور فعل عبث سے زیادہ نہیں۔

ہر ایک اُردو شاعر کے حقیقی قدر و اندازہ کے لئے سب سے پہلے یہ معلوم کر لینے کی ضرورت ہے کہ اُردو شاعری نے اپنی اس مدت حیات میں دلّی اور لکھنؤ اسکول کے نام سے جو دو مختلف ذہنیتیں پیدا کیں اسکے ترکیبی اجزا و عناصر کیا تھے اور ان دونوں (اسکولوں) کی بنیاد میں کون سی مخفی اسپرٹ کارفرما ہے اُردو شعر و ادب کی جو متعدد تاریخیں اسوقت تک لکھی جا چکی ہیں انمیں متفرق طور پر اسکا مواد موجود ہے لیکن ضرورت یہ ہے کہ باقاعدہ و منضبط حیثیت سے اُردو شاعری کی ایک ذہنی تاریخ مرتب و مدون ہو' جسمیں ہر دور کے سیاسی۔مذہبی۔اخلاقی و معاشرتی حالات کے ساتھ شعر و ادب کی اجتماعی و انفرادی ذہنیت کے نفسیاتی اسباب و علل سامنے لائے جائیں۔اس صورت میں شعر و شاعر کو پہچاننے میں عموماً جو غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں اسکا ایک بڑی حد تک سد باب ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔اور اسمیں اہلیت و صلاحیت کے علاوہ فرصت بھی درکار ہے۔ملک میں بہت سی ہستیاں ایسی موجود ہیں جنھیں یہ دونوں چیزیں مجھ سے زیادہ میسّر ہیں انکا فرض ہے کہ اس خدمت علمی کو انجام دیں۔فی الحال موضوع پیش نظر کے اعتبار سے یہاں مختصر سے مختصر الفاظ میں کچھ سرسری اشارات کئے جاتے ہیں جنھیں ذہن نشین رکھ کر اُردو شاعری کے متعلق عموماً اور بعض شعرا کے مرتبۂ شاعری کے بارے میں خصوصاً ایک حد خاص تک صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

اُردو شاعری کی مختصر ذہنی تاریخ

اُردو زبان کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کا حقیقی مولد و منشا کونسا مقام ہے؟ محققین ادب کی انتہائی کاوشوں کے باوجود اسکے جواب میں اب بھی اختلاف و نزاع کی گنجایش باقی ہے۔عام طور سے یہی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ شرف اولیت دکن کو حاصل ہے مگر حال میں ایک اور آواز بلند ہوئی ہے کہ "نہیں اسکا حقیقی سہرا پنجاب کے سر ہے"۔اصل یہ ہے کہ ہندی میں عربی فارسی کے الفاظ اور فارسی تحریروں میں ہندی الفاظ کی آمیزش کا سُراغ ہر اُس مقام سے جہاں ہندو مسلمانوں کو باہم مل جلکر رہنے کا اتفاق ہوا ہو بہ آسانی مل سکتا ہے اس لئے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جہاں جہاں بھی ہندو مسلمانوں کو مخالطت باہمی کا موقع ملا ہے وہاں اُردو زبان کا ہیولیٰ بھی تیار ہوتا رہا چنانچہ اگر ایک علمی بیت بازی مقصود ہو

نوجواں سے بھی اس قسم کی آواز بلند کردی جائے کچھ نہ کچھ تو اسمیں معنے ضرور ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ بہر صورت اُردو زبان کا شرفِ ایجاد کسی خطۂ زمین کو حاصل ہو مگر غالباً اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اُردو شاعری کی حقیقی تربیت دلّی میں ہوئی۔ جسطرح بچے کی ولادت سے قبل ہی فطرت اسکے نشوونما کے لئے شیرِ مادر تیار کردیتی ہے ٹھیک اسیطرح اُردو کے عالم وجود میں آنیسے قبل ہی ہندی اور فارسی شاعری کا ایک نہایت صالح اور جاندار ذخیرہ دلی میں تیار ہوچکا تھا۔ اُردو شاعری کا مایۂ خمیر اور اس کا اصلی مزاج یہی سرمایہ تھا۔

ہندی شعرا بابر کے زمانہ میں کبیر کے دوہوں کی شہرت عام ہورہی تھی اکبر خود ہندی کا شاعر تھا۔ اسکے زمانہ میں سورداس، تلسی داس، ٹوڈرمل اور بیربل ایسے باکمال ہندی شعرا موجود تھے۔ شاہجہاں اپنی مادری زبان کی طرح ہندی زبان بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے دربار میں ہندی شعرا کی بڑی وقعت تھی، دارا شکوہ ہندی اور سنسکرت کا زبردست عالم تھا۔ اس نے اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اورنگ زیب نے باوجود اپنے سخت تقشف مذہبی کے، شاہزادہ معظم کی فرمائش پر چند آموں کے نام "سدھارس" اور "رسنا ولاس" رکھے تھے۔

"کویتا کیدی" میں مسلمان ہندی شعرا کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے چند نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

حضرت امیر خسروؔ، ملک محمد جائسیؒ، اکبرؔ، قادر بخش، خانِ خاناں، عثمانؔ، سید ابراہیم رس کہان، مبارک، احمد، وہاب، عبدالرحمان، جلیل، یعقوب خاں، ذوالفقار، انور خاں، پریمی یمن، اعظم، طالب علی، اور عالم۔ ہندی کے ابتدائی دور کے شعرا میں امیر خسرو۔ ودیاپتی۔ کبیر اور نانک کو اور دوسرے دور میں سورداس، تلسی داس، رحیم خانخاناں، اور رس کہان، کو رکھا گیا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ "مسلمانوں کے عروج و ترقی کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری کو عروج و ترقی ہوئی، اور اُن کے زوال و تنزل کے ساتھ ہندی شاعری کو بھی زوال و تنزل ہوتا گیا"

فارسی شعرا صفویہ خاندان کے زمانہ میں شعرائے ایران نے مال و دولت کی کشش سے ہندوستان کا رُخ کیا۔ یہاں وہ صرف مال و دولت ہی سے فیضیاب نہیں ہوئے بلکہ انھیں ایک ایسا ماحول بھی مل گیا جس سے بڑی حد تک اُن کے مذاق کی جلا و تربیت ہوئی۔ خانخاناں نہ صرف ہندی اور ترکی زبانوں کا زبردست شاعر تھا بلکہ فارسی میں بھی اُسکی نظر اتنی بلند تھی کہ نظیری ایسا باکمال شاعر اسکی اصلاح و ہدایت کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا۔ اکبر بظاہر حرف شناس تک نہ تھا مگر صحتِ ذوق کا یہ عالم تھا کہ اس نے ملک الشعرائی کا ایک خاص عہدہ قائم کیا تھا۔ فارسی شعرا کے کلام پر اس کی بعض بعض اصلاحیں اسکی خوش مذاقی کا بیّن ثبوت ہیں۔ جہانگیر کا مذاقِ شعر و ادب "تزکِ جہانگیری"

سے ظاہر ہے۔ کسقدر نکتہ رس اور دقیقہ شناس طبیعت پائی تھی، جس شاعر کی بابت جو رائے دیدی ہے وہ بالکل جچی تُلی ہے۔ خود بھی کبھی کبھی جو کچھ کہتا تھا یا کسی کے شعر میں کوئی اصلاح و ترمیم کرتا تھا تو اس سے صحت مذاق و نکتہ شناسی کا پتہ چلتا ہے۔

عہد مغلیہ کا مشہور فارسی شاعر چندر بھان برہمن ہے۔ اس نے اپنی کتاب "چہار چمن" میں اس زمانہ کے نصاب تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اس نے ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس زمانہ میں عام طور پر مطالعہ میں رائج تھیں۔ انمیں مثنوی مولانا رومؒ، دیوان شمس تبریزؒ، حدیقہ حکیم سنائیؒ، پندنامہ فریدالدین عطارؒ، کلیات امیر خسروؒ و مولانا جامیؒ وغیرہا داخل ہیں، جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور کے تعلیمیافتہ دماغ کس قسم کے خیالات و مضامین سے تربیت پا رہے تھے۔ شاعری کی تمام تر بُنیاد اخلاص و کیف پر ہے جن شعرا کی طبیعت میں یہ مادہ زیادہ ہے اُسی نسبت سے انکا کلام بھی پُرتاثیر واقع ہوا ہے۔ "پُرکیف اخلاص" صحتِ ذوق کی دلیل اور خود شاعری کی اصلی روح حیات ہے۔ جن لوگوں کو خود یہ نعمت حاصل ہو ان کا کیا کہنا! لیکن عام طبائع تقلید و تتبع کی عادی ہیں۔ تقلید و تتبع میں بھی اگر "صحیح المذاق" لوگوں کو پیش نظر رکھا جائے تو بہر صورت وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

مور مسکیں ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

دلی چونکہ اکثر صوفیائے عظام کا آستانہ تھی اس لئے یہاں ایسے فارسی شعرا کی کثیر تعداد موجود تھی جو خود صاحب ذوق تھے مگر ان سب میں حضرت امیر خسروؒ کو ایک خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ ان بزرگوں کے روحانی نغموں سے دلی کا ذرہ ذرہ گرم تواجد اور کیف و سرمستی سے لبریز تھا۔ اکبر۔ جہانگیر اور خانخاناں وغیرہ کی اصلاح و تربیت کے علاوہ ایرانی شعرا کے کلام میں اعتدال و لطف پیدا ہونے کا باعث دلی کا یہ بابرکت ماحول بھی تھا۔

اُردو شاعری اور دلی کا اسکول حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی پیدائش تیرھویں صدی عیسوی کی ہے، ایک طرف تو ان کی یہ حیثیت ہے کہ ان کا شمار زبردست مشائخ و صوفیہ میں ہے انکی تمام زندگی جوش و خروش اور درد و نیاز کا زندہ نمونہ تھی۔ وہ اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کے وصال کی خبر پاکر تمام اثاثہ لٹا کر اُنکے مزار پر معتکف ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ شاہد حقیقی کو نقد جان سپرد کرکے دم لیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ ہندی اور فارسی کے ایک باکمال شاعر ہیں انکے کلام میں درد و تاثیر کا یہ عالم ہے کہ انکی زندگی، شاعری اور انکی شاعری عین زندگی معلوم ہوتی ہے۔ طبیعت میں اسقدر جدت و اختراع

کا مادہ ہے کہ مکرنی، انمل، دوسخنے، پہیلیاں اور انکے علاوہ اور طرح طرح کے چیزیں ان کی ایجاد فکر کی مرہون منت نظر آتی ہیں۔ ہندی اور فارسی الفاظ کے علاوہ کبھی کبھی پورے فقروں کو بھی اسطرح باہم دست وگریبان کر دیتے ہیں کہ ایک نئی زبان کی طرح، بنیاد قائم ہو جاتی ہے۔ "خالق باری" بھی انھیں کی تصنیف کہی جاتی ہے گو اس روایت کی بنیاد زبردست تاریخی شواہد پر نہ ہو۔ تاہم اُردو کی تاسیس وتشکیل کا سہرا انھیں کے سر تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر تقی میر اپنے نکات الشعرا میں انکا ذکر اس طرح کرتے ہیں،

"حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ"

"جمع کمالات وصاحب حالات، فضائل او اظہر من الشمس است۔ احوال امیر مذکور در تذکرہا مسطور۔ ایں نوشتن احقر العباد۔ فضولیست۔ اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد۔ دریں خود تردے نیست۔ از آں جملہ یک قطعہ تیمناً نوشتہ آید۔ سے"

"زرگر پسرے چو ماہ پارا، کچھ گھڑیئے سنواریئے و پکارا
نقد دل من گرفت وبشکست، پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا"

سب سے پہلی اُردو غزل جس میں فارسی اور ہندی الفاظ باہم ملائے گئے ہیں اور فارسی اوزان سے کام لیا گیا ہے آپ ہی کی جانب منسوب ہے۔

ملک محمد جائسی ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کا زمانہ ۱۵۴۰ء ہے ان کی مشہور ومعروف کتاب "پدماوت" فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی، اسکے بعد پندرھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی کی ابتدا تک کبیر اور تلسی داس کا کلام لوگوں میں بھگتی اور دردو بنا کی روح پھونکتا رہا۔ ان تمام بزرگوں کے ہندی کلام میں فارسی کے الفاظ برابر جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دکن میں بھی اُردو کی ابتدا ہندو مسلمانوں کے باہم رواداری تعلقات کا نتیجہ تھی۔ بہمنی سلطنت کے تعلقات ہندؤں سے نہایت شگفتہ تھے۔ مسلمان صوفیا نے (جنکی پاکیزہ طبیعت اکثر قومی وملکی تعصبات سے دور رہتی ہے) اپنے واردات قلبیہ کو ملکی زبان میں شعر کا جامہ پہنایا۔ سید جلال الدین حسین بخاری جن کا نام ولقب برہان الدین عبداللہ بن محمود تھا۔ اور جنکو گجرات والے "قطب عالم" کہتے ہیں، حضرت مخدوم جہانیاں جہاںگشتؒ کے پوتے تھے۔ انکے بڑے صاحبزادے کا نام سراج الدین محمد بن عبداللہ

سلہ ہسٹری آف اردو لٹریچر، از بابو رام سکسینہ

تھا انکو "شاہ عالم" بھی کہتے ہیں۔ حاکم سندھ نے اپنی ایک لڑکی کا ان سے عقد بھی کر دیا تھا۔ ان بزرگوں کی طرف بھی چند فقرے ایسے منسوب ہیں جن میں فارسی اور دکنی زبان کی باہم آمیزش نمایاں ہے۔ غرضکہ یہ تمام اُمور مِل جُل کر دکن میں اُردو اور اُردو شاعری کی ابتدا کا باعث ہوئے۔ اس دور کا اوّل[۱] شاعر شجاع الدین نوری کہا جاتا ہے جو فیضی کا دوست اور اس لئے اکبر کا ہم عصر ہے۔

ولی دکنی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ دو مرتبہ دلی آیا۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۷۰۰ء میں جو اورنگزیب کا زمانہ تھا اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۷۲۲ء میں جو محمد شاہ کا زمانہ تھا۔ پہلی ہی مرتبہ وہ شاہ سعد اللہ گلشنؒ کا مرید ہوا اور آپکی ہدایت کے مطابق اپنے کلام میں مناسب صلاح و ترمیم کرکے اسے اُردو شاعری کا ایک بہترین نمونہ بنا دیا۔ ولی کے تعلقات لالہ کھیم داس اورنگ آبادی اور امرت لال وگوہر لال سے بھی بہت تھے۔ یہ لوگ بھی اس زمانہ میں کافی ادبی شہرت رکھتے تھے۔

دلی کی تمام فضا پہلے ہی سے شعر و روحانیت کے آتشگیر مادہ سے لبریز تھی۔ ولی نے جب شاہ سعد اللہ گلشنؒ کے ارشاد و ہدایت کے موافق اپنا دیوان مرتب کیا اور یہ کلام دلی کے گلی کوچوں میں پھیلا تو ہر طرف ایک آگ سی لگ گئی۔ دہلی میں ولی کے معاصر آبرو۔ حاتم۔ ناجی۔ مضمون اور حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ تھے۔ ان میں سے شاہ مبارک آبرو شاہ محمد غوثؒ گوالیاری کے سلسلہ میں ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ شاہ شرف الدین مضمون ابتدائً ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں فقر و تصوّف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ یہ بابا فرید شکر گنج علیہ الرحمۃ کی اولاد میں تھے۔ آپکے بعد خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ نے اُردو شاعری کو بہ اعتبار زبان و بہ اعتبار خیالات و جذبات آسمان پر پہونچا دیا۔ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگوں میں ہیں۔ آزاد کا قلم ان بزرگوں کے ذکر میں بہت رُک رُک کر چلا ہے مگر میر تقی میر ان الفاظ میں انکا ذکر کرتے ہیں:۔

"مرزا جان جانان مظہر"

"مظہر تخلص۔ مردیست مقدس مطہر۔ درویش، عالم، صاحب کمال۔ شہرۂ عالم بے نظیر معوزہ مکرم اصلش از اکبر است، پدر او مرزا جانجان نام داشت۔ از فرطِ شفقت مرزا جان جاں می گفت۔ ازیں سبب بہمیں اسم موسوم است۔ بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است۔ اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کند۔ خوش تقریر بہ مرتبہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد۔ دیوان مختصر شعر فارسی او بہ نظر فقیر مؤلف آمدہ است از سلیم و کلیم پایہ کمی نہ دارد اگرچہ شعر گفتن دوں مرتبہ است لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز میشود"

---

[۱] ہسٹری آف اُردو لٹریچر، از بابو رام سکسینہ

آپکے فارسی اشعار تمام تر سوز و درد سے لبریز ہیں۔ یہاں اُردو کے چند اشعار نمونۃً پیش کیے جاتے ہیں:-

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار | ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام گلشن میں ولیک | جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزہ سے زندگی کرتے | اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا | لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
اتنی رخصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم | مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم
مت اختلاط کر لے نوبہار تو ہم سے | چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں
آتش کہو۔ شرارہ کہو۔ کوئلا کہو، | مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو
تجلی گر تری پست و بلند انکو نہ دکھلاتی | فلک یوں پیچ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
خدا کو اب بتجھے سونپا ارے دل، | یہیں تک تھی ہماری زندگانی،

زبان کی آراستگی اور لفظی ریزہ کاریوں کا خیال دور کر کے ان اشعار کو غور سے پڑھئے۔ ان میں عام شراروں کا بیسُود و لا حاصل تبسّم نہیں ہے بلکہ وہ شعلے ہیں جو کبھی طور پر چمکتے ہیں اور کبھی ارباب درد کے سینوں کو پُرگداز کر دیتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کا ذکر میر تقی میر اس طرح کرتے ہیں:-

"میاں صاحب میاں خواجہ میر سلمہ اللہ تعالیٰ"

"المتخلص بہ دردؔ؛ جوش بہار گلستانِ سخن؛ عندلیب خوش خوانِ چمن ایں فن؛ زبان گفتگویش گرہ کشائے زلفِ شامِ مدعا، مصرع نوشتہ اش بر صفحہ کاغذاز کاکلِ صبح خوشنما، طبع سخن پردازِ او سرو مائل چمنستاں انداز است۔ گاہے در کوچہ باغِ تلاش بہ طریقِ گلگشت قدم رنجہ می فرماید۔ در چمن شعرش لفظ رنگین چسن چمن۔ گلچینِ خیالِ او راگلِ معنے دامن دامن، شاعر زور آور ریختہ، در کمال علاقگی وارستہ، خلیق متواضع، آشنائے درست۔ شعر فارسی ہم می گوید۔ اما بیشتر رباعی، گرمیٔ بازار وسعت مشرب اوست غرض از آشنائی مطلب اوست۔ متوطن شاہجہاں آباد۔ بزرگ و بزرگ زادہ، جوانِ صالح از درویشی بہرہ وافی دارد۔ فقیر را بہ خدمتِ او بندگی خاص است۔ اگرچہ حُسنِ سلوک عام سر حُسن سلوک بیائے خود گرفتہ اعتزازِ را انگوشۂ دل نہادہ، خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ مقتدائے علم است۔ ایامے کہ فقیر بخدمتِ آں بزرگوار شرف اندوز می شد۔ از زبان مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میرِ مجلس خواہی شد۔ الحمد للہ والمنۃ کہ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستاں موثر افتاد۔ باطن آں خضر قافلۂ اہل عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر تر است زود کار کرد۔ مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ

مقرر است والله از ذاتِ ہمیں بزرگ است۔ زیراکہ پیش ازیں این مجلس بخانہ اشں مقرر بود۔ خداش ابد الآباد سلامت دارد"

خواجہ صاحب کا کلام عام طور پر شائع ہو چکا ہے، اسلئے بخوف طوالت یہاں درج نہیں کیا جاتا

شاعری اور تصوف کا باہمی تعلق

دہلی اسکول کے مزاج ذہنی میں فقر و تصوف کا عنصر غالب ہے، اسلئے شعر و تصوف کے باہمی تعلق پر مختصراً یہاں کچھ عرض کر دینا غالباً بے موقع نہوگا۔ میں یہاں تصوف کی کوئی مبسوط تاریخ نہیں پیش کرونگا اور نہ اسکے مسائل پر کوئی طویل بحث کرونگا بلکہ اس سلسلہ میں صرف چند ایسی باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ شاعری کا تصوف سے نہایت قریبی تعلق ہے

الفاظ و اصطلاحات، اصلیت و حقیقت کے اشارات ہیں اور وہ ہمیشہ باہم مختلف رہینگے یہ اختلاف اشارات کتنے ہی اعتباری کیوں نہوں مگر دراصل انھیں کی بدولت قوموں اور جماعتوں کے امتیازات باقی ہیں۔ عارف رومیؒ نے اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ؎

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح — سندھیاں را اصطلاحِ سند مدح
ہر کسے را سیرتے بنہادہ ام — ہر کسے را اصطلاحے دادہ ام

بہرصورت "سیرت و اصطلاح" کے پردے کو ہٹا کر، اور ہندو مسلم امتیازات کو الگ رکھ کر ہم فقر و تصوف کے مسلک اور اسکے حقیقی مقصود پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہی معمولی معتقدات جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر مشترک ہیں انپر خود اپنے نفس میں تصدیق و یقین کی شان پیدا کریں۔ اربابِ فقر و تصوف کے نزدیک عام طور سے جو مذہب رائج ہے وہ صرف اس لئے ظاہری، سطحی، اور بے اثر ہے کہ اسکی حیثیت رسمی یا زیادہ سے زیادہ علمی ہے۔ "یقینی اور علمی" یا "ظاہری اور وجدانی" کے باہمی فرق کا اندازہ اس مثال سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ فرض کرو کہ تم شیر کے وجود کو تسلیم کرتے ہو، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مہیب بھی ہے اور وہ انسان کو مار بھی ڈالتا ہے۔ اب تمھارا گزر ایک جنگل میں ہوتا ہے تمہیں شیر کا خیال آتا ہے اور جھاڑی میں سے کچھ سرسراہٹ معلوم ہوتی ہے۔ پھر تمہیں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یکایک ایک شیر تمھارے سامنے نمودار ہوجاتا ہے۔ ابتدائی حالت میں جو شیر تمھارے ذہن میں تھا وہی شیر آخر تک تمھارے ذہن میں رہتا ہے۔ صرف یقین کی زیادتی کے باعث خوف کے جذبہ میں اس درجہ ترقی ہوگئی ہے کہ تمھارا وہ ابتدائی علمی شیر، موجودہ شیر سے جو تمھارے یقین و مشاہدہ کا نتیجہ ہے، بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے۔

تمام مذاہب کے نزدیک خدا موجود ہے۔ وہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے۔ لیکن کون کہسکتا ہے

کہ اس حقیقتِ علمی پر جب تصدیق و یقین کی روشنی پڑتی ہوگی تو اسوقت انسان کی کیا حالت ہوتی ہوگی شاعری کی تمام تر بنیاد جذبات پر ہے۔ تصوف یعنی تصدیق و یقین سے جذبات کی لطافت و شدت بڑھ جاتی ہے جسکا اندازہ تمھیں مذکورہ مثال سے بخوبی ہوچکا ہوگا۔ اس لئے شاعر کے جذبات میں جسقدر شدت و لطافت ہوگی اُسیقدر اسکی شاعری زیادہ کامیاب ہوگی۔ کلام کی تاثیر کے متعلق بھی میں اسی مذکورہ مثال کی جانب تمھاری توجہ دوبارہ مائل کرونگا۔

ایک شخص شیر کی شکل وصورت کو اچھی طرح جانتا ہے وہ اسکے ایک ایک عضو کے متعلق پوری معلومات رکھتا ہے، اسی کے ساتھ اُسے قوتِ گویائی بھی حاصل ہے۔ وہ شیر کے متعلق جو کچھ بیان کریگا اسے سُنکر تمھیں ایک حد تک لطف آسکتا ہے لیکن ایک ایسا شخص جسکے سامنے شیر کی صورت ہو تو وہ شیر کی شکل وصورت کے متعلق ممکن ہے کہ کوئی تفصیلی و مکمل بیان نہ پیش کرسکے، ممکن ہے وہ "ارے شیر" ہی کہہ دے یا صرف ایک چیخ ماردے بہرصورت اپنی حالت کے اظہار کا بہترین طریقہ وہی خوب جانتا ہو، اُسے ادائے مطلب کے لئے کسی بڑے سے بڑے اہل زبان کو حق نہیں ہے کہ تعلیم و تلقین کرے۔ غرض خوف و ہراس کا جو جذبہ وہ اپنے اس نامکمل طرزِ بیان سے پیدا کردیگا وہ کسی بڑے سے بڑے اہلِ زبان و خطیب سے، باوجود اپنے تمام مصطلحہ فن خطابت و زباندانی کے بھی ممکن نہیں۔ اس لئے اگر شاعر کی غرض یہ ہو کہ جو کچھ خود محسوس کرتا ہے وہ دوسروں سے بھی محسوس کرائے اور جن جذبات سے وہ خود متاثر ہے اُن سے دوسروں کو بھی متاثر بنائے تو اسمیں قوت بیان سے کہیں زیادہ خود اسکے یقین و مشاہدہ اور احساس و جذبات کی شدت مطلوب ہے اور لفظ و بیان سے کہیں زیادہ شاعر کا یقین و مشاہدہ اور اسکی کیفیت نفسی کی شدت لوگوں پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی کو ایک عامیانہ فقرہ میں اسطرح کہا گیا ہے۔

" آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد "

اس زمانہ کی ہوس پرستانہ بیجا رگیوں نے کمال سنجیدگی سے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ "عشق حقیقی" جو اکثر قائلین فقر و تصوف کا ادعا ہے وہی سرے سے غیر فطری اور غلط معلوم ہوتا ہے۔ ؎

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ۔ ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

"حسن نسوانی" کی ادائیں تو بین طور سے ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ان کی تاثیر میں فطرت کی اعلیٰ ترین مصلحت توالد و تناسل بھی مضمر ہے لیکن "حسن حقیقی" اور "حسن مطلق" سے شیفتگی، لوگوں کی ایک کورانہ تقلید ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی اس بیسویں صدی میں کہیں سے ضرورت ہو۔ اس لئے جس شاعری میں کھُلے کھُلے حسن نسوانی کے علاوہ متصوفانہ حسن حقیقی و حسن مطلق کا ذکر ہو اسے غیر فطری و

غیر متغزلانہ کہنا بیجا ہوگا۔

اس اعتراض کا آہنگ بیان کتنا ہی شوخ و ادیبانہ کیوں نہ ہو مگر اسکی بنیاد میں وہی قدیم سوال "مذہب و لامذہبیت" کا ہے جسے عرصہ گاہِ شعر و ادب سے کہیں باہر طے کرنا چاہیئے تھا۔ تاہم "مذہبیت و لامذہبیت" کے اصل موضوع کو بچا کر جس حد تک ممکن ہوگا میں یہاں کچھ عرض کرونگا۔

"نسوانیت" کی کشش اور اسکی قوتوں کا اعتراف مسلم۔ اور یہ بھی تسلیم کہ اس سے ہمارے بعض خاص قویٰ و جذبات کی سیرابی بھی ہوتی ہے۔ اسی احتیاج کے باعث نسوانیت کی اس کشش کو ہم "حسن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ مگر کیا ہماری انسانیت چند خاص قویٰ و جذبات تک محدود ہے؟ اور کیا انکے علاوہ ہماری دوسرے احتیاجات زندگی نہیں ہیں؟

اگر آبشار کی آواز اور مغنی کا نغمہ ہمیں بیخود بنا دیتا ہے اور شفق کی سرخی اور مرغزار کی سبزی ہم میں کوئی کیفیت پیدا نہیں کرتی تو اسکے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارا "سامعہ" تو صحیح ہو مگر ہماری "بصارت و بینائی" میں یقیناً نقص ہے۔ انسان کے احساسات و ادراکات کا استقصار و شمار آسان نہیں، کون کہہ سکتا ہو کہ ہماری ہستی کے کون کون سے اجزا کو کن کن چیزوں کی احتیاج و کشش ہے۔ انسان خود کو جسقدر وسیع کرتا جاتا ہے اتنا ہی حسن بھی اسکے سامنے وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جو لوگ حسن کو کسی مخصوص چیز میں مقید دیکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے بعض جذبات میں کتنی ہی قوت و ہیجان پائیں لیکن بہرحال یہ ایک قسم کی تنگی و تقید ہے جو انسانیت کے وسیع نقطۂ نظر سے کسی طرح محمود و مستحسن نہیں۔ ہمارے حواسِ خمسہ ظاہری رنگ، بو، آواز، نرمی و سختی اور ذائقہ کے علاوہ کسی دوسرے حسن سے قطعی بےخبر ہیں۔ ہمارے باطنی حواس حسن معنے حسن تخیل اور حسن اخلاق وغیرہ پر شیفتہ ہیں مگر ان میں سے کسی ایک حسن پر اپنے تمام ذوق کو محدود و منحصر کر دینا انسانی ہستی اور اسکی جامعیت کے لئے سم قاتل ہے ؎

> ہیچ حسن یقین سے، ظاہر ہو کہ باطن ہو — یہ قید نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے

مغرب کا ایک اعجوبہ نگار مصنف اپنی ایک کتاب کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت پُرلطف انداز سے بیان کرتا ہے۔ افسوس! اسوقت نہ وہ کتاب میرے پاس ہے اور نہ اسکے اصل فقرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ تاہم جہانتک یاد پڑتا ہے اس کا مفہوم یہ ہے:-

(۱) جو لوگ چیزوں کا صرف ظاہر دیکھتے ہیں انکی حالت واجب الرحم ہے۔

(۲) جو لوگ چیزوں میں حسن دیکھتے ہیں انکی حالت بہتر ہے اور ان سے کچھ امید کیجا سکتی ہے۔ اور

(۳) وہ لوگ جو بلند ترین و مکمل ہیں وہ حسن کے سوا کچھ اور نہیں دیکھتے

انسانی ہستی کا اگر ہر ریشہ بیدار و ہشیار ہو تو کائناتِ عالم میں کیا ہے جس کا اُس سے تعلق نہیں؟ کونسی چیز ہے جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسے کیفیت و لذت کا ادراک نہ ہوتا ہو اس لئے بتایئے کہ عالم میں حسن اور محض حُسن کے سوا اور موجود ہی کیا ہے حُسنِ صورت اگر تفریح بخش ہے تو کیا "حسنِ معنیٰ" نے صدہا اور ہزارہا انسانوں کو دیوانہ نہیں بنا دیا؟ حُسنِ انسانی بے شک کشش انگیز ہے لیکن اگر باطنی حاسہ مردہ و افسردہ نہ ہو تو اسی کے ساتھ حُسنِ اخلاق و پاکیزگیِ خیال میں بھی کافی دلآویزی موجود ہے۔ اربابِ رسم و تقلید کا ذکر نہیں بلکہ حقیقی صاحبانِ ذوق نے اگر "حسنِ مطلق" کو اپنی شیفتگی اور وارفتگی کا موضوع قرار دیا اور تم اپنے تنگ و محدود مذاق کی بنا پر اس کا لطف نہ اُٹھا سکے تو۔ غ

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

"بتِ شیریں حرکات" اور "آستیں چاک و غزل خواں و صراحی در دست" کے متصوفانہ اصطلاحی معنوں کو الگ رکھو کہ انکا شمار تاویلات بعیدہ میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حقیقتہً اپنی اصلی شکل میں یہ حسن نہیں؟ اور کیا اس سے ہمارے کیف و سرور کو جنبش نہیں ہوتی؟ اس کا جواب یقیناً اثبات میں ہوگا مگر حُسن شناسی کا تھوڑا سا اور ثبوت دو کہ "نظامِ اخلاق" کے قیام و بقا سے سوسائٹی اور خود ایک فرد کو جو سرور و انبساط حاصل ہوتا ہے کیا وہ بھی مطلوب و مقصود نہیں؟ اور کیا "حُسن" کے سوا کوئی اور بھی ہے جو ادھر سے بھی دست بہ دامن نظر آرہا ہے۔؟ یہی وجہ ہے کہ اربابِ حقیقت کے کلام میں "حسنِ مجاز" کی دلاویزیوں کا بھی ذکر ہے اور حُسنِ اخلاق کا بھی۔ "حُسنِ مطلق" کی پرستش کے معنی یہ ہیں کہ حُسن کہیں ہو، کسی صورت میں ہو، کسی مرتبہ اور کسی شعبۂ حیات میں ہو، اسکو ہر جگہ پہچانا جائے اور ہر مقام پر اس کا صحیح حق ادا کر دیا جائے، یہ صحیح ہے کہ حُسنِ کامل یا حسنِ مطلق سے لطف اندوز ہونے کے لئے صلاحیت درکار ہے۔ دیکھنے میں تمام انسان، انسان ہیں مگر انہیں سے اکثر ایسے ہیں جو یا تو صرف دل ہیں یا صرف دماغ، کچھ ایسے ہیں کہ شکم و بہیمیت کے سوا انکی کوئی اور ہستی ہی نہیں۔ کمال حُسن کی شناخت کے لئے انسانیت کی تکمیل ضروری ہے۔ پس اگر وہ نہیں ہے تو یہ رونے کا مقام ہے۔ دلیری اور خیرہ چشمی سے اس پر معترض ہونیکا موقع نہیں۔ کہ اس طرح کے کلام سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس کا جواب اتنا کافی ہے کہ "حقیقت و صداقت دوسروں کی نا اہلی و کم فہمی کی ذمہ دار نہیں" اور بس۔

غرض مذکورہ بالا بیانات سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ دلی کا مذاق اور اس کا مزاجِ شعر و ادب بلکہ اسکی تمامتر اجتماعی ذہنیت کی ترتیب مندرجہ ذیل حقیقتوں پر مبنی تھی اور یہی دلی اسکول کے اصلی خصوصیات ہیں:۔

(۱) ہندو مسلمانوں کے روادارانہ تعلقات اور ایک دوسرے کی تہذیب و ذہنیت کے باہمی اختلاط نے شاعری میں وسعتِ مشرب اور ہمہ گیری کی شان پیدا کر دی تھی

(۲) جس زمانہ میں اُردو شاعری کا خاکہ اور ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا اسوقت ہندو اور مسلمان، فقرا و مشائخ نے اپنی پُرکیف و وجدانی ترنم ریزیوں سے اسمیں پاکیزگی و روحانیت کی استعداد پیدا کر دی تھی۔

(۳) ہندو اور مسلمان، فقرا و مشائخ کے نفوس جو اعلیٰ اخلاقی محاسن سے مزین تھے اور اُردو شاعری کی تربیت و پرداخت چونکہ انھیں کے بابرکت ہاتھوں عمل میں آئی اس لئے قدرتی طور سے اسمیں بلند اخلاقی کی اسپرٹ موجود تھی۔ یہی مہذب مذاق دلی اور نواح دلی میں پھیل گیا۔ اور شعر و شاعری کے باب میں یہی ذہنیت عام ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی جو پاکیزگیٔ نفس اور اعلیٰ اخلاقی و روحانی خوبیوں سے عملاً بہرہ ور نہ تھے، جب شاعری کی جانب مائل ہوئے تو تقلیداً ان کو بھی یہی رنگ اختیار کرنا پڑا جو عادت و خاصہ ہو عام اجتماعی ذہنیت کا۔

(۴) شاعری کا عام موضوع حُسن ہے۔ ارباب فقر و تصوف کے نزدیک اسکا مفہوم نہایت وسیع ہے جسمیں مجاز و حقیقت، اخلاقی اور مادی حسن و خوبی کی تمام ادائیں داخل ہیں۔

(۵) دہلی میں ارباب ذوق کی شاعری کا مقصود زیادہ تر واردات باطنی کا اظہار تھا نہ وہ پیشہ تھی اور : اسمیں نمائشی دنگل اور اکھاڑے کی شان پیدا ہوئی تھی۔

(۶) دہلی کی شاعری کا دربار سے تعلق نہیں ہوا تھا اس لئے امرا کی فرمائش سے جو تکلف، تصنع اور درد پیدا ہو جاتی ہے اُس سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔ شعرائے دہلی کے یہاں زیادہ تر شعر کی غرض خود کا دلی تقاضا ہوتا تھا اس لئے باوجود زبان کی کم مائیگی کے شعر میں تازگی و لطافت کا عنصر غالب تھا۔

ؤ کی شاعری

مذکورہ خصوصیات اگرچہ زمانۂ مابعد میں قائم نہ رہ سکیں تاہم غالب، مومن اور شیفتہ ہرہ نے ایک بڑی حد تک بگڑے ہوئے مذاق میں بھی کشاکش قائم رکھی، کچھ تو دہلی کی فلاکت اور تباہی شعرائے دہلی کو دہلی سے نکلنے کے لئے مجبور کیا کچھ پورب کے نواب اور رؤسا نے اپنی درباری عظمت و ان و شوکت کی افزایش کے خیال سے خود ان شعرا کی طلب و جستجو کی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کے مو ب سالار جنگ نے خان آرزو کو دلی سے بلوایا۔ ایک زمانہ تک وہ فیض آباد میں اقامت گزیں رہے آخر شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد رہگرائے آخرت ہوئے۔ میر غلام حسین ضاحک بھی ن آباد ہی میں بہو بیگم کے بھائی نواب مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ کے سایۂ عاطفت میں زندگی لر رہے تھے۔ جب بجائے فیض آباد کے لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو میر ضاحک کے بیٹے میر حسن اور

پوتے میر محسن خلیق لکھنؤ آئے۔

لکھنؤ کے نواب مالدار تھے۔ انکو شاہانِ دہلی کی ریس و ہمسری کا بھی شوق تھا اس لئے نہ صرف خود شعر و شاعری کی طرف توجہ کی بلکہ شعراء کو اپنی مصاحبت میں رکھنے، اُن پر انعام و اکرام کی فیاضانہ بارش کرنے۔ اور اس طرح خود کو شعراء کا محسن و مربی ثابت کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دہلی کے تمام باکمال شعراء لکھنؤ میں جمع ہو گئے۔ صرف خواجہ میر دردؔ۔ اور حضرت مظہر جانجاناںؒ اس جاہ و حشم اور مال و دولت سے مسحور نہ ہو سکے اور اُنھوں نے آخر وقت تک دلّی کو نہیں چھوڑا بلکہ ابتک وہیں کی خاک میں آرام فرما و استراحت گزیں ہیں (رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

لکھنؤ میں شعرائے دلّی کے درباری تعلق نے گو شعر و شاعری کا آوازہ بہت بلند کر دیا اور ہر طرف شعر و شاعری کے چرچے سے اگرچہ شاعرانہ ذخیرہ کی بہتات و کثرت ہو گئی لیکن اسی کے ساتھ شعر و شاعری کے حقیقی جذبات اور اسکی روحانی عظمتوں میں نقص و انحطاط بھی شروع ہو گیا اس لئے کہ شعراء کی یہ سخن سنجی اظہار جذبات کے لئے نہیں بلکہ اکثر ان نواب و رؤساء کو خوش کرنے کے لئے ہوتی تھی۔ لکھنؤ میں جب شاہ نصیرؔ اور انشاؔ کی ملاقات ہوئی ہے تو میر انشاؔ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا کہ ابتو شاعری کا یہ عالم ہے کہ ؎

لگا چپر کھٹ کے چار پائے اور اُسپہ چار و نطرف سے گجرا
تو موجِ دریائے چاندنی میں وہ ایسا چلتا تھا جیسے بجرا

ملازمت کی مجبوریوں اور امراء اور رؤساء (جنکا مذاق اکثر سطحی ہوتا ہے) کو خوش کرنے کے لئے جو اشعار کہے جاتے ہیں اُن سے نہ صرف عزت نفس کو صدمہ پہونچتا ہے بلکہ شاعر کے جذبات کی قدرتی رَو بھی مدھم ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ تازگی و لطافت کا یک لخت خاتمہ ہو جاتا ہے۔

میر تقی میرؔ اور سوداؔ اس آفت سے نسبتہً محفوظ رہے۔ انکو دربار سے پنشن ملتی تھی اور انکے شاعرانہ افکار و مذاق میں بہت کم مداخلت کیگئی اسلئے وہ اوروں سے کسیقدر زیادہ آزاد رہے یہی وجہ ہے کہ اُنکے کلام میں دلّی اسکول کے خصوصیات بھی زیادہ نمایاں ہیں لیکن ابتک لکھنؤ میں برابر دلّی ہی کی تقلید کی جاتی تھی۔

تحریک نان کوآپریشن پر ایک سرسری نظر

(از پنڈت کشن پرشاد کول بی۔اے ممبر سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی)

ہمارے سیاسیات کا مطلع پھر گردآلود ہو رہا ہے جو ہوائیں چل رہی ہیں اُن سے اندیشہ ہے کہ کہیں پھر کوئی طوفان برپا ہو، غالباً جنوری ۱۹۳۰ء سے کامل آزادی کا جھنڈا اُٹھایا جائیگا اور وہیں کے بعد نان کوآپریشن کی تحریک کو پھر تازہ کیا جائیگا۔ایسی صورت میں بیجا نہیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس تحریک پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے اور حتی الامکان انصاف کی ترازو میں اسکو تولا جائے۔نان کوآپریشن کی تحریک کو گذرے ہوئے تقریباً دس برس ہوگئے۔اُس ہیجان اور طوفان کی حالت میں اسکے معاونین و مخالفین کو اسکی قابلیت و اہمیت دونوں کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔جذبات کا ہیجان نسبتاً اسوقت کم ہے لہذا، اب اس پر تحقیق کی نظر ڈالنا بہت مشکل نہوگا۔

۱۹۲۱ء کے دسمبر کے شروع میں ہندوستان کا آسمان سوراج کی صدا سے گونج رہا تھا۔اور زمین انقلاب کی شورش سے لرز رہی تھی لیکن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تجویز کی ناکامی سے اور ۳۱ دسمبر گزر جانے کے بعد جب سوراج سراب کی طرح آگے بڑھتا گیا اور یہ منزل مقصود طے ہوتی نظر نہ آئی تو قوم کی ہمتیں ٹوٹنے لگیں اور نان کوآپریشن کی تحریک تنزل کی صورت دیکھنے لگی، گو اسمیں شبہہ نہیں کہ زوال کے دور میں بھی اس نے کرشمے دکھائے، بالخصوص سکھ گردواروں کی اصلاح کی جدوجہد نے پھر ایک مرتبہ اسمیں جان ڈالدی تھی لیکن نان کوآپریشن کے عروج کا آفتاب اب نصف النہار سے گزر چکا تھا۔قوم کے جوش نے زوال کی منزلیں جلد جلد طے کرنی شروع کیں اور مہاتماجی کی گرفتاری کے بعد اسکا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اس تحریک کے شروع ہونے کے اوّل روز سے آج تک اُن لوگوں کی کمی نہیں رہی جنھوں نے اسکو قوم اور ملک کے لئے مضرت رساں سمجھکر اسکی مخالفت کی اور دوراندیشی سے کام لیکر قوم کو اسکے خطروں سے آگاہ کیا۔ان میں سے ایسے ایسے اکابران قوم اور محبان وطن بھی تھے جنھوں نے اپنی زندگی قوم کی خدمت میں صرف کی تھی اور جنکے دل میں قوم کا درد کسی سے کم نہ تھا۔انھوں نے بتایا کہ نان کوآپریشن

کا پروگرام بادی النظر میں کیسا ہی دلکش کیوں نہ معلوم ہو عملی صورت سے بیکار ثابت ہوگا۔ قوم ابھی اسکے لئے تیار نہیں ہے۔ اسکی ناکامی قوم پر مصیبتوں کا بار ڈالے گی اور پبلک لائف کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ملک کے امن وامان میں خلل پڑیگا اور شورش اور جوش سے ہر شخص فرعون بے سامان نظر آنے لگے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراضات بجا تھے اور واقعات وتجربات نے انھیں صحیح ثابت کیا، تاہم نان کوآپریشن کی تحریک پر اسکے ہمعصروں یا اُن لوگوں کی رائے جنھوں نے اس پر صرف ایک ہی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی ہے آخری فیصلہ نہیں سمجھی جاسکتی۔ جو لوگ میدان کارزار میں مصروف جدوجہد رہتے ہیں انکی نظریں دور تک نہیں جاتیں۔ معاصرین کی رائے مورخ کے فیصلہ کا مرتبہ نہیں رکھتی۔ نہ یہ آسانی سے باور ہوتا ہے کہ تمام قوم کا یہ طوفان جوش اور ولولۂ عظیم محض بدحواسی یا خود فراموشی کا نتیجہ تھا اور مہاتما جی کی سی عظیم الشان ہستی نے جنکا اسوقت ملک میں ثانی نہیں جو کچھ کیا وہ ایک مجذوب کامل یا بچوں کا کھیل تھا۔ مہاتما گاندھی نے کانگریس کی پالیسی نہیں بدلی بلکہ ملک میں انقلاب کا طوفان برپا کیا۔ قوم کی پستی اور بیچارگی کی موجودہ حالت میں اُس کُلیہ کے درست اور مناسب ہونے میں جسکی داغ بیل بانیان نیشنل کانگریس نے ڈالی تھی کسی صاحب رائے کی نگاہ میں دلیل کی گنجایش نہیں ہوسکتی۔ ہماری روزمرہ کی سیاسی جدوجہد اُسی دائرہ میں محدود ہوسکتی ہے جو حکومت وقت نے ہمارے لئے کھینچ دیا ہے۔ خود مختاری کی منزلیں درجہ بدرجہ ہی طے ہوسکتی ہیں۔ آئینی اور دستوری حکومت کا تجربہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ قوم کے کیرکٹر اور قابلیت کی خامیاں ایک دن میں دور نہیں ہوسکتیں اور صدیوں کی کھوئی ہوئی آزادی آن واحد میں واپس نہیں لیجاسکتی۔ جو موقعے آج حاصل ہیں اُنسے فائدہ اُٹھانا اور موقعوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہماری موجودہ صورت سیاسیات میں درست اور واجب پالیسی مانی جاسکتی ہے۔

آئے دن روٹھنے کا رویہ جو نان کوآپریشن کے فاتحہ پڑھنے کے بعد سوراج پارٹی والوں نے اختیار کیا تھا تجربہ نے ثابت کردیا کہ کارگر نہیں ہوتا۔ یہ سب صحیح ہے۔ تاہم صورت حاضرہ سے ذرا نگاہ اونچی کرکے اگر قوم کے مستقبل پر نظر ڈالی جائے تو ماننا پڑیگا کہ آئینی جدوجہد کی منزلیں طے کرتے کرتے ایکدن وہ وقت آئیگا، آج آئے یا کل، موجودہ نسل کی زندگی میں آئے یا آیندہ نسل میں جب قوم اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر بل بوتے کے زور پر حکومت برطانیہ سے پوری خود مختاری اور کامل آزادی کا مطالبہ کریگی اُسوقت کیا صورت پیش آئے گی، اسوقت وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ آیا مدبران برطانیہ اُلوالعزمی وبلند نظری سے کام لیکر اپنی خودغرضی کو بھلا دینگے اور بلاتعرض قوم کے لئے راستہ صاف چھوڑکر الگ کھڑے ہوجائینگے یا سدراہ ہوکر قدم قدم پر ہنگامہ ومجادلہ برپا کرینگے، یہ کہنا بہت دشوار ہے۔ تاریخ کی

روش اور زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ انقلاب و ہنگامہ لازمی ہے۔ کل کی بات ہے ابھی کچھ صدیاں اور نسلیں نہیں گذریں کہ جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ میں یہی ہوا۔ اگر قوم کی رفتار ترقی کے راستہ میں انقلاب و ہنگامہ لازمی ہے تو مہاتما گاندھی پر صرف ایک اعتراض ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ اُنھوں نے انقلاب کا طوفان قبل از وقت برپا کیا۔

یورُپ کی جنگ عظیم اور اُسکے خاتمہ کے بعد سے تین چار سال تک جسطرح سرزمین فرنگ انقلاب سے تہ و بالا ہوا کی۔ شورش جمہور کے ہنگاموں کی آندھیوں نے جسطرح بڑی سے بڑی سلطنتوں کو بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ پھینکا اور تاجداران نامدار کو تخت سے اُتار کر جسطرح خاک و خون میں آلودہ کیا اُسکی کوئی مثال کم از کم پچھلی صدی میں دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ زار روس کو جسکا دبدبۂ شاہی چار دانگ عالم میں تھا فوج اور رعیت نے آن واحد میں فنا فی النار کر دیا۔ روس میں بولشوزم کا سکہ چلنے لگا۔ قیصر ولیم کو جسکے نام سے نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا چار سال تک لرزتی رہی رعیّت کے ہاتھوں اُسی گھاٹ اُتارا گیا۔ آسٹریا کی عظیم الشان سلطنت نقشۂ فرنگ سے حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ اور نہ معلوم کتنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور حکومتیں یورپ کے اس ہنگامۂ انقلاب سے متاثر ہو کر جمہور کا دبدبہ ماننے لگیں۔ ٹرکی نے جسکا قلع قمع اور حصّے بخرے کرنے کا دول متحدہ نے تہیّہ کر لیا تھا خلیفہ اور سلطان کو بالائے طاق بٹھا کر چولا بدلا اور نیا جنم لیکر شان جمہوری دکھانے لگی۔ رضا شاہ پہلوی نے خاندان قاچار کا خاتمہ کر کے ایران میں آئینی و دستوری حکومت کی بنیادیں مستحکم کیں اسی زمانہ میں آئرلینڈ کُشت و خون میں مبتلا ہو کر رول کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ مصر نے بھی آزادی کا جھنڈا بلند کر دیا تھا۔ نہ صرف یورُپ اور مغربی ایشیا، انقلاب کے ہنگاموں میں مبتلا تھے بلکہ مشرق بعید میں آزادی کی خاطر چین میں بھی خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ غرضیکہ جمہور عالم آزادی کی ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ ہندوستان بھی اس ہوا سے غیر متاثر نہ تھا۔ انقلاب کے بعض قرینے موجود تھے۔ قحط و وبا نے رعیت کا ناک میں دم کر رکھا تھا حکومت کی زیادتیوں اور بے عنوانیوں نے عام بدظنی پھیلا رکھی تھی، خصوصاً پنجاب کے مظالم نے حکومت کا اعتبار رعیت کے دلوں سے قطعی اُٹھا دیا تھا۔ لوگ بیزار ہو کر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ اور دُنیا کے ہر حصّے سے انقلاب عظیم کی خبریں روز آ رہی تھیں۔ آزادی کا ولولہ طبیعتوں میں موجزن تھا۔ ایسی حالت میں اگر مہاتما نے انقلاب کا جھنڈا بلند کیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ صورت قرین قیاس نہ تھی۔ جس جوش و تپاک سے قوم نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور جس ایثار اور سرفروشی کا ثبوت اس نے اپنے رویہ سے دیا وہ اس قیاس کو یقین کے درجہ تک پہونچا تا تھا۔ یہ اعتراض کہ ملک کے تمام مدرسے اور کالج بالکل خالی

کیوں نہیں ہوگئے۔ کوئی شخص بھی کونسلوں کے پاس کیوں کھڑا ہوا۔ تمام ولایتی مال آنا کیوں نہیں بند ہوگیا۔ تمام سرکاری ملازمین اور وکلاء نے عدالتوں سے کنارہ کشی کیوں نہیں کرلی بالکل بے معنی ہے مقصود یہ تھا کہ حکومت کا دبدبہ رعیت کے دلوں سے اٹھ جائے۔ آزادی کی دھن میں مخالفت اور سرفروشی کی کیفیت طبیعتوں میں عام ہوجائے، انقلاب کے آنے اور اُسکے لئے آمادہ رہنے کا یقین عوام کے دلوں پر نقش ہوجائے اور اُسکی بیچینی ہر طرح کے ایثار اور سرفروشی کے لئے قوم کو تیار کردے۔ قوم میں یہ کیفیت اور یہ صورت مہاتما نے اپنی کشش کے اعجاز سے پیدا کردی تھی۔ سوراج کا یقین عام ہوگیا تھا۔ پھر بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ناکامی ہوئی تو محض اسوجہ سے کہ قوم میں کیرکٹر اور قابلیت کی کمی تھی۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن صرف ایک حد تک یعنی اس معنی میں کہ جب ہم اپنا مقابلہ مغرب کی اُولوالعزم اور نامور قوموں مثل برطانیہ، امریکہ، فرانس یا جرمنی سے کرتے ہیں تو انفرادی اور قومی دونوں حیثیتوں سے ہمیں اپنی پونجی نہایت ہیچ اور حقیر معلوم ہوتی ہے جسکے معنی صرف یہ ہیں کہ ان قوموں کے ہم پلہ ہونے یا انکی سی ترقی اور عظمت حاصل کرنے کے لئے ہمیں ابھی منزلوں سفر طے کرنا ہے اور نسلوں بعد یہ ارمان پورے ہونگے لیکن اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ قوم میں انقلاب برپا کرنے یا آزادی حاصل کرنے کی اہلیت نہیں۔ انقلاب برپا کرنے اور آزادی حاصل کرنے کے بعد آج بھی آئرلینڈ اور جنوبی افریقہ کسی صورت سے برطانیہ کے ہم پلہ نہیں کہے جاسکتے، نہ ہندوستان سے ہی اُنکا مرتبہ زیادہ اونچا ہے۔ ایران اور ٹرکی بعض معاملوں میں ہندوستان کے ہم پلہ ہوں لیکن بہت سی صورتوں میں ہندوستان سے بھی منزلوں پیچھے ہیں لیکن انقلاب برپا کرتے۔ دول فرنگ کے چنگلوں سے نکلنے اور جمہوریت کا دور قائم کرنے میں انکو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ روس یورپ میں سب سے دقیانوس قوم سمجھی جاتی ہے۔ اور آج بھی برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کے مقابلے میں اُسکا کہیں شمار نہیں۔ لیکن زار روس کی بیخ کنی کرنے میں اُسنے پس و پیش نہ کیا۔ رہا یہ امر کہ ہمکو اسوقت بھی باوصف محکومیت غیر کے موجودہ دستور حکومت میں موقعے حاصل ہیں کہ ہم قوم کے کیرکٹر اور قابلیت کے مستحکم کرنے اور ترقی کی جانب قدم اُٹھانے میں کوشش کرسکتے ہیں۔ صحیح ہے لیکن یہ بھی صرف ایک حد تک، ورنہ در اصل قوم اپنی مشکلات اسیوقت حل کرسکے گی اور ترقی کی منزلیں آسانی اور تیز رفتاری سے اسیوقت طے ہوسکیں گی جب اسکو حکومت خود اختیاری اور آزادی حاصل ہوگی۔ اِن صورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا کہ قوم انقلاب کے لئے تیار نہ تھی اور مہاتما نے سراسر غلطی کی قرین انصاف نہیں۔ تاہم اگر تحریک انقلاب تکمیل پر نہ پہونچ سکی تو اسوجہ سے نہیں کہ قوم اسکے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ یا انقلاب کی شرطیں اور صورتیں موجود نہ تھیں یا اسوجہ سے کہ معدودے چند اکابران قوم نے

نہ صرف پہلوتہی بلکہ مخالفت کی۔ کیا قوم کے اُمنڈتے ہوئے دریا کی لہروں کو چند شخص خواہ کیسے ہی پہلوان کیوں نہ ہوں روک سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہاتما کا اعلان جنگ تو اس تبسم زا مثل کا مصداق تھا کہ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں،

اسکا تو وہی حشر ہونا تھا جو ہوا۔ قطع نظر اسکے کہ یہ مہاتما کا ایمان تھا، ممکن ہے کہ دُنیا کو اس عقیدے پر ایمان لاتے ہوئے ابھی صدیاں گذریں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کی موجودہ حالت میں شمشیر بے نیام کرنا یا کسی دوسری شرط کے ساتھ انقلاب برپا کرنا نہ صرف خودکشی کے بمنزلہ ہوتا، بلکہ اسکی کامیابی کی کوئی صورت امکانی نہ تھی۔ راقم الحروف کی رائے میں اس انقلاب عظیم کی ناکامی محض سوء اتفاق تھی کہ عین موقع پر جب مہاتما قوم کی ہمتوں کو پر لگاتے ہوئے سرفروشی کے لئے آمادہ کرکے دور انقلاب کے ہفتخوان طے کرتے ہوئے بردولی کے میدان میں پہونچے تھے، ہندوستان کے خطۂ مردم خیز سے کوئی اس پایہ کی ہستی اور ایسا مرد کارزار جیسے کہ مصطفےٰ کمال پاشا یا رضا شاہ پہلوی ہیں منودار نہ ہوا جسکا جادو نہ صرف قوم پر چلتا رہتا بلکہ جو اپنا سکہ فوج پر بھی جما کر حکومت کا تختہ اُلٹنے کی ہمت کرتا۔ تحریک انقلاب کی باگیں مہاتما جی کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں میں لیکر حکومت کا مقابلہ کرتا۔ فتح ہوتی تو قوم کے اقبال کا ستارہ چمکنے لگتا، شکست ہوتی تب بھی قوم کے جوہر کھُل جاتے اور سوراج کا مقصود دو چار منزل قریب تر ہو جاتا۔ یہ سچ ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کی رفتار قوانین قدرت کی پابند ہے اور بالخصوص مغرب میں علم اور سائنس کے تجربوں سے کام لیکر دانایان فرنگ نے قوموں کی ترقی کے نظام عمل کی ترتیب میں گھڑی کے پُرزوں کی سی صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ خاص صورتیں پیدا کرنے کے لئے خاص اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم خامی کا باقی رہ جانا خاصۂ انسانیت ہے اور حادثہ اور اتفاق کا عنصر ابھی تک انسانی زندگی سے مٹا نہیں ہے۔ یورپ ہی کی پچھلی ایک صدی کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی روش اور رفتار ابھی تک اس مثل کی پابند ہے کہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ محض اتفاق تھا کہ بلوکر کو میدان کارزار میں پہونچنے میں دیر ہوئی ورنہ نپولین کا حشر اس سے بالکل مختلف ہوتا جو ہوا۔ اور یورپ کی پچھلی ایک صدی کی تاریخ دوسرے ہی عنوان سے لکھی جاتی۔ اگر گریبالڈی عین موقع پر منودار نہ ہوتا تو میزینی کی انقلاب انگیز سحر بیانی اور کیوور کی تدبیر حکومت کی ریشہ دوانیاں اطالیہ کی گلو خلاصی کرا سکتیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اگر پریسیڈنٹ ولسن اپنی سادہ مزاجی کی بدولت دول متحدہ کی گندم نما جو فروشی

کی ڈپلومیسی کا شکار نہ بنتے اور انکے آڑے وقت میں امریکہ کی فوجیں عین وقت پر پہونچکر جنگ کا رُخ نہ بدل دیتیں تو صلحنامہ وارساکی بجائے برلن میں ترتیب پاتا۔ اور یورپ کا نقشہ آج بالکل بدلا ہوا نظر آتا۔ دولت عثمانیہ کی نزع کی حالت تھی ہر شخص یقین کرتا تھا کہ اسکا آخری وقت آپہونچا دول اتحاد اس صلاح و مشورے میں مشغول تھے کہ اسکے حصے بخرے کی تقسیم کس طرح کی جائے کہ مصطفیٰ کمال پاشا غیب سے نمودار ہوا اور آج ٹرکی جیتی جاگتی ترقی کی منزلیں جلد جلد طے کر رہی ہے۔ لہذا یہ خیال کہ نان کو آپریشن کی تحریک کی ناکامی محض اتفاقیہ تھی ودراز کار نہیں۔ اگر یہ ہوتا تو کیا ہوتا اب سوچنا بیکار ہے واقعہ وہ ہے جو ہوا۔ ہندوستان کی بیداری کی پچاس سال کی تاریخ میں نان کوآپریشن کی تحریک پہلی عظیم الشان تحریک تھی جسنے دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کی اور اُسکا چرچا ہوا۔ جیساکہ تمام بڑی کوششوں اور تحریکوں کی ناکامی کا خمیازہ ہوتا ہے نان کوآپریشن کی تحریک بھی تباہی اور ابتری اپنے ورثہ میں چھوڑ گئی۔ پبلک لائف کا شیرازہ تتر بتر ہوگیا اور سب سے زیادہ بُرا یہ ہوا کہ قوم میں مذہبی خانہ جنگی اور خونریزی کا طوفان برپا ہوگیا تاہم کفران نعمت ہوگا کہ اسکا اعتراف نہ کیا جائے کہ اسنے ملک کو نفع بھی پہونچایا۔ ہم اپنی پست ہمتی اور بزدلی، خود غرضی اور قوم فروشی۔ ناقابلیت اور جاہلیت اور نیز کیرکٹر کی بہت سی خامیوں کے برتنے اور دیکھنے کے تو اسقدر عادی ہوگئے ہیں کہ انکا اظہار کسی کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ گو عارضی طور سے ہی سہی نان کوآپریشن کی تحریک نے قوم کی ہمت اور ایثار کا وہ دلخوش کن جلوہ دکھلایا جسکی یاد ہماری ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو کچھ سہارا دیتی ہے' اس عارضی فائدہ سے قطع نظر کرکے سب سے بڑی بات جو نان کوآپریشن نے کی یہ تھی کہ ہندوستانیوں کے دلوں سے گورے چمڑے کا ڈر اور حکومت کی ہیبت ہمیشہ کے لئے نکال دی اور قوم کے جمہور عام میں وہ سیاسی بیداری پھیلائی کہ جو پچھلے پچاس سال میں کبھی ممکن نہ ہوسکی تھی۔ اور یہ بہت بڑی بات ہوئی۔ یہ بات دوسری ہے کہ قوم کی بیداری کی پہلی کروٹ جیسی ہی بھلی معلوم ہوتی تھی دوسری کروٹ ویسی ہی بُری اور بھیانک دکھائی دیتی ہے' اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ قوم صدیوں کی نیند سے بیدار ہوکر کروٹیں بدل رہی ہے۔ ابھی اُس کی آنکھیں پورے طور سے کھلی نہیں ہیں اِدھر اُدھر کے راستوں پر بھٹک رہی ہے۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ٹھیک راستے پر آجائیگی۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ قوم میں نقل وحرکت تو پیدا ہوئی اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نان کوآپریشن کے بدولت۔

یہ تو ظاہر ہے کہ معمولی آئینی جدوجہد کے طریقے حکومت وقت کے خلاف کارگر نہیں ثابت ہورہے ہیں اور غالباً ان لوگوں کی اُمیدیں بھی جنھوں نے لیبر گورنمنٹ کے عہد حکومت کے ساتھ بہت کچھ فائدہ

کی صورتیں سوچ رکھی ہیں رائیگاں جائینگی لیکن اُسی کے ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ آیا موجودہ صورت میں کامل آزادی کا جھنڈا اُٹھانا اور پھر طوفان انقلاب برپا کرنا ملک کے لئے زیادہ سودمند ہوگا؟ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۲۱ء میں جو فضا تھی اور کامیابی کی جو صورتیں اُسوقت نمایاں تھیں وہ آج نہیں۔ ایسی حالت میں بار بار اعلان جنگ کرنا اور پے در پے شکست کھانا قوم کے ولولوں کو بجائے اُبھارنے کے اُسکی ہمتوں کو اور زیادہ پست کریگا۔

نیشنل پریس ریڈرز

لالہ رام نراین لال بُک سیلر الہ آباد نے اپنی اُلوالعزمی سے نیشنل پریس اُردو ریڈرز کے نام سے اُردو کی چھوٹی چھوٹی دلچسپ کتابوں کا ایک خوبصورت سلسلہ بھی شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں ان طالبعلموں کے لئے مرتب کی گئی ہیں جو معمولی طور پر اُردو زبان سے واقف ہوں۔ ان کے مطالعہ سے طلباء کی معلومات میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی انمیں مطالعہ کتب کا شوق بھی ترقی پذیر ہونے کی اُمید ہے۔ سب کتابوں کی زبان صاف اور سادہ ہے۔

اسوقت تک اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہو چکی ہیں جنکے لئے پبلشر صاحب مستحق مبارکباد ہیں

(۱) ہزار داستان (۲) علی بابا اور چالیس چور
(۳) کروسو سیاح (۴) ڈینس کا سیاح
(۵) اوتاروں کے قصے (۶) راجہ ہریشچندر

بچوں کے لئے یہ کتابیں خاص طور پر دلکش ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب اچھا اور قابل پسند ہے۔

بھگوت گیتا (مع اُردو ترجمہ)

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں سری بھگوت گیتا نہایت مشہور و مقبول عام کتاب ہے؛ دنیا کی قریب قریب تمام زبانوں میں اسکے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اُردو میں بھی نظم و نثر کے کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں مگر پیش نظر کتاب میں اصل و ترجمہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ ترجمہ سلیس و رواں اور مشرح ہے۔ گیتا کے مطالب کی بابت کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، اسکی تعلیم صد درجہ قابل قدر و مفید عام ہے۔ کتاب کا سرورق رنگین اور سری کرشن مہاراج کی تصویر سے مزین ہے عمدہ سنہری جلد نے اسکے محاسن ظاہری میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ یہ ترجمہ اُردو داں اصحاب کی قدردانی کا مستحق ہے۔

مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے طلب کیجئے۔

خلجی بغاوت

از مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم۔ اے ایل ایل بی (علیگ) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ لندن ایڈووکیٹ

تعارف | یوں تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ ۶۳۶ء سے شروع ہوتی ہے جبکہ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کا ایک غارتگر گروہ تانہ پر حملہ آور ہوا اور اپنے دلیر مگر بد قسمت نوجوان رئیسِ عساکر محمد بن قاسم[1] کی قیادت میں سندھ کی سرزمین پر تسلط کر کے ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی، لیکن دہلی میں مسلمانوں کی تاریخ کا آغاز سنہ ۱۲۰۶ء سے ہوا جبکہ شہاب الدین محمد غوری کے نائب سلطنت قطب الدین ایبک نے سلطنت غلامان کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت کیا تھی طوائف الملوکی، ہنگامہ آرائی، بغاوت، سازش اور قتل و غارت کا ایک تسبیحی دور تھا جس نے خلجیوں[2] کے لئے جو اعضائے حکومت کے مفلوج ہو جانے سے اپنی قوت کو خاموشی کیساتھ مستحکم کرتے رہے تھے علم بغاوت بلند کرنے اور پہلی اور آخری بار اپنی قسمت آزمائی کا موقعہ دیا۔

خلجیوں کی بغاوت اور حکمران غلام خاندان کے خاتمہ کے بعد دہلی کے تخت پر تسلط کرنا ہند کی سلطنت اسلامیہ ترکیہ کی تاریخ میں خلجی بغاوت کے نام سے موسوم ہے، خلجی بغاوت کی جو تاریخی اہمیت ہے وہ چند لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی، یہ بہت تفصیل طلب اور دلچسپیوں سے لبریز داستان ہے۔

خلجیوں کی اصل | خلجی کون تھے اور انکی حقیقت کیا تھی؟ راورٹی انکو ترکوں میں شمار کرتا ہے لیکن اس کا معاصر مورخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی جسکا باپ اور چچا دونوں شاہی ملازم تھے، (باپ برن میں اور چچا کڑا اور اودھ میں رہے تھے اور اسوجہ سے اُسکے ذرائع اطلاع معاصر مورخین سے زیادہ

---

[1] محمد بن قاسم کا انجام تاریخ ہند کا ایک دلدوز و جگر خراش واقعہ ہے، جسکی تفصیل بیان کرنیکا یہ موقع نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اُسکو ہندوستان کی سرزمین پر علم اسلام نصب کرنیکا صلہ یہ ملا کہ وہ حجاج کے حکم سے نہایت سفاکی سے قتل کیا گیا۔

[2] خلجی ترکی سرفروشوں کے ایک گروہ یا قبیلہ کا نام تھا جو اپنے سن رسیدہ پختہ کار سردار جلال الدین فیروز کی سرکردگی میں اُبھرے اور پھر خاندان غلامان کا استیصال کر کے برسر حکومت ہو گئے۔

قابل وثوق ہیں) لکھتا ہے کہ:-

"جلال[1] فیروز اس نسل سے تھا جو ترکوں سے بالکل مختلف تھی"

لیکن درحقیقت خلجی قصبہ خلج کے جو افغانستان میں واقع ہے رہنے والے تھے اور اسی نام سے مشہور ہو گئے تھے، انکی نسل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے[2]۔ اگرچہ یہ ترک تھے لیکن افغانوں سے اسقدر مخلوط ہو گئے تھے کہ انمیں اور افغانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ ہندوستان میں یہ پٹھان کہلاتے تھے۔ بہرکیف اس قبیلہ کے افراد شمالی ہندوستان میں بنگال تک پھیلے ہوئے تھے، اور سلطنت غلامان کے عہد میں جابجا ممتاز عہدوں پر بھی فائز ہو گئے تھے، دہلی میں خلجی اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور خود جلال الدین جو ایک با اقتدار فوجی افسر کی حیثیت رکھتا تھا، ارکان سلطنت کا محسود تھا، ذمہ دار وقت کے رفقاء اس سے کھٹکتے تھے اور موقع پاکر اسکو قتل کر دینے کی فکر میں تھے مگر کسکو معلوم تھا کہ یہ بڈھا جو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہے اسلامی سلطنت دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہوگا اور ایک دن برسر اقتدار ہوکر ایک ایسے خاندان کا بانی ہوگا جو کم و بیش ربع صدی (۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۱ء تک) ہندوستان کو اپنے زیر نگیں رکھکر ملک کی تاریخ میں ایک جدید باب کا اضافہ کریگا اور اس کا ایک حکمران علاؤ الدین خلجی (۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۶ء تک) ہندوستان کے ان معدودے چند اولوالعزم مسلمان سلاطین میں ہوگا جنکی مثالیں اسلام کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں شاذ ہیں۔

دہلی کی سیاسی فضا اور بغاوت کے اسباب

۱۲۸۷ء میں بلبن اپنی چالیس سالہ حکومت کے بعد تہ خاک ہو چکا تھا۔ اتنک ہندوستان میں حکومت کے فلسفہ کو اس سے بہتر کسی نے نہ سمجھا تھا، اس نے بڑے شکوہ و شوکت اور دبدبہ و استقلال سے حکومت کی۔ خلوت میں بھی ملازمین بغیر وردی کے حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ کسی نے اسکو کبھی بھی قہقہہ مارتے نہیں سنا تھا۔ اسکی تعلیم بہترین اصول کے ماتحت ہوئی تھی۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ [2] فرشتہ، صاحب تاریخ سلجوقیاں سے نقل کرتا ہے کہ ترک بن یافث کے گیارہ فرزند تھے۔ انمیں ایک "خلج" کے نام سے موسوم تھا، جس سے اسکی اولاد کا نام خلجی ہو گیا، مگر نظام الدین بخشی اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "میں نے ایک معتبر تاریخ میں پڑھا ہے کہ خلجی قالج خاں کی اولاد ہیں، جو چنگیز کا داماد تھا، اور اپنی بیوی سے آزردہ خاطر رہتا تھا، قالج چنگیز کے خوف سے کوہستان غور کیطرف فرار ہو گیا اور وہاں اپنی چھوٹی ریاست میں جاکر بیٹھ گیا، قالج میں تحریف ہوکر خالج ہوا اور پھر رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے خلج ہی رہ گیا۔ بخشی کسی تاریخ کا نام نہیں لکھتا۔ قالج اور قلیج ترکی زبان میں شمشیر کو کہتے ہیں۔

لہو ولعب سے اسکو فطری تنفر تھا۔ دربار میں آداب کا بہت لحاظ رکھا جاتا۔ مسخرا پن، یا غیر سنجیدہ کلام تعزیر کا مستوجب ہوتا تھا۔ عنفوان شباب میں اُس نے شراب ضرور پی تھی لیکن سریر آرا ہونے کے بعد پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ اسکے سامنے شراب کا نام لیتا۔ چالیس سال کی حکومت میں جسمیں بیس سال وزارت کے اور بیس سال سلطنت کے شامل ہیں کوئی موقع ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جہاں اس نے ادنیٰ طبقہ کے کسی فرد سے گفتگو بھی کی ہو خدمات محمودہ کی تفویض میں وہ نجابت خاندان کا بڑا خیال رکھتا اور کمتر درجہ کے لوگوں کو کبھی کوئی ذرہ دارانہ خدمت نہ دیتا تھا کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ غلام نہیں تھا لیکن ایسا غلام تھا جسکا خاندان ایک مدت سے حکمرانی کرتا چلا آتا تھا بلبن غلام پھر سقہ، پھر محافظ شکارگاہ، پھر سپہ سالار۔ پھر مدبر وزیر اور آخر میں خود سلطان غیاث الدین بلبن دہلی کے سلاطین میں ایک ایسی شخصیت ہے جسکی زندگی اور جسکا عہد حکومت تاریخ ہند میں ایک مستقل باب ہے،

۶۸۶ھ میں جیسا کہ ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں یہ عظیم القدر ہستی دنیا سے اُٹھ چکی تھی، لیکن بدقسمتی سے غیاث الدین کی حکومت کی پالیسی ملک اور خود خاندان غلامان کے مستقبل کو تیرہ و تار بنانے والی تھی، التمش نے حکومت کی استعداد رکھنے والے متعدد غلام تیار کیے تھے لیکن بلبن نے ابھرنیوالے رگوں کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا تھا۔ اور اپنی اُمیدیں اپنے اُس فرزند کے دامن سے وابستہ کی تھیں جسکی عمر نے وفا نہ کی اور موت نے ضعیف باپ کی حیات ہی میں اُسکو دبوچ لیا۔ بغرہ اُسکی قسمت میں دہلی کا تخت نہ تھا، بلبن بستر مرگ پر نزع کے عالم میں تھا کہ بغرا کے دل میں نہ معلوم کیا سمائی کہ باپ کو اس حالت میں چھوڑ کر بنگال کی راہ لی۔ مجبوراً بلبن نے متوفی فرزند کے نوعمر لڑکے کو ولیعہد نامزد کیا لیکن اس بدنصیب کو تخت دہلی پر متمکن ہونا نصیب نہ ہوا، بلبن کی آنکھ بند ہوتے ہی طوائف الملوکی، ہنگامہ آرائی سازشیں اور بغاوتیں رونما ہونے لگیں جو قرون وسطیٰ ہند کی خصوصیات تھیں۔ اُمرا نے بغرا کے فرزند کو جسکی عمر بمشکل سترہ سال ہوگی متوفی سلطان کا جانشین بنا کر اُس تخت پر بٹھا دیا جسپر التمش اور بلبن ایسے بیدار مغز سلاطین بھی چین سے نہ بیٹھ سکے تھے۔

کیقباد کی تعلیم بہترین عنوان سے ہوئی تھی۔ شباب کا آغاز تھا اور ہنوز اُسے دنیا کا تجربہ حاصل نہ ہوا تھا البتہ رائج الوقت علوم و فنون سے آراستہ تھا، لیکن اسے اپنے علم کو عمل کی کسوٹی پر کسنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لذات زندگی سے ناآشنا نوجوان نے جب آنکھیں کھولیں اور ہر شخص کو اپنے سامنے دست بستہ کھڑے دیکھا تو ایسا کھو گیا کہ سلطنت کرنا تو درکنار اسکو اپنی جان تک کا بھی ہوش نہ رہا۔ تین سال کی مسلسل مے نوشی اور تعیش نے اسکو کہیں کا نہ رکھا۔ اعضائے حکومت میں اضمحلال پیدا ہو گیا، اُدھر سلطان کے افعال کردار کے مضر اثرات اسکی صحت کو برباد کرنے لگے یہانتک درخت کی جڑ کی طرح اسمیں گھن لگ گیا۔

اسوقت نظام الدین وزیر تھا اور وہ ایسا اختیار و با اقتدار تھا کہ حکومت کی تمام کنجیاں اسکے ہاتھ میں تھیں۔ باپ نے بیٹے کو کچھ نصیحتیں بھی کی تھیں جنمیں سے ایک نقش ذہن کا رطاق نسیاں ہونے سے رہ گئی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ "کبھی وزیر یا اُمرا کو سر پر نہ چڑھانا" کیقباد تھا تو بے دست و پا تاہم جری اجداد کا خون اسکی رگوں میں جاری تھا۔ اسکو خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہو کہ نظام الدین کا وار چل جائے اور وہ مجھے تخت سے اُتار دے۔ بہتر ہے کہ اسکو دارالسلطنت سے دور پھینکدوں۔ خیال عاقبت اندیشانہ تھا لیکن اسکو جامۂ عمل پہنانے کے لئے حسنِ تدبیر کی ضرورت تھی، جو سلطان کی قدرت سے باہر تھی۔ ایک دن بھرے دربار میں نظام الدین کو ملتان جانے کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن زمانہ شناس وزیر فوراً تاڑ گیا اور دل کڑا کرکے صاف انکار کر بیٹھا۔ امرا کو یہ بدتہذیبی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا بہانہ ہو گئی۔ نوعمر سلطان نے جب اُمرا کی کمک دیکھی تو انجام پر نظر کئے بغیر وزیر کا قلع قمع کرا دیا۔ اس واقعہ سے کچھ دنوں کے بعد ہی سلطان فالج میں مبتلا ہو گیا جس سے دارالسلطنت میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اُمرا نے تخت و تاج کے حصول کی حرص و آز میں تگ و دو شروع کر دی، جتھابندیاں شروع ہونے لگیں۔ تلواریں نیاموں میں موقع و محل کے انتظار میں تھیں۔ ترکی اُمرا نے اس موقع پر دوسری چال چلی، اُنھوں نے باہمی اختلافات کو دور کرکے بیرونی اقوام کے مقابلہ میں متحدہ محاذ پیش کرنا چاہا۔ اِن بیرونی اقوام میں سربرآوردہ تھے تو خلجی جو تمام قلمروئے سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے اور ترکی اُمرا کے پہلو میں خار کی طرح کھٹک رہے تھے۔ خلجیوں کی ایک فہرست تیار کی گئی جسمیں سب سے پہلا جلال الدین کا نام تھا اور یہ کوشش ہوئی کہ رفتہ رفتہ اِن سب کا استیصال کر دیا جائے۔ جلال الدین کو بھی اسکی کسی نہ کسی طرح خبر لگ ہی گئی اور اُس نے اپنی مختصر جماعت کو ہمراہ لیکر مدافعانہ تیاریاں شروع کر دیں۔ ملک اتمبر کچھر باریک وہ شخص ہے جس نے جلال الدین کے قتل کا بیڑا اُٹھایا تھا لیکن اسکو کیا خبر کہ قدرت جلال الدین کی نسل سے کیا کرشمے ظہور پذیر کرنے والی تھی۔ کچھر باریک اس فکر میں تھا کہ جلال الدین کو دام تزویر میں لاکر کوشک شمسی میں اس کا کام تمام کر دے۔ اِدھر جلال الدین کے رفقاء آخری دم تک اسکی حفاظت کرنے اور اپنے سردار کے قدموں پر سر نثار کر دینے کے لئے کمربستہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھر باریک پہونچا لیکن ہنوز گھوڑے پر سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ کمینگاہ سے ایک جلالی سردار نے بڑھکر تلوار کا ایسا تلا ہوا ہاتھ مارا کہ کچھر باریک کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ اب بے سری فوج کیا لڑتی۔ چند سوار جو مقتول ملک کے ساتھ تھے اسیر کر لئے گئے۔

یہ نازک وقت تھا اگر خلجی اس کامیابی سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے اور آیندہ کی فکر نہ کرتے تو غالباً اُنکا وجود ہندوستان کی تاریخ میں باقی نہ رہتا۔ لیکن جیسا کہ شکسپیر نے اپنے ڈرامہ جولیس سیزر میں کہا ہے

کہ "انسانی زندگی ایک ایسے سمندر کی مثال ہے جسمیں تموج ہوتا رہتا ہے۔ کبھی موج بڑھتی ہے اور کبھی پیچھے ہٹتی ہے۔ اگر موج کے بڑھتے وقت انسان تغافل برتے تو اسکا مستقبل تیرہ و تار ہوتا ہے اور اسکی آیندہ زندگی ایسے پایاب دریا میں غرق ہو جاتی ہے جس سے پھر اُبھرنے کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔" یہ خلجیوں کی موت و زیست کا وقت تھا۔ آن واحد کا تغافل انکو صفحۂ ہستی سے معدوم کرسکتا تھا لیکن خانخاناں اور الغ خاں جلال الدین کے بیٹے نے بڑی جرأت سے کام لیا اور صرف پچاس سرفروشوں کو ساتھ لیکر حرم سرائے سلطانی سے سہ سالہ سلطان کو جسکو شمس الدین کیومرث کے لقب سے ترکی اُمرا نے تخت پر متمکن کردیا تھا۔ اُٹھا لائے۔ اسوقت جلال بہار پور کیمپ میں تھا۔ جہاں ملک امتیر کچھن باربک کا قتل واقع ہوا تھا۔

کچھ دنوں تک تو جلال الدین کیومرث کے مدار المہام سلطنت کی حیثیت سے سلطنت کرتا رہا لیکن بہت جلد قسمت نے سلاطین غلامان کے تاج کو اسکے قدموں پر رکھدیا۔ معز الدین کیقباد ابھی زندہ تھا لیکن پیمانہ بھر چکا تھا چھلکنے کی دیر تھی۔ ایک ترکی ملک نے جسکا باپ سلطان کے حکم سے قتل کیا گیا تھا آخر جان بلب سلطان سے انتقام لے ہی لیا اور کوشک کیلوکھری میں موقع پاکر سلطنت غلامان کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کردیا۔ جلال الدین سلطان کے قتل کی خبر پاتے ہی بہار پور سے دہلی میں آیا اور کوشک معزی میں سریر آرا ہوا۔ اسطرح خلجی قسمت آزماؤں کی بغاوت جو درحقیقت سرکشی نہیں بلکہ ایک مدافعانہ کوشش تھی آخر کار ایسی صورت میں آگئی کہ خلجی جو اپنی ہستی کی خیر منا رہے تھے دہلی کے تخت و تاج کے مالک بن گئے۔

تاریخی اہمیت بادی النظر میں خلجی بغاوت۔ ہند کے دور وسطیٰ کی ہزاروں بغاوتوں میں سے ایک بغاوت ہے اور اس قابل نہیں کہ اسکو کوئی تاریخی اہمیت دیجاسکے، لیکن درحقیقت یہ واقعہ سلطنت اسلامیہ ہند کی تاریخ میں پہلا باب ہے جسکا تسلسل صرف ترکی سلطنت کے خاتمہ ہی پر نہیں ٹوٹتا بلکہ ایک طویل زنجیر کیطرح ۱۸۵۷ء تک پھیلتا ہے جب آخری مغل تاجدار اپنی نام نہاد کامرانی سے دست کش ہونے پر مجبور کیا گیا۔ یوں تو کہنے کو محمد غوری کے غارتگر حملوں کے بعد قطب الدین ایبک نے جو اپنے آقا کے ساتھ راہ خدا میں خون بہانے والوں میں پیش پیش تھا سر پر تاج رکھکر اور تخت دہلی پر بیٹھکر ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد قائم کردی تھی اگرچہ اسوقت کے حالات میں یہ ایک بہتر تبدیلی تو تھی مگر اس انقلاب میں حکومت اسلامیہ کے قیام و قرار کی ضمانت نہ تھی۔ ترکوں کی سلطنت کی نوعیت فوجی تھی، اور وہ صرف سپاہ کے بل بوتے پر حکومت کررہے تھے وہ عناصر جو سلطنت کے قرار و استقامت کے اجزاء لاینفک ہیں۔ اسمیں مفقود تھے۔ بات ایک ہی تھی خواہ محمود غزنوی اور محمد غوری بار بار ہندوستان کی زرخیز سرزمین کو

اپنی زر و جواہر کی حرص و آز میں مبتلا سپاہ کا جولانگاہ بناتے اور منوں چاندی سونا لوٹ کر لیجاتے یا قطب الدین ایبک اور اسکے اسلاف کا ہے ماہے دہلی میں بیٹھکر قرب وجوار کی ریاستوں اور راجاؤں پر ہاتھ صاف کرتے اور چھاپے مارتے اور سلطانی خزائن کو پانی کی طرح بہانے کے لئے پُر کرتے۔ محمودی جذبہ جو مذہب کی آڑ میں ہندوستان کی آبادی یا دوسرے الفاظ میں حاکم و محکوم۔ مرکزی حکومت اور رعایا میں مغائرت پیدا کئے ہوئے تھا مسلمانوں کے قدم جمنے نہ دیتا تھا۔ اور ایک ایسا مستقل خطرہ تھا جس سے اسلامی سلطنت دہلی ہر وقت اکثریت کے دباؤ اور عظیم تر قوت سے مغلوب ہو کر نابود ہو سکتی تھی، اسمیں ذرا بھی کلام نہیں کہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے ہندوستان کی قریات کی زندگی کا بندھن کھل چکا تھا۔ ہندو قوت کے اجزا میں انتشار تھا اور وہ فاتحین اسلام بعدہ ایک کے بعد سلاطین اسلام کے مقابلہ میں اپنی شیرازہ بندی کرکے اجتماعی قوت سے نہیں آسکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ ہندوستان کی آبادی کا زبردست عنصر تھے۔ اور مسلم بھی تھے۔ ان کا مذہب جدا، معاشرت مختلف۔ روایات مختلف تھیں۔ اسطرح سلطان اور رعایا کے درمیان ایک عمیق خلیج حائل تھی جو کسی طرح پٹ نہ سکتی تھی۔ رواداری مذہب ہی ایک ایسا آلہ تھی جو درمیانی اختلافات کو دور کر سکتی تھی۔ علاء الدین سلاطین خلجیہ بلکہ سلاطین اسلام میں پہلا سلطان ہے جس نے اس راز کو سمجھا اور رواداری مذہب کا وہ راستہ دکھایا جس پر جلال الدین محمد اکبر آخر کار چل ہی نکلا۔ قاضی بیانہ اور سلطان کی گفتگو ہمارے اس مبحث پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ یہاں پر ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں اور طوالت کے خوف سے اسکو درج نہیں کرنا چاہتے۔

بہرکیف اس اعتبار سے ملک کی عنان حکومت کا خلجیوں کے ہاتھ میں جانا ہی اسلامی سلطنت دہلی کے استقلال کی ضمانت تھا، اور خلجی بغاوت کے بعد سے دہلی میں جلال الدین فیروز کے سر پرآرا ہونے کے ساتھ ہی اسلامی سلطنت ترکیہ کے قیام و قرار کی داغ بیل پڑگئی اور وہ بہت جلد اسکے جانشین علاؤالدین خلجی کے دور میں رونما ہونے لگی تھی۔ عہد علائی کا دیباچہ خلجی بغاوت ہے اور عہد علائی تاریخ اسلامیہ ہند کا پہلا باب ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ خلجی بغاوت ہی تاریخ اسلامیہ ہند کا پہلا باب ہے کسی طرح بیجا ہوگا۔

رسید کتب

کلیات عارف - (فارسی) از نواب خاقان حسین صاحب عارف رئیس کانپور

چند منظوم - از مولانا احسن مارہروی۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ۔ قیمت ۴ر

کایستھوں کی تاریخ - (انگریزی) از مسٹر گوپی ناتھ سنہا۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ، مینیجر مدراس ۵۵ محلہ قانون گویان بریلی

پیغمبر اسلام کا حسن اخلاق

از مولانا سعید انصاری - سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

آجکل ہندوستان میں مختلف مذاہب کے پیروؤں میں جو اختلاف و نفاق پایا جاتا ہے وہ ملک کے امن و امان اور باشندوں کی دلجمعی و فارغ البالی دونوں کے لئے سخت ضرر رساں ہے۔ اگر تعصب کو ترک کرکے حسن اخلاق و رواداری سے کام لیا جائے اور مختلف مذاہب کے بانیوں کے طرز عمل پر غور کیا جائے تو اس بات کی حقیقت کہ کوئی مذہب باہمی عناد کی تعلیم نہیں دیتا ہو خود بخود روشن ہو جائے گی۔ یہاں پیغمبر اسلام کے حسن اخلاق کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ بانیٔ اسلام اپنے وقت میں فتنہ و فساد کو فرو کرنے کے لئے کسقدر صبر و تحمل، عفو و کرم سے کام لیتا ہے اور اسکے نتائج کسقدر خوشگوار نکلتے ہیں۔

حضور سرورکائناتؐ اور کفار مکہ

پیغمبر اسلام کو قریش نے گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسم اطہر پر نجاستیں ڈالیں، گلے میں پھندا ڈالکر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ کبھی جادوگر کبھی پاگل، کبھی شاعر کہا، لیکن آپ نے کبھی انکی باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی۔

ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر، اور خود آنحضرت صلعم پر جو پیہم مظالم ہو رہے تھے وہ حد بیان سے باہر ہیں۔ اسی زمانہ میں حضرت خبابؓ بن ارت نے عرض کی کہ یارسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بد دعا فرمائیے۔ یہ سنکر آپکا چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا[1]۔ ایک دفعہ چند صحابیوں نے ملکر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا "میں دنیا کے لئے لعنت نہیں، بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں[2]"۔

وہ قریش جنہوں نے تین برس تک آپ کو محصور رکھا اور جو آپکے پاس غلہ کے ایک دانہ کے پہنچنے کے روادار نہ تھے، انکی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبوی کی استجابت نے ابر رحمت کا سایہ انکے سر سے اٹھا لیا، اور مکہ میں اسقدر سخت قحط پڑا کہ لوگ ہڈیاں و مردار کھانے لگے، ابوسفیانؓ نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ "محمد! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو"

[1] صحیح بخاری باب المبعث ۔ [2] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم۔

آپ نے بلا عذر فوراً دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے، اور خدا نے اس مصیبت سے اُنکو نجات دی[1]۔ اسی واقعہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس ثمامہ بن اثال تھے، وہ جب مسلمان ہوکر مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر اُنکو طعنہ دیا، اُنھوں نے غصہ سے کہا "خدا کی قسم اب رسول اللہ صلعم کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا" اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑگیا، آخر قریش نے گھبراکر اُس آستانہ کی طرف رجوع کیا، جس سے کوئی سائل محروم نہیں پھرتا تھا، حضورؐ نے حکم دیا کہ بندش اُٹھالی جائے، چنانچہ حسب دستور مکہ میں غلہ پہونچنے لگا[2]۔

جس شب کو آپ نے ہجرت فرمائی ہے، کفارِ قریش کے نزدیک یہ طے شدہ تھا کہ صبح کو محمدؐ کا سر قلم کردیا جائیگا، اس لئے دشمنوں کا ایک دستہ رات بھر خانۂ نبوی کا محاصرہ کئے کھڑا رہا۔ اگرچہ اسوقت ان دشمنوں سے انتقام لینے کی بظاہر آپ میں قوت نہ تھی، لیکن ایک وقت آیا جب ان میں سے ایک ایک شخص کی گردن اسلام کی تلوار کے نیچے تھی، اور اُسکی جان صرف آنحضرتؐ کے رحم وکرم پر موقوف تھی لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اس جرم میں کبھی مقتول نہیں ہوا،

قریش سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح مکہ کا دن تھا، جبکہ وہ کینہ ور سامنے آئے جو آنحضرتؐ کے خون کے پیاسے تھے، لیکن آپ نے اُن سب کو یہ کہکر چھوڑدیا:-

لاتثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء:- تم پر کوئی سرزنش نہیں، جاؤ، تم سب آزاد ہو،

وحشی جو آنحضرت صلعم کے عم محترم حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، ہندؓ جو رئیس کفر ابوسفیانؓ کی بیوی تھی، عکرمہؓ جو دشمنِ اسلام ابوجہل کا فرزند تھا، صفوان بن اُمیہ جو مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا، ہبار بن اسود جو ایک حد تک آنحضرتؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا قاتل تھا، ابوسفیانؓ جو اسلام لانے سے پہلے سرغنہ کفر وشرک تھا، یہ سب ایک ایک کرکے بارگاہِ نبوت میں باریاب ہوئے، اور اپنے قصور کا اقرار کیا، دفعۃً بابِ رحمت وا ہوا، اور دوست ودشمن کی تمیز یکسر مفقود ہوگئی۔

آنحضرت صلعم اور کفار طائف

ہجرتِ نبوی سے بیشتر طائف کے رؤسا نے حضور سرورِ کائناتؐ کے ساتھ جو تحقیر آمیز برتاؤ کیا تھا، اُسکی یادِ خاطرِ اقدس پر گراں تھی، تاہم دس برس کے بعد جب غزوۂ طائف میں وہاں کے مشرک منجنیقوں سے مسلمانوں پر پتھر برسا رہے تھے اُسوقت ایک سراپائے حلم وعفو انسان (خود آنحضرتؐ) یہ دعا مانگ رہا تھا کہ "خدایا! انھیں سمجھ عطا کر اور اُنکو آستانۂ اسلام پر جُھکا" چنانچہ

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۃ دخان، [2] ایضاً باب وفد بنی حنیفہ وسیرت ابن ہشام،

ایسا ہی ہوا، سنہ ۹ھ میں جب اُنکے وفد نے مدینہ کا رخ کیا تو آنحضرتؐ نے صحن مسجد میں اُنکو مہمان بنکر اُتارا اور عزت و حرمت کے ساتھ اُن سے پیش آئے۔[1]

آنحضرت صلعم اور منافقین مدینہ یہ کفار کا ایک گروہ تھا، جسکا رئیس عبد اللہ بن ابی تھا، ہجرت نبوی سے پیشتر تمام اہل مدینہ نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ مدینہ کا فرمانروا بنا دیا جائے، لیکن انصار کے قبول اسلام اور ہجرت نبوی نے اس ارادہ کو مکمل ہونے دیا، جنگ بدر کے بعد عبد اللہ نے اسلام کا اعلان کیا، لیکن دل سے کافر تھا، اسکے پیرو بھی اسی قسم کا منافقانہ اسلام لائے، اور منافقین کی ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی، یہ لوگ درپردہ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیریں کرتے تھے، قریش اور دیگر مخالف قبائل سے سازباز رکھتے، انکو مسلمانوں کے مخفی رازوں کی خبر دیتے تھے، باایں ہمہ بظاہر اسلام کے مراسم ادا کرتے، جمعہ و جماعت میں شریک ہوتے اور لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے آنحضرت صلعم انکے حالات اور ایک ایک کے نام و نشان سے واقف تھے، لیکن چونکہ شریعت اور قانون کے احکام ظاہری اعمال سے متعلق ہیں اسلئے آپ اُنپر کفر کے احکام جاری نہیں فرماتے تھے، یہانتک تو شریعت اور قانون کا معاملہ تھا لیکن فیاضی دلی اور حلم و عفو کے اقتضاء سے آپ اُن سے ہمیشہ حسن اخلاق سے پیش آتے تھے،

ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپیڑ مارا، انصاری نے انصار کی دہائی دی، مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی، قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جائے، آنحضرتؐ نے فرمایا "یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہیں" دونوں رُک گئے۔ عبد اللہ بن ابی نے سُنا تو کہا:۔

لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منہا الاذل (قرآن مجید)	جب ہم مدینہ کو واپس چلیں گے تو معزز لوگ (یعنی خود) کمینوں (یعنی مسلمانوں) کو مدینہ سے نکال دینگے،

اور

لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتی ینفضوا (قرآن مجید)	پیغمبر کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو، تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔

آنحضرت صلعم نے عبد اللہ بن ابی کو بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے؟ اُس نے صاف انکار کیا، حضرت عمرؓ موجود تھے بولے "یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اُڑا دوں" آپ نے فرمایا نہیں لوگ چرچا کرینگے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔[2]

---

[1] سنن ابو داؤد وغیرہ [2] صحیح بخاری۔

جنگ احد میں عبداللہ بن ابی لشکر اسلام کے ساتھ شریک ہو گیا تھا، لیکن عین لڑائی کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا، جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہونچا، تاہم آنحضرتؐ نے درگذر فرمایا،

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہؓ بیمار ہوئے، آپ اُنکی عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے، راہ[1] میں ایک جلسہ تھا، آپ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی بھی جلسہ میں موجود تھا، آپکی سواری کی گرد اڑی تو اُس نے ناک پر چادر رکھ لی، اور آنحضرت صلعم سے کہا دیکھو گرد نہ اُڑاؤ جب آپ پہنچے تو کہا "محمدؐ! اپنا گدھا ہٹاؤ، تمھارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا" آپ نے سلام کیا، پھر سواری سے اُترے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ نے کہا "ہمارے گھر آکر ہم کو نہ ستاؤ، جو شخص خود تمھارے پاس جائے اُسکو تعلیم دو"[2]

سب سے بڑھکر طیش اور غضب کا موقع افک کا واقعہ تھا، جب منافقین نے حضرت عائشہؓ کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی حضرت عائشہؓ جو آپ کی محبوب ترین بیوی اور حضرت ابو بکرؓ جیسے یار غار کی صاحبزادی تھیں، منافقین نے اس خبر کو اسطرح پھیلایا کہ دفعۃً سارا مدینہ گونج اُٹھا، دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، یہ باتیں انسانی صبر و تحمل کے پیمانہ سے باہر ہیں، تاہم آنحضرتؐ نے ان سب کے ساتھ کیا کیا؟ تہمت کا بانی تمام تر عبداللہ بن ابی تھا، اور آپکو اس کا بخوبی علم تھا، بااینہمہ وہ اس بنا پر شرعی سزا سے مستثنیٰ کیا گیا کہ اُسکو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا اور ثبوت کے لئے شرعی شہادت موجود نہ تھی؛

سب سے آخر یہ کہ یہی عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، جب مرا تو حضور سرور کائناتؐ نے مسلمانوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنا قمیص مبارک اُتار کر اُسکو پہنا دیا، اور یہی حلّۂ نورانی اُسکا کفن ہوا[1]

آنحضرت صلعم اور یہود و نصاریٰ

یہود کو آنحضرتؐ کے ساتھ جس شدت کی عداوت تھی، اُسکی شہادت غزوۂ خیبر تک ایک ایک واقعہ دے سکتا ہے، لیکن بااینہمہ خلق عمیم نے دوست و دشمن کی تفریق گوارا نہ کی، اور ابر کرم دشت و چمن پر یکساں گہر بار ہوا، ایک دفعہ ایک یہودی نے بر سر بازار کہا "قسم ہے اُس ذات پاک کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی" ایک صحابی یہ کھڑے سن رہے تھے، اُن سے رہا نہ گیا، اُنھوں نے پوچھا کیا محمد صلعم پر بھی؟" اُس نے کہا "ہاں" اُنھوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اُسکے مار دیا؛ لیکن جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور واقعہ بیان کیا تو آپ نے اُن صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی؛

[1] صحیح بخاری۔ [2] صحیح بخاری؛

ایک دفعہ سرِ راہ ایک یہودی کا جنازہ گذرا تو آپ کھڑے ہوگئے،[۱]

ایک دفعہ چند یہودی آپ کی خدمت میں آئے، اور شرارت سے سلام علیکم کے بجائے السّام (تم پر موت ہو) کہا، حضرت عائشہؓ نے غصّہ میں آکر انکو سخت جواب دیا، لیکن آپ نے روکا اور فرمایا "عائشہ! بدزبان نہ بنو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔"

نصاریٰ کے تعلقات ابتدا ہی سے اچھے تھے، اس لئے جب سنہ ۹ھ میں وفد نجران آیا تو آپنے اسکی مہمانداری کی، مسجد نبوی میں انکو جگہ دی، بلکہ انکو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت عنایت فرمائی۔[۲]

لری-

از مولانا خواجہ محمد عبدالحیٔ فاروقی - متوسط تقطیع - ضخامت ۲۷۲ صفحات - قیمت - سے ۱؍

ملنے کا پتہ:- جامعۂ ملیہ اسلامیہ - قرول باغ - دہلی -

مولانا محمد عبدالحیٔ صاحب استاذ تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کلام مجید کی تفسیر بالکل جدید اصول پر مرتب کرنا شروع کی ہے - اب تک متعدد سورتوں کی تفسیر علٰحدہ علٰحدہ شائع ہو چکی ہے - پیش نظر کتاب میں قرآن شریف کے پارۂ عم کی تفسیر ہے - ترتیب تفسیر کی صورت یہ ہے کہ اول سورت کے مضامین کا مختصر خلاصہ لکھا ہے - پھر چند مسلسل آیتوں کو لکھکر مقابلہ میں انکا ترجمہ کیا ہے - اسکے بعد انکی تشریح و توضیح ہے - اسی طرح پوری سورت کی تفسیر ہے - تشریح کے ذیل میں بہت سے رموز و نکات اور عبر و بصائر بیان کئے ہیں - قرآن شریف کے تراجم و تفاسیر یوں تو بکثرت موجود ہیں مگر یہ تفسیر حسن ترتیب کے لحاظ سے ایک امتیازی شان رکھتی ہے - زبان و بیان سلیس و دلنشیں ہے - ہر اردو خواں مسلمان اسکے مطالعہ سے قرآن شریف کے رموز و نکات سے بقدر استعداد واقف ہو سکتا ہے - چونکہ پنجگانہ نماز میں عموماً پارۂ عم کی ہی سورتیں پڑھی جاتی ہیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے اس قابل قدر تفسیر کا مطالعہ مفید ہوگا -

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجنائز، [۲] زاد المعاد ابن قیم،

وضعِ اِصطلاحات

از جناب "کلدار" حیدر آبادی

"زمانہ" بابت مئی ۱۹۲۹ء میں "وضع اصطلاحات" پر مولانا عشرت لکھنوی کا مضمون زیادہ گہری تنقید کا متقاضی ہے کیونکہ وہ مضمون نہ صرف حیدر آباد سے متعلق ہے بلکہ ادبیات سے تعلق رکھتا ہے اور "زمانہ" کو ادبیات سے زیادہ گہرا تعلق ہے۔

مولانا کا مضمون اصل میں پروفیسر تسلیم مرحوم کی کتاب "وضع اصطلاحات" کی تنقید پر مشتمل ہے اور بس۔ خود انھوں نے کوئی تعمیری پروگرام مرتب نہیں کیا ہے۔ مضمون میں رسمی طور سے خادمانِ اُردو دکن و پنجاب کا شکریہ ادا کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ بات عجیب ہے کہ مضمون کی ابتدا اور انتہا میں دو ایسے الگ الگ خیالات پیش کئے گئے ہیں جو ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو تمام ہندوستان کی مادری زبان ہے اور ہم سب کو یہ حق حاصل ہے کہ جو چاہیں اسمیں ترمیم اور اضافہ کریں"

مولانا کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترمیم اور اضافے کا حق، اگر درحقیقت یہ کوئی حق ہے تو صرف دلّی اور لکھنؤ کے محدود و مختصر طبقے کو ہی حاصل ہو اور اطراف و جوانب کے باشندوں کو اُردو کی جو خدمت کرنا ہو اُسے ان مقامات کے اساتذہ کی تقلید و تتبع میں کرنا چاہئے جن کو اُردو کا مرکز ہونے کا دعویٰ اور صحیح دعوے ہے۔ لیکن آخری جملہ یوں ہے:

"..... اُردو تو دکن میں پیدا ہوئی اور اس لحاظ سے بہتر یہی ہے کہ وہیں سے اسکا جنازہ بھی اُٹھے اور وہیں دفن ہو جائے تاکہ دوسرے لوگوں کو اسکی پرورش کا حق حاصل نہو"

مجھے شبہ ہے کہ یہ جملہ مولانا کا ہوگا۔ بہرحال معلوم نہیں کہ مولانا کے نزدیک مرکزیّت کا معیار کیا ہے کیونکہ مرکز یا تو پیدائش گاہ ہو سکتا ہے یا اسکی سب سے زیادہ خدمت کرنے والا۔ شروع میں تو یہ ارشاد ہے کہ سب چاہئے کہ مرکز کی تقلید کریں۔ مگر آخر میں یہ گنگا جمنی جملہ نظر آتا ہے کہ اُردو کی (بقول انھیں کے) پیدائش گاہ اور سب سے ٹھوس خدمت کرنے والے کو تو اُردو کی مرکزیّت کا دعوے اور خدمت کا حق نہیں بلکہ اگر ہے تو "دوسروں" کو ہے اور بجا طور سے ہے۔ ایک جگہ تو یہ خیال ہے کہ مرکز سے گزر کرنا اچھا نہیں اور دوسری جگہ

یہ مطالبہ ہے کہ دوسروں کو بھی یہ وہی یعنی اضافہ و ترمیم کا حق حاصل ہو۔
اسکے بعد عشرت صاحب نے "وضع اصطلاحات" پر مثالاً تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ جس پر مولانا ہی کے
تتبع میں آپکے مضمون کے صرف چند امور پر مثال کے طور پر بحث کرنا یقیناً دلچسپی سے خالی نہوگا۔
مولانا کو اعتراض ہے کہ پروفیسر سلیم کی کتاب "وضع اصطلاحات" میں فلسفۂ اصطلاحات اور نفسِ اصطلاحات
کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر یہ اعتراض مان بھی لیا جائے تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ کتاب مذکورہ اصطلاحات وضع کرنے
کے عملی طریقے سے بحث کرتی ہے جیسا کہ خود اسکے نام سے ظاہر ہے؛ نہ کہ علم اصطلاحات یا فنِ اصطلاحات پر
کوئی مقالہ ہے۔ مولانا کو اعتراض ہے کہ "اس کتاب میں اصطلاحات کا تو ذکر نہیں ہے بلکہ ابتدا میں لفظوں
کی تصریف دکھائی ہے، امالہ دکھایا ہے، ترخیم دکھائی ہے، تحریف دکھائی ہے، تعلیل دکھائی ہے جو تمام
صرفی نحوی کتابوں میں عام طور سے موجود ہیں۔" یہ عبارت خود بعد کے اعتراض کو بے وقعت کر دیتی ہے۔
کیونکہ اسمیں اقرار کیا گیا ہے کہ پروفیسر سلیم کہیں بھی صرف و نحو کے مسلّمہ اصول سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور پھر
یہ اعتراض کہ وضعِ اصطلاحات کی کتاب میں صرف و نحو کے وہ اصول جو اس فن سے متعلق ہوں تفصیل
سے اور یکجا بیان نہ کئے جائیں اور کتاب اس اہم جزو سے خالی رہے، کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟
یہ عجیب بات ہے کہ دکن کی جن چیزوں کو نشانۂ ملامت بنایا گیا ہے وہ اصل میں دکنی نہیں۔ گو دکن
انکو دکنی سمجھنے میں کوئی تامل نہیں کرتا۔ مثلاً پروفیسر سلیم مرحوم پانی پتی تھے اور سوائے آخری چند سالوں کے
پوری عمر بیرونِ دکن میں گزری۔ "جامعہ عثمانیہ" کی نام نہاد "جنرل کمیٹی" جس سے مراد شاید کمیٹی وضعِ
اصطلاحات" ہے اسمیں تقریباً سو فی صدی حصہ غیر دکنی علماء کا ہے۔ "انجمن ترقی اردو" سکونتاً نہیں تو وطناً
اور جلا اب بھی غیر دکنی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بے شبہ سلیم پانی پتی کے اصول کو، کمیٹی وضعِ اصطلاحات
کی اصطلاحات کو، اور انجمن ترقی اردو اور اسکے بابائے اردو (دہلوی) معتمد صاحب کی خدمات کو دکن سے
منسوب کیا جاتا ہے اور دکن انکے ماننے اور ان پر عمل کرنے سے تامل نہیں کرتا۔ اس حقیقت کی روشنی
میں خود مولانا کا اعتراض باقی نہیں رہتا کہ اطراف کے باشندوں کو مرکز کی تقلید و تتبع میں اردو کی خدمت
کرنی چاہئے۔ مرکز سے مراد مرکز کے تمام باشندے اور مرکز ہی میں رہنے والے یقیناً نہیں ہو سکتے بلکہ اسکے
چند ممتاز علماء ہی ہو سکتے ہیں۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی "جنرل کمیٹی" میں مولانا کے نقطۂ نظر
کے "مرکز" ہی کے مستند ترین علماء شامل ہیں اور مولانا کو چاہئے کہ انکی تجویزوں پر جو بہت گہرے بحث و
مباحثے کے بعد منظور ہوئی ہیں، تقلید و تتبع سے پیچھے نہ ہٹیں۔
میں نے جہاں تک مطالعہ کیا ہے پروفیسر سلیم نے اپنی کتاب "وضعِ اصطلاحات" میں یہ کہیں نہیں

لکھا ہے کہ اُنکے تراشیدہ الفاظ سب کے سب یا ایک بھی ضرور ہی مان لیا جائے۔ اُنکا منشا صرف اُصول پیش کرنا اور اُسکو برت کر بتانا تھا اور بس۔ یہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے کہ اسم سے فعل بنانے کے اُصول کو محض اِس لئے کالعدم کر دیا جائے کہ اُس پر عمل کر کے بنائی ہوئی مثالوں میں چند ایسی بھی ملتی ہیں جو محض نامانوسی کی وجہ سے ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ اور چند ایسی بھی ملتی ہیں جو ثقالت کے باعث ثقاہت کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔

مولانا کا یہ اعتراض کہ "اکثر ایسے ایسے مصادر ایجاد فرمائے ہیں جو آج تک پردۂ غیب سے میدانِ شہود میں نہ آئے تھے اور جن سے دنیا کے کان آشنا نہ تھے" واقعی اعتراض ہے اور ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ اگر یہی خیال ہے تو زبانِ اُردو ہی کو معدوم کر دینا چاہئے۔ اور اُسکے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں کو بھی۔ کیونکہ انسان کے لئے صرف بچپن کا پیارا سبق غوں غاں ہی کافی ہونا چاہئے۔ دنیا کی ہر زندہ زبان روز بروز ترقی کر رہی ہے مگر مولانا اُردو کو اُنکے قدم بقدم چلنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ جب تک دہلوی و لکھنوی اردو پیداوار کو ادبِ عالیہ کا مقدس درجہ حاصل رہا اُس وقت تک اُردو کو علومِ جدیدہ وغیرہ مثلاً سائنس کلکاری، (میکانکس) وغیرہ کے مطالب ادا کرنے کا نا اہل قرار دیا جاتا تھا۔ اسکی وجہ محض یہ تھی کہ چھوٹے سے چھوٹے مفہوم کے لئے اُردو کی بے اصولی کے باعث کئی سطریں بلکہ صفحے برباد کرنے پڑتے تھے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ "رعشہ براندام کرنا"، کے غیر مشتق مصدر کی جگہ "رعشانا" کا سیدھا سادہ لفظ کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ یہ اُردو صرف و نحو کے اصول کے خلاف نہیں ہے بلکہ اگر خلاف ہے تو شاید چند سو الفاظ پر مجدود قدیم دہلویت و لکھنویت کے۔ یہی حال اور مصادر کا ہے جو مولانا نے نقل کئے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ بلا استثنا ہر اسم سے فعل بنا لینا ذرا مشکل ہے اور شاید فی الحال عملاً فوراً اسمیں کامیابی بھی ناممکن ہو۔ لیکن جدید مفہوموں کو ادا کرنے کی ضرورت جن سے اَب تک اُردو دوچار نہ ہوئی تھی ہم سے "ضرورت پر سب کچھ روا" ہونے کی حقانیت تسلیم کرائیگی۔ اِس اصول سے چاہے مولانا کو کتنا ہی اختلاف رہے، اَب وہ اتنا مقبولِ عام ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے کے اُردو داں اپنی انشا پردازی میں اِس سے فائدہ اُٹھانے میں نہیں ہچکچاتے۔ میرے اس دعوے کی تائید ہر وہ شخص کریگا جو اُردو رسائل کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کرتا رہتا ہو۔ اسکی اہمیت اور اسکے فائدے بیشمار نہیں تو بہت ضرور ہیں۔ علمی مطالب ادا کر سکنا، جدید مفاہیم و جذبات کو الفاظ کی قید میں لانا، فضول طوالت کے بجائے کم الفاظ میں زیادہ مطلب بآسانی بیان کر سکنا، ہر خیال کو سہولت کے ساتھ ظاہر کر سکنا، غیر زبانوں سے ترجمہ کرنے میں بجائے تشریح پر مجبور ہونے کے لفظی ترجمہ کافی ہونا، انسانی ذہنیت کو بلند پروازی کے لئے

ایک نئی فضا مہیا کرنا وغیرہ یہ وہ امور ہیں جن سے بہتر فائدے خود مولانا اُس وقت محسوس کر سکیں گے جب وہ خود اس قسم کا کام انجام دینا چاہینگے جس سے نوجوان نسل دو چار ہے۔

اسکے خلاف کوئی اصولی اعتراض آج تک نہیں کیا گیا۔ صرف بعض لوگ نئے اور نامانوس الفاظ کی اجنبیت اور بیگانہ نمائی کو غلطی سے رکاکت اور ذوقِ سلیم کا خون سمجھ لیتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ میرا یہ خیال غلط نہیں کیونکہ بہت سے نئے الفاظ جو شروع میں پسند نہیں کئے گئے تھوڑے ہی عرصے کے رواج پر ہر شخص اُن کو ذرا بھی اجنبیت محسوس کئے بغیر برتنے لگا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ دکن کے باہر جامعۂ عثمانیہ سے بے تعلق، اُردو مرکز داری کے مدعی بھی اب بے تکلف اصطلاحاتِ عثمانیہ کو اور انکے وضع کرنے کے اصول کو برتنے لگے ہیں۔ میں رسالہ معارف کے سے موقّر مجلے سے اسکا ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ حالانکہ اسکے مضامین گہری تنقید اور اصلاح کے بغیر شائع نہیں ہوتے۔ معارف ہی سے خصوصیت نہیں۔ پنجابی صحافت بھی اس سے پیچھے نہیں ہے۔ دکن اور حیدرآباد دکن کا تو ذکر ہی غیر ضروری ہے۔

غیر "بقائے بہترین" کا اصول خود اپنے زبردست ہاتھوں سے منوا دیگا کہ کون حق پر تھا اور کون نہیں۔

وقت

وقت کے گزرنے کے ساتھ بہت سے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ آدمی کے لئے یہ سمجھنا بہتر ہے کہ اسکی فانی زندگی کا مقصد ترقی کرنا ہے۔ اور جیسے جیسے وقت گزرے اُسکو نئی مصیبتیں، نئی امیدیں، نئی خوشیاں اور بعض اوقات نئے غم بھی حاصل کرنا چاہئیں۔ یہ سب زندگی کے ضروری اجزا ہیں اور آدمی اسی راہ پر چل کر ترقی کر سکتا ہے جس میں زندگی کے مختلف مناظر پیشِ نظر ہوں۔

ممکن ہے کہ ایک لمحہ مسرت بخش ہو اور دوسرا غم انگیز اور دل شکن۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ انکے بعد آنے والا لمحہ زندگی روشن اور مسرور بنادے۔ لیکن زندگی کی گاڑی کے پہئے برابر گردش کرتے رہتے ہیں اور وقت بھی گزرتا رہتا ہے۔

جو شخص اس فانی زندگی سے کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اسکے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر مصیبت کا استقلال کے ساتھ مقابلہ اور ہر مسرت آمیز لمحہ سے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کرے۔ اس طرح جلد یا بدیر اسکو معلوم ہو جائیگا کہ آخر میں زندگی کی ترازو کے دونوں پلڑے (مسرت وغم) برابر ہیں اور اُسکے یا کسی اور کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی گئی۔

دلاور چور

(سر رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک قصہ)

مترجمہ ڈاکٹر اعظم کریوی سابق ایڈیٹر اکبر الہ آباد

میری پڑوسن لڑکپن ہی میں بیوہ ہو گئی تھی گویا وہ پالے کی ماری ہوئی ایک ناشگفتہ کلی تھی جو اپنی شاخ سے جدا ہو چکی ہو، میں دل ہی دل میں اسکی پوجا کرتا تھا اسکے سوا میں اُسے اور کسی نظر سے دیکھتا تھا یا نہیں؟ یہ بتانے کی نہ میری خواہش ہے اور نہ اسکی کچھ ضرورت، میرے راز سے میرا دلی دوست نوین مادھو بھی ناواقف تھا چنانچہ مجھے اس رازداری پر فخر بھی تھا، لیکن دلی جذبات اُس پہاڑی چشمہ کے مثل ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طریقہ سے قابو سے باہر ہونے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اسمیں ناکامیاب رہتا ہے تو سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ اپنے تاثرات قلبی کو نظم کا جامہ پہنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کروں۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ نوین مادھو کو بھی شاعری سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی جس طرح فوری زلزلہ آجاتا ہے تو انسان حیران ہو جاتا ہے اسی طرح مادھو کی طبیعت میں یہ انقلاب عظیم دیکھ کر مجھے بھی سخت تعجب ہوا۔ وہ شاعری سے محض نابلد تھا۔ ردیف۔ قافیہ۔ بحر وزن سب سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ پھر بھی اُس نے بلا تکلف طبع آزمائی کی اور مدد کے لئے میرا دامنگیر ہوا۔

میں نے اسکی ایک نظم دیکھی جو نہ قدیم طرز ہی پر لکھی گئی تھی اور نہ جدید رنگ ہی میں تھی۔ شروع سے لیکر آخر تک محبت کا افسانہ تھا۔ میں نے ہنسکر پوچھا۔ "کیوں دوست! تمھارا مخاطب کون ہے؟" مادھو نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں خود ابتک اس سے ناواقف ہوں۔"

مادھو کی نظموں کی نظر ثانی کرنے میں مجھے بھی دلی مسرت حاصل ہوئی۔ میں اسکی نظموں میں اپنے واردات قلبی کو بیان کرنے لگا، جسطرح کہ ایک مرغی بطخ کا انڈا پاکر اسے اپنے کلیجے سے لگا کر بیٹھ جاتی ہے اسی طرح میں بھی مادھو کے خیالات کو اپنے دلی جذبات کے تہ میں دبا بیٹھا۔ مادھو کی تُک بندیوں پر

میں اس طرح اصلاح دیتا کہ قریبا ساری نظم میرے ہی خیالات کا آئینہ بنجاتی تھی۔ مادھو خوش ہوکر کہتا "بس بس میں بھی یہی باتیں نظم کرنا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ تم نے میرے دل کی باتیں لکھ دی ہیں۔ خدا جانے تم کو میرے دلی جذبات کا کیسے اندازہ ہوجاتا ہے"

میں بڑی متانت سے مشہور شعرا کی طرح جواب دیتا۔ "یہ قوت خیال کا کرشمہ ہے اور در حقیقت خیالات تو سب تمہارے ہی ہیں۔ میں تو صرف چند الفاظ گھٹا بڑھا دیتا ہوں" پہلے تو مادھو کو میری باتوں پر یقین نہ آتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی یہی سوچنے لگا اور اُسکے اس مغالطہ نے یقین کی صورت اختیار کرلی۔

میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ جس طرح کوئی جوتشی نچھتروں کا پتہ لگاتے وقت آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے اسی طرح میں بھی گاہے ماہے اپنے ہمسایہ کی کھڑکی کی طرف تکنے لگتا تھا اور اکثر اپنا گوہر مقصود نظر آجاتا تھا۔

بیساکھ کا مہینہ اور سہ پہر کا وقت تھا آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اسوقت میری پڑوسن کھڑکی میں اکیلی کھڑی تھی۔ میں نے اُسدن اسکی آنکھوں میں انتہائی رنج و غم کے آثار دیکھے۔ اسکی بڑی بڑی اور چنچل آنکھیں آندھی سے گھبرائے ہوئے پرندوں کی طرح پریشان تھیں اور وہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی سی تھی۔ اُسی وقت سے میرے لئے اپنے دلکو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اب صرف شاعری ہی سے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوتا تھا بلکہ وحشت قلب کا کچھ اور ہی تقاضا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ بنگال میں ایسا پروپیگنڈا کروں کہ بیواؤں کی شادیوں میں کوئی رکاوٹ نہ رہ جائے۔ اس کام میں چاہے میری جان ہی کیوں نہ جاتی رہے۔ میں کسی کی مخالفت کی پروا نہ کرونگا۔ اس معاملہ میں مادھو مجھ سے بحث کرنیلگا اس نے کہا کہ "بیوگی میں ایک قسم کی پاک روحانیت کا مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے، شادی سے یہ پاکیزگی اور روحانیت جاتی رہتی ہے"

اس فضول اور شاعرانہ گفتگو سے مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا۔ "قحط کے دنوں میں جو شخص بھوکوں مر رہا ہے اسکے سامنے کھانے کی چیزوں کی برائی کرنا اور پھولوں کی خوشبو اور چڑیوں کے گلنے سے اسکا پیٹ بھرنے کی کوشش کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ مصوروں کی نگاہ میں آرٹ کے لحاظ سے جلے ہوئے مکان میں ایک خاص قسم کی خوبصورتی آجاتی ہے لیکن مکان کو مصور کی نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس میں رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مصور چاہے کچھ ہی کیوں کہے لیکن مکان کی مرمت کرنا ضروری ہے۔ تم تو بیواؤں پر کسی اور خیال سے شاعری کرنا چاہتے ہو لیکن تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ

بیواؤں کے سینوں میں بھی حسرت نصیب اور غمزدہ دل ہوتے ہیں :" مادھو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر میری بات مان لی۔

ایک ہفتہ کے بعد مادھو نے مجھ سے آکر کہا اگر تم میری مدد کرو تو میں کسی بیوہ کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں" یہ سُنکر مجھے بڑی خوشی ہوئی میں نے مادھو کو گلے سے لگاکر کہا۔" اس کام میں تمکو جو کچھ بھی صرف کرنا پڑیگا میں اپنے پاس سے دیدونگا" مادھو نے اپنی ساری سرگزشت سُنادی جس سے معلوم ہوا کہ وہ کچھ عرصہ سے ایک بیوہ سے محبّت کرنے لگا ہے۔ یہ بات اس نے اب تک کسی پر ظاہر نہ کی تھی۔ جن ماہوار رسائل میں مادھو کے نام سے میری نظمیں شایع ہوتی تھیں وہ منزل مقصود تک پہونچادی جاتی تھیں۔ ان نظموں کا اثر خاطرخواہ ہوا، گویا کسی تحریک کی ضرورت ہی نہ ہوئی بلکہ اپنی طرف دل کھینچنے کا خودبخود ایک طریقہ نکل آیا۔ مادھو نے مجھے اطمینان دلایا کہ اسکی یہ کارروائی کسی چالاکی پر مبنی نہ تھی کیونکہ اس کے خیال سے تو وہ منظور نظر بیوہ پڑھی لکھی بھی نہ تھی۔ بیوہ کے بھائی کے نام سے وہ رسالہ کی ایک کاپی بلاقیمت ہر مہینہ بھیج دیا کرتا تھا گو یہ دیوانگی تھی مگر اسطرح دلکو کچھ نہ کچھ اطمینان ہو جاتا تھا۔ اور مادھو اپنے دلکو یہ سمجھا لیا کرتا تھا کہ اُس نے دیوتا کے نام پر جل اور پھول چڑھا دیئے، اُس کو خبر ہو یا نہ ہو وہ اِسے قبول کرے یا نہ کرے۔

بیوہ کے بھائی سے مادھو نے جو دوستی پیدا کرلی تھی اسمیں بھی بقول اسکے کوئی خاص مقصد نہ تھا جسکو کوئی پیار کرتا ہے اس کے قریب رہنے والوں کے ساتھ بھی قدرتاً محبّت پیدا ہو جاتی ہے بھائی کی سخت بیماری میں اسکی بہن سے مادھو کی کس طرح ملاقات ہوئی۔ یہ ایک طولانی داستان ہے۔ پہلے تو وہ بیوہ شادی کرنے پر راضی نہ ہوئی لیکن جب مادھو نے اپنی زوردار دلیلیں پیش کر کے آنکھوں سے آنسو بہائے تو وہ مان گئی۔

مادھو نے کہا کہ اب اس بیوہ کے عزیز شادی کے خرچ کے لئے کچھ روپیہ مانگتے ہیں۔

میں نے کہا۔" اسکی تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں اسیوقت روپیہ دینے کو تیار ہوں"

مادھو نے کہا۔" شادی کے بعد میرے والد پانچ چھ مہینے کے لئے میرا خرچ ضرور بند کر دینگے۔ اس عرصہ کے لئے بھی تم کو ہم دونوں کے خرچ کا بندوبست کرنا پڑے گا"

میں نے بغیر کچھ کہے سُنے مادھو کے نام ایک چیک کاٹ دیا اور کہا۔" بھائی اب تو اپنی منظورِ نظر کا پتہ ٹھکانا بتادو کچھ خوف نہ کرو، میں تمھاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب اسکے نام سے نظم نہ لکھونگا اور اگر کبھی لکھونگا بھی تو اسکے بھائی کے پاس بھیجنے کے بجائے تمھارے پاس بھیج دیا کرونگا"

مادھو نے کہا۔ "ابھی میں اس سے نہیں ڈرتا۔ دوبارہ شادی سے وہ خود بہت پریشان ہے اسی وجہ سے اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے اس کا حال بیان نہ کروں لیکن میرے خیال سے اب چھپانا بیکار ہے وہ تمھاری ہی پڑوسن ہے جو ۱۹ نمبر والے مکان میں رہتی ہے۔"

اگر میرا دل لوہے کا یا اکڑی بھی ہوتا تو یقیناً اس چوٹ سے پھٹ جاتا۔ بڑی مشکل سے کچھ دیر بعد جب میری طبیعت سنبھلی تو میں نے دریافت کیا۔ "کیا وہ شادی بیوگان کو پسند کرتی ہے؟

مادھو نے ہنس کر جواب دیا۔ "اس وقت تو وہ پسند کرتی ہے۔"

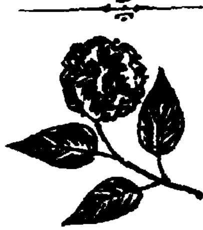
میں نے کہا۔ "کیا صرف نظم پڑھکر ہی وہ تم پر فریفتہ ہوگئی؟"

مادھو۔ "کیوں اس میں تعجب ہی کی کونسی بات ہے۔ کیا میری نظمیں کوئی معمولی ہوتی تھیں؟"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "شاباش۔ ؎ چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد"

جدید زبانی حساب ۔ مولفہ منشی خدا بخش۔ ملنے کا پتہ:۔ غلام محمد تاجران کتب خان گڈہ ضلع مظفر گڑھ (پنجاب)

یہ کتاب منشی خدا بخش صاحب ہیڈ ماسٹر نے تین حصّوں میں لکھی ہے۔ حصّۂ اوّل جسمیں ۲۴۸ صفحات ہیں۔ جماعت چہارم و پنجم کے لئے ہے اس میں ۲۴۷ مفید پرچے زبانی حساب کے دیئے ہیں۔ جا بجا حل شدہ سوالات ہیں اور زبانی حساب کے لئے کار آمد طریقے بھی درج کر دیئے گئے ہیں حصّۂ دوم جماعت ششم و ہفتم کے لئے لکھا گیا ہے اور اسمیں ۲۳۶ صفحے ہیں۔ زبانی سوالات کی مشقیں اور امتحانی پرچے کثرت سے ہیں۔ آخر میں حصّۂ اول کی طرح امتحانات کے پرچے اور ذہنی سوالات بھی دیئے ہیں جو طلبا کے لئے یقیناً مفید ہونگے۔ حصّۂ سوم خاص طور پر اُمیدواران امتحانات ورناکیولر مڈل وجے۔ وی۔ ایس۔ وی۔ کے لئے ہے۔ اسمیں بھی بہت سے حل شدہ سوالات و کار آمد اصُول دیئے گئے ہیں، یہ حصّہ تیسری بار ترمیم ہو کر شایع ہوا ہے۔ ہر حصّے کے آخر میں سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں جس سے طلبا کو بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ لکھائی، چھپائی، اچھی کاغذ عمدہ۔ قیمت حصّہ اول ۱۲؍ حصّۂ دوم ۱۰؍ حصّۂ سوم ۱۲؍



تنقید کتب

تذکرۃ الخواتین از مصنفہ مولوی عبدالباری آسی الدنی۔ مطبوعہ منشی نولکشور پریس لکھنؤ۔ چھوٹی تقطیع۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات۔

جیساکہ نام سے ظاہر ہے یہ تذکرہ اُن ہندوستانی اور ایرانی عورتوں کے حالات اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے جو کبھی اُردو اور فارسی میں داد سخن سنجی دیتی تھیں یا موجودہ زمانہ میں مصروف نغمہ سرائی ہیں اسکے دو حصّہ ہیں۔ پہلا حصّہ اُردو اور دوسرا فارسی میں شعر کہنے والیوں کے ذکر کے لئے مخصوص ہے۔

پہلے حصّہ میں تقریباً دو سَودس شاعرات کا تذکرہ ہے جن میں نصف سے زیادہ شاہدان بازاری ہیں اور چونکہ تذکرہ کی ترتیب ردیف وار کی گئی ہے اس لئے اسکو محض حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک حسینہ اچپل سے شروع ہوکر ایک نامی طوائف یاسمین پر یہ حصّہ ختم ہوتا ہے تذکرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شاعرات کے حالات و نمونۂ کلام فراہم کرنے میں کوئی خاص کوشش نہیں کیگئی بلکہ جہاں کہیں سے جو کچھ مواد ہاتھ آگیا ہے تذکرہ میں شامل کر لیا گیا، اور زیادہ تر حالات کی بنیاد صرف روایت پر قائم کی گئی ہے، درایت سے مطلق کام نہیں لیا گیا ہے جسکی وجہ سے اس تذکرے کو علمی تالیفات کے ذیل میں شامل نہیں کیا جا سکتا اور اہل تحقیق اسکے مطالعہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ ہاں عوام کے لئے ضرور یہ تذکرہ دلچسپ ہے۔

دوسرے حصّہ میں صرف فارسی گو شاعرات کا ذکر ہے اور اُنکے نمونۂ کلام کے ساتھ اسکا اُردو ترجمہ بھی لکھ دیا گیا ہے تاکہ محض اُردو داں اصحاب کو اشعار کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔

اگر لائق مولّف ذرا تلاش و تحقیق سے کام لیکر یہ تذکرہ مرتب کرتے تو موجودہ حیثیت سے زیادہ مفید و کارآمد ہوتا اور شعرا کے متعدد مستند تذکروں کے مقابلے میں شاعرات کا بھی ایک مکمل و مستند تذکرہ اسوقت ہمارے سامنے ہوتا۔ کتاب کی لکھائی چھپائی پسندیدہ ہے۔

مطلع انوار

مصنفۂ منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی۔ بی۔ اے چھوٹی تقطیع حجم ۱۹۲ صفحات قیمت عدہ
ملنے کا پتہ:۔ منیجر امپیریل بک ڈپو۔ چاندنی چوک۔ دہلی،

منشی مہاراج بہادر برقؔ موجودہ زمانہ کے اُن خوش فکر سخنوروں میں ہیں جو اپنے دلکش انداز بیان و ندرت خیال کی بدولت دنیا ادب میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور جنکا کلام اپنے صوری و معنوی حُسن کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہے۔ چنانچہ ملک کے مشہور و مقتدر رسائل میں برقؔ صاحب کا کلام ایک مدت سے شائع ہوتا ہے اور ان کی دلکش نغمہ پیرائی سے سامعین کے قلوب بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

خوشی کا مقام ہے کہ یہ قابل قدر جواہر پارے جو اب تک متفرق و منتشر تھے ایک سلک میں منسلک کرکے "مطلع انوار" کے نام سے اہل نظر کے روبرو پیش کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ میں اکیا نوے ۹۱ نظمیں ہیں جو باعتبار مضمون کئی حصوں میں منقسم کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً نیچرل طبع زاد نظمیں۔ تاریخی و واقعاتی نظمیں، مذہبی نظمیں وغیرہ۔ یوں تو "مطلع انوار" کی ہر نظم بجائے خود مکمل و مؤثر ہے مگر منظریہ اور بیانیہ نظمیں خصوصیت سے مستحق داد ہیں۔ ان میں جذبات قلب کی مصوّری بطرز احسن کیگئی ہے اور تسلسل و روانی کیساتھ ساتھ جو نظم کی جان ہے شاعرانہ خوبیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ مذہبی نظموں میں بھی یہ حسن بدرجۂ اتم موجود ہے۔

کتاب کے شروع میں چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا قابل قدر مقدمہ اور حضرت اصغرؔ گونڈوی کا مختصر مگر جامع دیباچہ ہے جنمیں برقؔ صاحب کے کلام کی خصوصیات پر ایک دلکش انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ مصنف کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔ کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔ غرض "مطلع انوار" صوری و معنوی ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ اہل سخن اسکے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں اور مصنّف کے کمال فن کی داد دیں۔

نذر ادب

از منشی بشیشور پرشاد منوّرؔ لکھنوی۔ (نوبستہ۔ لکھنؤ)۔

منوّرؔ صاحب ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد صاحب افقؔ مرحوم کے خلف الصدق اور منشی نوبت رائے صاحب نظرؔ لکھنوی مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اور شعر گوئی میں کافی مشق و مہارت پیدا کرچکے ہیں۔ آپنے اپنی رباعیوں کا مجموعہ "نذر ادب" کے نام سے $2\frac{1}{2} \times 3$۔ انچہ کی تقطیع پر شائع کیا ہے۔ اسمیں تقریباً نوّے

رباعیاں ہیں۔ رباعیوں کی زیادہ تعداد شراب اور اسکے تاثرات کے بیان میں ہے، چنانچہ خود کہتے ہیں

رندانہ جھلک میرے مطالب میں ہے ڈوبا ہر لفظ رنگ غالب میں ہے
مانع ہے ادب نہیں تو کہہ اُٹھتا میں خیّام کی روح میرے قالب میں ہے

شراب کے مضامین فارسی اور اُردو شاعری میں عام ہیں، منوّر صاحب نے بھی مختلف انداز سے انکو بیان کیا ہے اور بعض رباعیاں خوب کہی ہیں۔ باقی رباعیوں میں مختلف جذبات کا اظہار کیا ہے

موجودہ زمانہ کے شعرا فن شعرگوئی کے بعض قدیم اُصول وضوابط کی پابندی سے بجا طور پر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ بعض پابندیاں ایسی ہیں جنکو اُٹھا دینے سے شعر کی خوبی میں کمی ہونے کے بجائے کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن خواہ مخواہ مقررہ ضوابط سے انحراف کرنیکی بھی ضرورت نہیں ہے مثلاً رباعی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعہ میں قافیہ (یا قافیہ و ردیف دونوں جیسی صورت ہو) ہونا چاہئے۔ تیسرے مصرعہ میں قافیہ کی ضرورت نہیں اور اگر اسمیں بھی قافیہ لایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر منوّر صاحب نے بعض رباعیاں مذکورہ بالا قاعدہ کے خلاف کہی ہیں۔ مثلاً

جب بادہ کشی پہ ہم اُتر ہی آئے ہمت کس کی ہے ٹوک سکتا ہے کون
جو ڈر کے پیئے نہیں وہ پینے والا پینے والے کو روک سکتا ہے کون

اس قسم کے اجتہاد کو "رباعی" کہنے کے بجائے "قطعہ" کہنا چاہئے۔ خیر اس جزوی امر سے قطع نظر منوّر صاحب کی یہ چھوٹی سی خوبصورت نذر ارباب ادب کے لئے قابل قبول ہے۔ قیمت کہیں درج نہیں، چونکہ "نذر" ہے اس لئے غالباً اسکی قیمت کچھ مقرر ہی نہیں کی گئی۔

الہام منظوم (جلد اول، دوم، سوم۔) مرتبہ مولوی فیروز الدین۔ چھوٹی تقطیع۔ قیمت ہر حصہ غیر مجلد ۱۲؍، مجلد ۱۴؍ ملنے کا پتہ:۔ فیروز پرنٹنگ ورکس۔ نمبر ۱۱۹ سرکلر روڈ۔ لاہور۔

مثنوی مولانا رومؒ فارسی زبان میں علم تصوف ومعرفت کی ایک بہترین کتاب ہے، جو سات جلدوں میں ہے اور صوفیوں کے حلقہ میں بیحد قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اسکی متعدد شرحیں اور ترجمے اُردو میں بھی ہو چکے ہیں۔ بعض ترجمے منظوم بھی ہیں لیکن انکو کافی نہ سمجھکر مولوی فیروز الدین صاحب نے یہ جدید اُردو منظوم ترجمہ شایع کیا ہے جسکے تین حصے اسوقت ہمارے سامنے ہیں۔ ترجمہ کی صورت یہ ہے کہ اصل فارسی شعر کے نیچے لفظی ترجمہ ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل نمونہ سے ظاہر ہے۔ ؎

بشنو از نے چوں حکایت میکند　　وز جدائی ہا شکایت می کند
سن تو کیا کرتی ہے باتیں بانسری　　بس شکایت کر رہی ہے ہجر کی،
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے　　مرد و زن روتے ہیں میرے شور سے
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بگویم شرح درد اشتیاق
پارہ پارہ کر دے سینہ جب فراق　　تب کہیں ہو شرح درد اشتیاق

یہ ترجمہ کس نے کیا ہے؟ صاف طور پر کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ جلد اوّل کے دیباچہ میں مولوی فیروزالدین صاحب صرف اسقدر لکھتے ہیں کہ ابتدا میں اُنھوں نے مفتی امیر مینائی صاحب مرحوم سے ترجمہ کرنے کی تحریک کی تھی مگر اُنھوں نے پیرانہ سالی کا عذر کیا۔ پھر مولانا سیاب اکبر آبادی کو اس خدمت کے لئے انتخاب کیا گیا مگر اتنی ضخیم کتاب کو ترجمہ کرنا سیاب صاحب کے بس کی بات نہ تھی، لہذا یہ صورت اختیار کی گئی کہ سیاب صاحب ترجمہ کرتے گئے اور مولوی فیروزالدین صاحب اسکو نفظ بلفظ قال سے حال میں لانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اسطرح تین سال کی محنت میں یہ ترجمہ مکمل ہوا۔ معلوم نہیں "ترجمہ کرنے" اور "قال سے حال میں لانے" سے کیا مطلب ہے۔ کیا اس سے یہ مُراد تو نہیں ہے کہ سیاب صاحب نے فارسی اشعار کا اُردو نثر میں ترجمہ کیا اور مولوی فیروزالدین صاحب نے اسکو نظم کیا؟

ایک زبان کی کتاب کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بذات خود کوئی آسان کام نہیں اور لفظی ترجمہ سے اصل کے مطالب کسی طرح بھی پورے طور پر بیان نہیں کئے جاسکتے تاہم یہ ترجمہ صاف اور مثنوی معنوی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے مطالعہ کے قابل ہے۔

فکر بلیغ۔ مصنفہ مولانا شاد عظیم آبادی مرحوم۔ تقطیع ۲۶×۲۰/۸ حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت قسم اوّل ۱۲/ قسم دوم ۸/ ملنے کا پتہ:۔ مولوی سید عبد الحمید صاحب۔ لودی کٹرہ۔ پٹنہ سٹی۔

مولانا شاد اُردو زبان کے ایک مشہور و مستند اہل قلم و سخنور تھے۔ آپنے مختلف مفید موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں جنمیں سے بعض طبع ہو چکی ہیں اور بعض ہنوز مسودات کی شکل میں ہیں۔ اس کتاب کا موضوع شعر ہے۔ شروع میں فصاحت و بلاغت کے اصول سے بحث کی ہے اور عیوب کلام مثلاً تنافر و تناقض۔ تقدیم و تاخیر۔ ضعف تالیف۔ وغیرہ بیان کئے ہیں۔ استعارات و تشبیہات وغیرہ کے استعمال۔ شعر کی تعریف و ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر اقسام کلام کی توضیح و تشریح کرکے دکھایا ہو کہ

کس قسم کا کلام معیوب اور کس طرح کا مستحسن ہوتا ہے۔ اصناف سخن میں خصوصیت سے غزل اور قصیدہ سے بحث کی ہے۔ آجکل بعض ناواقف حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ غزل کے معنی صرف عورت یا معشوق سے باتیں کرنا ہے اس لئے جو شعر وصل و ہجر اور شکوہ و شکایت سے خالی ہو اسکو غزل کے دائرہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا شاد نے بہ اعتبار مضامین غزل کی چودہ قسمیں بیان کی ہیں مثلاً عاشقانہ، عارفانہ، رندانہ، ظریفانہ وغیرہ اور ہر قسم کی تعریف و مثال دی ہے۔ آخر میں اس امر پر زور دیا ہے کہ چونکہ اُردو کی اصل بھاشا ہے اس لئے اُردو زبان کے شعراء کا فرض ہے کہ وہ بھاشا کی شاعری کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ اُردو شاعری میں حقیقی و فطری لطافت پیدا ہو سکے۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ بلا ضرورت عربی و فارسی یا سنسکرت کے لغات استعمال کرنے سے حتی الامکان بچنا چاہئے۔ اور زبان کی وسعت و ترقی کو مدنظر رکھکر حسب ضرورت غیر زبانوں سے استفادہ کرنا بھی لازمی ہے۔

اس کتاب کی زبان میں اگرچہ کہیں کہیں مولویانہ طرز تحریر کی جھلک نمایاں ہے مگر انداز بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ اُردو زبان کے نوجوان شعراء کو خصوصیت سے اسکا مطالعہ کرنا چاہئے۔ دوسرے حضرات کے لئے بھی اسمیں بہت کچھ دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

چند منظوم مولانا احسن مارہروی ایک مشاق سخنور ہیں اور دنیائے ادب میں ایک مستقل عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ "چند منظوم" آپ ہی کے افکار عالیہ کی مرہون منت ہیں۔

اس مختصر مجموعہ میں صرف پانچ نظمیں ہیں جو بظاہر مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے ماضی و حال پر مشتمل ہیں لیکن غور کیا جائے تو ان سے اکثر قومی و ملکی سبق حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ قومی روایات اور واقعات کو اس طریقہ سے نظم کرنا کہ لطافت شعری باقی رہے ذرا مشکل ہے مگر اس مجموعہ کی ہر نظم میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اہل ذوق اسکے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں اور مصنف کی جگر کاوی کی داد دیں۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ:۔ یونیورسٹی بک ڈپو علی گڈھ

صراط الحمید مولفہٗ الحاج محمد الیاس برنی چشتی القادری۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ)
تقطیع ۱۸ × ۲۲/۸ حجم ۲۴۸ صفحات قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ مسلم یونیورسٹی پریس۔ علیگڈھ

یہ ایک سفرنامہ ہے جس میں مقامات مقدسہ واقع عراق۔ شام۔ فلسطین اور حجاز کے حالات ہیں۔ اس میں ہر مقام کے چشم دید گوناگوں حالات، دلچسپ مفید معلومات۔ طریقۂ سفر اور منازل راہ وغیرہ کے متعلق ضروری باتیں بالتفصیل درج ہیں۔ اکثر مقامات مقدسہ مثلاً بغداد شریف، کربلائے معلّٰی نجف اشرف، بیت المقدس، مدینہ منورہ و مکہ معظّمہ وغیرہ کے متبرک آثار و روایات، ظاہری و باطنی فیوض و برکات کا تفصیلی ذکر ہے۔ احکام و طریقۂ حج و عمرہ و ادعیۂ ماثورہ و معمولہ درج ہیں۔ جا بجا معارف قرآنی و نکات ایمانی بھی مذکور ہیں۔ ضمنی طور پر بمبئی۔ کراچی۔ بصرہ۔ بیروت۔ حیفہ۔ ینبوع۔ جدّہ وغیرہ کے ضروری حالات بھی ہیں اور مسافروں کو دوران سفر میں جو صورتیں پیش آتی ہیں اُن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غرض حجّاج و زائرین بیت اللہ و مقامات مقدسہ کے لئے یہ ایک بہترین رہبر و رفیق طریق ہے۔

سب سے بڑی خوبی اس سفرنامہ کی یہ ہے کہ ہر جگہ کے ظاہری آثار کا نقشہ ایسے دلکش الفاظ میں کھینچا ہے کہ اس مقام کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور بزرگان دین کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ زبان سلیس و پاکیزہ، لفظ لفظ سے مؤلف کا جوش مذہبی و سوز و گداز قلبی ظاہر ہوتا ہے۔ غرض ہر حیثیت سے اس سفرنامہ کا مطالعہ مسلمان ناظرین کے لئے باعث دلچسپی ہوگا۔ خاص خاص مقامات کی متعدد عکسی تصاویر بھی اسمیں شامل ہیں جن سے اسکی ظاہری خوبیوں میں قابلقدر اضافہ ہوگیا ہے۔

لائف اینڈ ٹیچنگس آف بابامست رام (انگریزی)

از بابو بالگوبند۔ حجم ۶۴ صفحات۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ مسٹر رامچندر۔ ڈی۔ پی۔ آئی۔ آفس۔ ہوم ڈپارٹ منٹ گورنمنٹ آف انڈیا۔ شملہ۔

اس مختصر کتاب میں مسٹر چارلیس ولیم ڈی سیٹ کے حالات زندگی مجملاً بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں انکی ایک طویل نظم ہندو اوتاروں کے متعلق ہے۔

مسٹر سیٹ اصل میں فرانسیسی نژاد تھے۔ اُنکے آبا و اجداد کا تعلق آخری شاہ اودھ کے دربار سے تھا، مگر عنفوان شباب یعنی ۱۸ سال کی عمر میں اُنھوں نے عیسائی مذہب ترک کرکے یوگ لے لیا اور تمام زندگی سادھوؤں کی طرح بسر کی۔ یوگ سادھن کے بعد وہ بابا مست رام کے نام سے مشہور ہوئے۔ بابا موصوف بابا گوپال داس جی کے چیلے تھے جو ہنومان مندر واقع جاکو (شملہ) کے مہنت تھے۔ مہنت جی

کے دیہانت کے بعد اُن کے دو چیلے بابا رام داس اور بابا منگل داس یکے بعد دیگرے اُنکی گدی پر بیٹھے، اور بابا منگل داس کے پرلوک سدھارنے پر ۵ ؍جون ۱۹۲۶ء کو ہندوستانی سرداروں اور شملہ کی عام پبلک کی متفقہ رائے سے بابا مست رام اپنے گورو کی گدی پر بٹھائے گئے اور ۲۰ ؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں رہگرائے عالم باقی ہوئے۔ آپنے تمام عمر عالم تجرد میں گزاری اور گوشت اور شراب کے بھی ہمیشہ پرہیزگار رہے۔ آپنے متعدد مقدس مقامات کی سیر بھی کی تھی اور عام طور پر عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

بابا منگل داس اور صاحب سوانح کی تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔

النجمۃ الثائرہ

مترجمہ مولانا سیّد سبط حسن۔ متوسط تقطیع۔ حجم ۱۰۴ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ:۔ انجمن مؤید العلوم، دار التالیف مدرسۃ الواعظین۔ لکھنؤ۔

یہ فن عروض کی مشہور عربی کتاب محیط الدائرہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ نصف صفحہ پر اصل کتاب ہے اسکے نیچے نصف صفحہ میں بامحاورہ سلیس اُردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب کی ترتیب اسطرح ہے کہ مصطلحات عروض بیان کرنے کے بعد بحور کے دائرے بنائے گئے ہیں یعنی ایک دائرہ بناکر اُسکے محیط کے گرد ایک بحر کا سالم وزن لکھا ہے اور دائرہ کے اندر اُسکے زحافات کو نشان کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے، کہ فلاں مزاحف رکن اس جگہ سے اور فلاں اس مقام سے شروع ہوتا ہے، پھر اُنکی تشریح کی ہے، بعد ازاں زحافات کی تعریف و توضیح اور اقسام و عیوب قافیہ وغیرہ بیان کئے ہیں۔ غرض فن عروض کے متعلق تمام ضروری باتیں اسمیں جمع کردی گئی ہیں۔ چونکہ عربی کا ترجمہ ہے اور تمام مثالیں عربی ہی میں ہیں، لہذا عربی زبان کے طلباء کے لئے یہ کتاب یقیناً مفید ہوگی، البتہ عربی زبان سے ناواقف حضرات اسکے مطالعہ سے پورے طور پر مستفید نہیں ہوسکتے۔

کلیات عارف (فارسی)

نتیجۂ فکر نواب سیّد خاقان حسین صاحب رضوی عارف رئیس کانپور

تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ حجم ۱۲۰ صفحات

ہمارے مکرم دوست نواب سیّد خاقان حسین صاحب اپنے علمی و ادبی ذوق کی بدولت دنیائے ادب میں کافی طور پر روشناس ہیں۔ چنانچہ آپکی کئی تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔ اُردو کے علاوہ آپ کو فارسی سے بھی دلچسپی ہے۔ اور آپ اس زبان میں بھی فکر سخن فرماتے ہیں۔ پیش نظر کلیات آپکے فارسی

ـام کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے۔ جو قصائد۔ مثنوی۔ قطعات۔ رباعیات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔

افسوس! فارسی زبان کا مذاق ہندوستان میں اسقدر کم ہوگیا ہے کہ سوائے چند قدیم اہل علم کے سکی طرف آجکل کوئی توجہ نہیں کرتا۔ حالانکہ شیرینی و لطافت کے لحاظ سے فارسی زبان کا دنیا کی اکثر زبانوں میں اوّل نمبر ہے۔

نواب صاحب موصوف کا کلام سلاست زبان، دل نشیں انداز بیان اور رفعت تخیل کا آئینہ دار ہے ذیل میں غزلیات کے چند اشعار بمونتہً ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

بصد شادی بسر کردیم ایامِ جدائی را — کہ در پے صبح اُمید است شامِ بینوائی را
خدارا ساقیا جامے بدہ زاب ریا سوزم — کہ من در مدرسہ آموختم زہد ریائی را
مرا بر سادگیہائے دلِ خود خندہ می آید — کہ از ناآشنا اُمید دارد آشنائی را
جہاں آئینۂ ذاتست گر ذوق نظر داری — بہ عالم نسبت خاصست ذوقِ خودنمائی را

خوشا روزے کہ بودم بر درِ پیرِ مغاں عارفؔ
بے آلودہ می کردم لباسِ پارسائی را

امروز بے قرار زغمہائے کیستی — بیمار تو منم تو مسیحائے کیستی
روز تو خوش ز دیدۂ حیران من بپرس — آئینہ دار ذوق تماشائے کیستی
یاراں خدائے را چہ بگویم جواب چیست — پرسد ز من کہ والہ و شیدائے کیستی
بارے تو اے قرار دل بیقرار من — آرام جان و رونق دنیائے کیستی

عارفؔ چہ حالت است کہ خوابت نمی برد
در انتظار وعدۂ فردائے کیستی

پیا بن ناگن کالی رات

(از مصورِ جذبات جناب جوشؔ ملیح آبادی)

ایک دُکھیا، حزیں، پریشاں حال — پی کی دُوری سے جی ہے جسکا نڈھال
روتی رہتی ہے ساری ساری رات — اک قیامت ہے جان پر برسات
سوئے گردوں نظر اُٹھاتی ہے — دردِ دل اِس طرح سُناتی ہے
دیکھنے کی نہیں مری حالت — زرد ہوں لے مناظرِ قدرت!
بادلوں سے ہلال کو ڈھانکو — اپنا خنجر نیام میں رکھ لو،
لے تر و تازہ حسرتو بن کی! — لے گلابی گھٹاؤ ساون کی!
جلدی اِس دیس سے گزر جاؤ — واری اک بوند بھی نہ ٹپکاؤ،
ورنہ مہکیں گے پھول گلشن میں — آگ لگ جائیگی مرے تن میں
یوں نہ پاپی پپیہے تان لگا — جس نگر میں ہیں پی وہیں اُڑ جا
دیکھ پُروائی! دل نہ کُمھلا جائے — کوئی جھونکا اِدھر نہ آنے پائے
تو ہے چوٹیں اُبھارنے والی — زُلفِ ماضی سنوارنے والی
پی کی نگری میں جاکے جھل جھل — میرے سر پر گرج نہ او بادل!
تجھ سے سینے میں ٹیس ہوتی ہے — دل دھڑکتا ہے، آنکھ روتی ہے
ہائے کیونکر نہ اختلاج رہے، — پی ہیں پردیس میں برلاج رہے
سوجھتا ہی نہیں ہے ہات کو ہات — ڈس رہی ہے نگوڑی کالی رات
کھائے جاتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا — دل میں چبھتی ہے بوندیوں کی صدا
کیا ہوا تجھکو ہائے جی کے زور؟ — مور جنگل میں کر رہا ہے شور،
سوندھی سوندھی ہواؤں کی خوشبو — بنتی جاتی ہے آنکھ میں آنسو،

یونہی چھاتی جو دھڑکے جائیگی　　ہائے کس طرح نیند آئے گی
گھر اکیلا ہے پڑ رہی ہے پھوار　　کیسا مورکھ ہے اے سکھی سنسار!
اے سہیلی بجا نہیں اوسان　　یہ تو مجھکو بتا ترے قربان
سیج سونی ہے اور برستی رات
باؤلی ہو گئی ہے کیا برسات؟

رباعیات

از جناب ریاض خیرآبادی

بہار و خزاں

منہ بند کئے ہر اک کلی آتی ہے　　لب کھولنے کو شگفتگی آتی ہے
سمجھا ہے دورِ گل خزاں کو اپنی　　ہنسنے پہ پھول کے ہنسی آتی ہے

راہ عدم

افسوس رہ لحد بھی تاریک بہت　　سمجھے جسے دور، تھی وہ نزدیک بہت
کہتے گئے یہ عدم کے جانے والے　　تاریک بہت ہے اور باریک بہت

راہ صراط

چاہا کہ جھپٹ جائیں یہی بہتر ہے　　پھر سوچے کہ ہٹ جائیں یہی بہتر ہے
بچ جائیں صراط سے یہ اعمال کہاں　　ہم شرم سے کٹ جائیں یہی بہتر ہے



کشمیر کی توی ندی[1]

از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی - بی - اے

۱) شرماتی اور لجاتی، اور اس پہ مسکراتی،
گلشن سی لہلہاتی، بلبل سی چہچہاتی،
ہنستی ہنساتی گاتی، اور ناچتی - بجاتی،
پرچاتی جا رہی ہے

۲) حورِ ارم کے سر کی گویا وہ مانگ سی ہے
سانچے میں کہکشاں کے یا آکے ڈھل گئی ہے
نورِ ازل کی پتلی ؟ چونچال ہو گئی ہے
اٹھلاتی جا رہی ہے

۳) پروا ہ تیج کا ہے ؟ صحرا کو اور بن کو
وادی کو گھاٹیوں کو، کہسار اور دمن کو
تاریک جنگلوں کو کیا باغ اور چمن کو
چمکاتی جا رہی ہے

---

[1] اس نظم کا موضوع "توی" ندی ہے ۔ یہ کیلاس پہاڑ سے نکلکر جموں کا طواف کرکے پنجاب کے شمالی میدانوں میں (...)ل ہوتی ہے اور آگے چلکر چناب میں مل جاتی ہے ۔

پہاڑی ندیوں میں اکثر سیلاب آیا کرتے ہیں ۔ "توی" میں بھی سیلاب آتے ہیں ۔ نظم ہذا کے بند ۔ ۔ میں اسکی طرف (اش)ارہ کیا گیا ہے ۔ بعض بڑی بڑی چٹانیں دریا میں واقع ہیں جنکا ذکر بند ۹ میں ہے جب جنگل کے درخت اور پہاڑ کے کڑاڑے ندی کا راستہ (رو)ک دیتے ہیں تو قدرتی طور پر ندی پیچ و تاب کھاتی ہے ۔ اس حقیقت کو بند ۱۳ ۔ ۱۵ ۔ میں ظاہر کیا گیا ہے ۔ کیلاس اور کیلاس دونوں پہاڑ ہیں (ا)ن کی تجنیس خطی کا مل ہے اسلئے "توی" کو کیلاس کے بھائی کی بیٹی کہا گیا ہے ۔ مہر آج سے شیو جی مہاراج مراد ہیں اور بھوانی - پاربتی جی کا نام ہے یہ (دون)وں سے متعلق ہیں ۔ جب یہ ندی میدانوں میں داخل ہوتی ہے تو پہاڑوں کی گھاٹیوں سے آزاد ہو جاتی ہے اور اسکا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے ۔ بند ۱۷ ۔ ۱۸ ۔ (۱)۹ ۔ اسی واقعہ کا ذکر ہے ۔

کیفی

(۴) ہے سوکھے دھانوں پانی — وہ کشت مرزباں میں
اس سے سوا بہاریں — پہنائے گلستاں میں
اسکی ہی روشنی ہے — جو نور اس جہاں میں
برساتی جا رہی ہے

(۵) درویش کی روش ہے — اس کو نہیں اقامت
گو ہے چلن میں اس کے — از حد بھری متانت
اس پر بھی چال اسکی — ہے دل کو اک قیامت
تڑپاتی جا رہی ہے

(۶) وہ نو بہ نو نظارے، — سینما کی جیسے فلمیں
چنچل پن۔ اچپلاہٹ — شوخی ہے آب گِل میں،
کیا سردمہریوں سے — اک آگ سی وہ دل میں،
بھڑکاتی جا رہی ہے

(۷) ظالم ہے چال اس کی — غنچوں کو اور گلوں کو
پرئے کی طرح وہ ہے — زندوں کو بسملوں کو
وہ محشر رواں ہے — بن والوں کے دلوں کو
ٹھکراتی جا رہی ہے

(۸) انداز اس حسیں کے — دنیا سے ہیں نرالے
پہلے تو خلق کے دل — تیر ستم سے گھالے
اور اب کیا ہے اُن کو، — بس یاس کے حوالے
کتراتی جا رہی ہے

(۹) تن پر نہیں ہے لتا — اس پر یہ طنطنے ہیں
پانی کیا ہے اُن کو، — جو سدِّ رہ بنے ہیں
جبیں بر جبیں ہے کیسی، — کف منہ سے کہہ رہے ہیں
بل کھاتی جا رہی ہے

(۱۰) اس کو نہیں لگی ہے — دنیا کی کچھ ہوا بھی

مرپیہ کی نہیں ہے — اِس کو خبر ذرا بھی
مستی میں کب ہے اسکو — ہوش اپنے جسم کا بھی
مدماتی جا رہی ہے

۱۱ گدرایا گو ہے جوبن — قابو ہے خواہشوں پر
شوق اور دل میں ارماں — ٹھہرے مچل مچل کر
بس تنگ آکے اس نے — چھاتی پہ رکھا پتھر
تیوراتی جا رہی ہے

۱۱ مطلب نہیں کسی سے — ہے اپنی دُھن کی پکی ہے
پروا نہیں جو سر پر — اسکے چلائیں چکی ہے
پست و بلندِ عالم — سے سب ہے نہ ہکی بکی ہے
لہراتی جا رہی ہے

۱۱ اس کو غرض نہیں ہے — کچھ شاہ یا گدا سے
نظارگی ہوں تو ہوں — درشن کے لاکھ پیاسے
وہ اپنے راستے پر، — گردن کو سوا دا سے
نہوڑاتی جا رہی ہے

۱۱ ہے شوقِ دید اتنا — اک بھیڑ سی لگی ہے
خاموش بن کی خلقت — دونوں طرف کھڑی ہے
وہ لاجونت مورت — سہمی سی کچھ ہوئی ہے
شرماتی جا رہی ہے

۱۱ لو دیکھو شائقوں نے — نرغے میں اس کو گھیرا
مجبور ہو گئی ہے — لرزے میں ہے سراپا
اہل ہوس کی نکلی، — پابوس کی تمنا
گھبراتی جا رہی ہے

۱۱ دیکھا جو اس کو بولیں — مہراج سے بھوانی
کیا اس کی بھتیجی — اب تو ہوئی ہے سیانی

جوبن کے پر نشے میں یہ ہو گئی دوانی
مدماتی جا رہی ہے

(۱۷) اٹھتی ہیں اب ترنگیں معصوم دل میں اکثر
اب دہنے بائیں کا بھی اس کو نہیں رہا ڈر
کھل کھیلنے کی دھن ہے پنڈے سے سبز چادر
سرکاتی جا رہی ہے

(۱۸) اس کا نہ کوئی ساتھی اس کا نہ کوئی رہبر
دم لینے کو ٹھہرتی ہرگز نہیں وہ دم بھر
تھکتی نہیں ذرا بھی پاؤں آگے آگے چل کر
پھیلاتی جا رہی ہے

(۱۹) دیدار غم رُبا سے اندوہ و رنج ہو گم
دل کی کلی کھلائے وہ عشوۂ تبسم
جاں مردہ تن میں ڈالے وہ جانفزا ترنم
کیا گاتی جا رہی ہے

(۲۰) سورج کی وہ کرن ہے جوہر ہے وہ نگیں کا
پاتا ہے نور اس سے حسن آسماں زمیں کا
درد وطن سے غمگیں دل کیفی حزیں کا
بہلاتی جا رہی ہے

جنونِ عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے
یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے
یہ سچ ہے بیخبر ہے نصف دنیا نصف دنیا سے
کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے
وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبر
کہ اُمید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

(اکبر الہ آبادی مرحوم)

عورت

از بابو شیام موہن لال جگرؔ بی ملے۔ بریلوی۔

بزم آرام ہے کاشانۂ ہستی تجھ سے — رشکِ فردوس ہے انسان کی بستی تجھ سے
لعل و گوہر ہوئے پیدا تری تزئیں کے لئے — گلِ گلشن تیری آرائش رنگیں کے لئے
چارۂ دردِ نہاں حسن تبسم تیرا — مرہمِ زخم جگر لطفِ تکلم تیرا
گل و گوہر سے فزوں تیری محبت کی نگاہ — عالمِ یاس میں پہلو ہے ترا جائے پناہ
مرد کی عصمت و ناموس کی ضامن تو ہے — جس نے چاہا نہ صلہ کوئی وہ محسن تو ہے
غمگساری کا تری گر نہ سہارا ہوتا — مرد سے بارِ غمِ زیست نہ اُٹھا ہوتا
رو کشِ آئینۂ مہر ہے عصمت تیری — مظہرِ نور تجلی ہے طبیعت تیری
حسنِ باطن کو تری خصلت و عادت پر ناز — عشقِ صادق کو ترے دردِ محبت پر ناز
لذتِ عیشِ جہاں تیری وفا کے صدقے — رونقِ بزمِ طرب تیری حیا کے صدقے

حسنِ خدمت پہ ترے افسر و اورنگ نثار
تو نہ ہو زینتِ پہلو تو خدائی بیکار

ولہ

جان اپنے لئے کھو لینے دے — مجھ کو جی کھول کے رو لینے دے
مٹ گئے اب تو سب ارماں اے دل — اب تو تو چین سے سو لینے دے
ناخدائی نہیں کرنا ہے اگر — مجھکو کشتی ہی ڈبو لینے دے
فکر ویرانیٔ دل کیا ہے ابھی — پہلے آباد تو ہو لینے دے

جوشِ گریہ پہ نہیں زور جگر
داغ دل کے مجھے دھو لینے دے

لطفِ سخن

حضرت آرزو لکھنوی

ہیرا ابھی ہے دل تو پتھر ہی یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہوکر بہ نکلے پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

سو پلٹے کھائے زمانہ نے اور دلکا رنج خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں ہی قسمت جو ایک ہی کروٹ سوتی ہے

دل دے کے جہاں مجبور ہوئے الزام ہے پھر ہر حالت میں
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں بولیں تو شکایت ہوتی ہے

غم اسکو ہے کسی پروانے کے سوزِ غمِ ہجر سے جلنے کا
فانوسِ خیال میں گھُٹ گھُٹ کر جو شمع سحر تک روتی ہے

غمخواری جب کا وش رکھیں راحت کی امید کریں کس سے
اب نیند بھی راتوں کو آکر کانٹے آنکھوں میں چبھوتی ہے

اِس فیصلہ پر تیرے ظالم رونے کے ہی قابل حالتِ دل
ٹوٹا نہ اگر تو پتھر ہے اور چور ہوا تو موتی ہے

اُلفت میں خموشی پر میری حیرت میں ہیں جو یہ کیا جانیں
پڑتا ہے داغ کلیجے میں اور مہر لبوں پر ہوتی ہے

اے آرزو اب چشموں میں ہی ظرف کا اُسکے خدا حافظ
جس دل میں جہاں کی نیرنگی سب سرد و گرم سموتی ہے

بابو شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے'

کوئی بُرا کہے کچھ مجھ کو ناگوار نہیں
کہ دل کے آگے کسی کا گناہگار نہیں

نہیں کہ وعدۂ فردا کا اعتبار نہیں
مگر یہ دل ہے مجھے اس پہ اختیار نہیں

ابھی نہیں ہوئی تکمیلِ ضبطِ جوشِ جنوں
ٹھہر ٹھہر ابھی خلوت خیال یار نہیں

دعائے مرگِ مفاجات ہے یہ دریردہ
ہمیں زمانۂ راحت کا انتظار نہیں

وہ غم تھا داغ کلیجے میں جس سے باقی ہے
یہ عیش تھا کہ کوئی جس کی یادگار نہیں

جہان دیکھا ہے جنت بھی ہم نے دیکھی ہے
دیار یار سے بڑھکر کوئی دیار نہیں

نگاہ پھیر نہ مجھ سے کہ دل لرزتا ہے
بشر ہوں میں میری ہستی کا اعتبار نہیں

چل اب خدا کے لئے خاکِ دشت پر لوٹیں
چمن میں اے دلِ ناداں کہیں قرار نہیں

جو پھونک دے نہ کلیجہ نہیں وہ آتشِ گل — جو آگ بنکے نہ دل میں لگے بہار نہیں
جہاں کا شور رہے کانوں میں نقش آنکھوں میں
نہیں جگر تم ابھی محو انتظار نہیں

جناب ممتاز علی آہ

سمجھتے نہ تھے وہ بیانِ محبت — نگاہیں ہوئیں ترجمانِ محبت
نہ ہوتی محبت تو یہ کچھ نہ ہوتا — دو عالم سے پیدا ہے شانِ محبت
مٹانے لگا ہوں میں ہستی کو اپنی — سمجھنے لگا ہوں زبانِ محبت
امیدوں میں آجاتی ہے روح تازہ — تبسم کسی کا ہے جانِ محبت
ہوئی خاک برباد اُن کی گلی میں — یہ تھا آخری امتحانِ محبت
چلا ہے کہاں کعبے نادان واعظ — بنا دل کو پہلے مکانِ محبت
رسیلی ہیں شرمیلی ہیں موہنی ہیں — اُن آنکھوں میں ہے اک جہانِ محبت
وہ شرماتے ہیں آہ سے ملنے میں اب
سنائی تھی کیوں داستانِ محبت

منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی

بے پردہ کبھی اور کبھی پردہ نشیں ہے — وہ شوخ کسی وضع کا پابند نہیں ہے
میں کیوں اسے تسلیم کروں پردہ نشیں ہے — پردے کا تو ہے نام وہ پردے میں نہیں ہے
یوں پردے میں پوشیدہ کوئی پردہ نشیں ہے — ہوتا نہیں معلوم مجھے ہے کہ نہیں ہے
وہ دیدۂ خود بیں کو نظر آ نہیں سکتا — آئینۂ ادراک میں جو پردہ نشیں ہے
پابندِ قفس ہوں مگر اے گردشِ گردوں — پھرتی مری آنکھوں میں گلستاں کی زمیں ہے
بے چین ہیں وہ جلوہ فروشی کے لئے خود — لیکن کوئی اب دیکھنے والا ہی نہیں ہے
پردیس میں تو ہوتی ہے توقیر بہت کچھ
بسمل کی مگر قدر وطن ہی میں نہیں ہے

مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے

— لپٹ جاتا ہوں جب مَیں دامنِ برقِ تجلّیٰ میں　　دکھاتی جلوۂ حق ہیں مجھے روپوشیاں میری
ترے وہم وگماں سے ہیں بعید اے ناصحِ مشفق　　جو ہوتی عالمِ بالا سے ہیں سرگوشیاں میری
— گرا جاتا ہوں میں ہر ہر قدم پر سجدہ کرنے کو　　سکھاتی ہیں نیاز و عجز کیا مے نوشیاں میری
دعا عابد کی رہ جاتی ہے یوں ہی منتشر ہوکر　　فلک پر جا پہونچتی ہیں مگر خاموشیاں میری
— تو ہے ڈوبا ہوا بحرِ خودی میں زاہدِ ناداں　　بنا دیتی مجھے بیخود ہیں بادہ نوشیاں میری
مری وارفتگی سے ہوش آتا ہے زمانے کو　　سنبھل جاتا ہے عالم دیکھکر مدہوشیاں میری
— تماشا دیکھتا ہوں دوجہاں کا ایک ساغر میں　　اُٹھا دیتی حجاب آنکھوں سے ہیں بیہوشیاں میری
— خمارِ بادۂ عرفاں سے وہ مخمور ہو جائے　　جو دیکھے ساغر و مینا سے ہم آغوشیاں میری
زمیں تو کیا، فلک بھی سرنگوں ہو سامنے میرے　　اگر دیکھے تغافل سے کبھی ہمدوشیاں میری
ہوا جاتا ہوں میں اپنے سے بیگانہ معاذاللہ　　دکھاتی رنگ وحدت کا ہیں صہبانوشیاں میری

— عیاں ہو جائیگا ناشاد سب کچھ روزِ محشر کو
بچائینگی کہاں تک مجھکو پردہ پوشیاں میری

از سیّد شریف احمد ثاقب جالندھری

حقیقت آشنا ہو بیخودی کا رازداں ہوکر　　کہ جاگ اُٹھیں اُمنگیں پھر صدائے کن فکاں ہوکر
— کہاں آزادیاں قسمت میں پابندِ جہاں ہوکر　　حقیقی زیست ہو اے دل حریفِ جسم و جاں ہوکر
نگاہیں مضطرب ہیں حسن ایمن جذب کرنے کو　　مرا ذوقِ نظر بھی آزما دیکھیں عیاں ہوکر
— وفا کی اب کہاں وقعت محبّت کی کہاں عزّت　　وہ باتیں ہیں جو صرف اب رہ گئی ہیں داستاں ہوکر
— اسیری میں بھی گلشن سے مجھے اتنا تعلق ہے　　ہر اک آنسو نکلتا ہے مرا جنّت نشاں ہوکر
— عُروج اتنا ہوا ہے مجکو حاصل خاکساری میں　　چڑھا ہوں چرخ پر میں خاک پائے رہرواں ہوکر

— ہوائیں ہیں وہ ثاقب دامنِ شمشیرِ قاتل کی
بجھاتی ہیں جو شمعِ زندگی کو آندھیاں ہوکر

علمی خبریں اور نوٹ

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کی مجلس منتظمہ نے اُردو اور ہندی کے اہل قلم کو اِس امر کی دعوت دی ہے کہ وہ اُردو و ہندی زبانوں میں عام مذاق کو ملحوظ خاطر رکھ کر مختلف شعبہائے علوم و فنون پر جلد سے جلد کتابیں تیار کریں۔ اکیڈمی تین قسم کے ناظرین کے لئے کتابیں شائع کرنا چاہتی ہے؟

اوّل اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے مغربی طریقہ پر تعلیم پائی ہو مگر اپنی ملکی زبان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں اس طبقے میں وہ طلبا بھی شامل ہیں جو ثانوی یا اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں اُردو اور ہندی کی اعلیٰ معیار کی کتابوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔

دوسرے اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے مکاتب و مدارس میں ملکی زبان میں استعداد حاصل کی ہے اور مختلف شعبہائے علوم و فنون اور ادب و تاریخ وغیرہ کی کتابوں سے اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں

تیسرے اس قسم کی کتابیں جن سے عوام فائدہ اُٹھا سکیں اس ذیل میں ان لوگوں کے مذاق و پسندیدگی کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے جو قصبات اور دیہات میں رہتے ہیں۔ اکیڈمی کی منشا ہو کہ ایسی کتابیں سلیس و سادہ زبان میں لکھی جائیں۔

اس سلسلے میں کن کن عنوانوں پر کتابیں لکھی جائینگی۔ مکمل فہرست اور مفصل معلومات اور شرح معاوضہ وغیرہ سکریٹری صاحب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے معلوم ہو سکیگی۔

آیندہ دسمبر میں ہندوستانی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ اپنے صدر مقام الہ آباد میں اکیڈمی کی سرپرستی میں اعلیٰ پیمانہ پر ایک علمی و ادبی کانفرنس منعقد کرنا چاہتی ہے تاکہ ہندی اُردو زبانوں کے علماء ایک جگہ جمع ہو کر زمانۂ حال کے ادبی ضروریات اور علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات کر سکیں۔ اسی سلسلے میں علمی لکچروں کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے، سکریٹری صاحب نے ملک کے ممتاز مصنفین کو اسکے متعلق ایک

دعوت عام دی ہے کہ وہ مباحث ذیل پر اپنے بیش بہا مضامین اس کانفرنس میں پیش کریں۔
(۱) ادبی تنقید (۲) تاریخ ادب (۳) علم اللسان (۴) فلسفہ اور سائنس (۵) تاریخ آثار قدیمہ
کانفرنس کا پروگرام یہ تجویز ہوا ہے:۔ ۱۴۔دسمبر ۱۹۲۹ء کو چار بجے سے سات بجے شام تک کانفرنس کا عام اجلاس ہوگا اور ۱۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو صبح ۸½ بجے سے ۱۱½ بجے دن تک اور سہ پہر کو ۲ بجے دن سے ۶ بجے شام تک شعبہ وار جلسے اور مختلف علمی مسائل پر مباحثے ہونگے۔
۱۳ و ۱۵ دسمبر کو اکیڈمی کی سرپرستی میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن اُردو اورنگ آباد کے اور ۱۶۔۱۷۔دسمبر کو بابو بھگوان داس صاحب (بنارس) کے علمی لکچر ہونگے۔
مضامین لکھنے والے اصحاب ۴ دسمبر تک اپنے مضامین کا خاکہ (خلاصہ) سکریٹری صاحب اکیڈمی کی خدمت میں بھیجدیں۔
ہمکو امید ہے کہ ملک کے علم دوست حضرات جنکو ہندوستانی زبانوں کی ترقی سے دلچسپی ہے۔ اس کانفرنس میں شریک ہوکر اسکو کامیاب بنائیں گے۔

یوں تو اُردو زبان کی کتابیں ہمیشہ ہی کم چھپتی ہیں مگر سال رواں کی دوسری سہ ماہی میں صوبہ متحدہ میں صرف پچپن کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ تعداد گزشتہ سہ ماہیوں کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ کام کی کتابیں دو چار سے زیادہ نہیں۔ مطبوعہ کتابوں کی تفصیل بلحاظ موضوع مضمون حسب ذیل ہے۔

آرٹ ۔ ۱	ڈراما ۔ ۱	قانون ۔ ۱	سیاسی ۔ ۳
سوانح ۔ ۲	قصص ۔ ۵	طب ۔ ۲	مذہبی ۔ ۳
تعلیمی ۔ ۱۴	متفرق ۔ ۷	نظم ۔ ۱۷	

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) درحقیقت قابل قدر کام کرنیوالی انجمن ہے خصوصاً جب سے ہمارے دوست مولوی سید عبدالحق صاحب اسکے سکریٹری مقرر ہوئے ہیں، یہ انجمن اُردو کی توسیع و ترقی کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دے رہی ہے۔ سکریٹری صاحب کی حسن کوشش سے انجمن کو اعلیحضرت تاجدار دکن کی سرپرستی کے علاوہ ہندوستان کے اکثر علم دوست رؤسا کی امداد حاصل ہے، آپکی مستعدی اور تندہی کا مزید ثبوت انجمن کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۲۸ء سے بھی ملتا ہے، ۱۹۲۸ء میں انجمن کی جانب سے

پانچ علمی و ادبی کتابیں شایع ہوئیں، چھ مزید کتابیں زیر طبع ہیں اور پانچ طبع ہونیکے لئے تیار ہیں، انجمن اُردو میں لیتھو کے بجائے ٹائپ کو رواج دینے کی کوشش کر رہی ہے اور اسکے عالمانہ سہ ماہی رسالے اُردو اور سائنس کے علاوہ تمام دیگر مطبوعات بھی اب ٹائپ میں ہی چھپتے ہیں۔ یہ بجائے خود اُردو کی آیندہ ترقی کے لئے ایک اہم کارروائی ہے، انجمن کا محفوظ سرمایہ اسوقت ساڑھے پچیس ہزار کے قریب ہے اور اب اسکو ایک لاکھ تک پہنچا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، دوامی ارکان انجمن کی تعداد ایک سو ہے، جنمیں مسلمان ہندو اور عیسائی وغیرہ علم دوست حضرات شامل ہیں۔ ننانوے شاخیں اور کتب خانے اور چھبیس ذیلی انجمنیاں ہندوستان کے طول و عرض میں کام کر رہی ہیں۔ سال گذشتہ میں عطیات، فروخت کتب و دیگر ذرائع سے انجمن کو تقریباً باون ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی اور چھیالیس ہزار روپیہ کے قریب خرچ ہوا، سال رواں میں آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ۴۹ اور ۴۸ ہزار روپیہ کیا گیا ہے۔ اس کارگزاری پر ہم سکریٹری صاحب انجمن و نیز انکے تمام شرکار کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اُمید ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی رہنمائی میں انجمن ترقی اُردو، اُردو زبان کے لئے وہی خدمات انجام دیگی جو ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے ہندی کی ترویج و ترقی کے لئے انجام دی ہیں۔

کارمائیکل لائبریری بنارس ۱۸۷۲ء سے قائم ہے اور روز بروز ترقی پذیر ہے۔ اسکی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۲۸ء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت اسمیں مختلف زبانوں کی تیرہ ہزار سات سو چھپّن (۱۳۷۵۶) کتابیں موجود ہیں۔ جنمیں زیادہ تعداد انگریزی زبان کی کتابوں کی ہے، باقی اُردو۔ فارسی۔ ہندی۔ سنسکرت۔ بنگالی۔ گجراتی اور مرہٹی زبانوں کی کتابیں ہیں۔ ساٹھ سنسکرت کی قلمی کتابیں بھی موجود ہیں۔ مستقل کتابوں کے علاوہ ماہوار رسائل، ہفتہ وار اور روزانہ اخبار بھی مختلف زبانوں کے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ لائبریری کے دو سو دس ممبر ہیں۔ عام چندہ اور عطیات کے علاوہ ایک ہزار روپیہ گورنمنٹ اور ایک ہزار روپیہ مقامی میونسپل بورڈ سے سالانہ بطور امداد ملتے ہیں۔ چونکہ لائبریری کی موجودہ عمارت اسکی ضروریات کے واسطے کافی نہیں ہے اس لئے توسیع عمارت کے لئے کوشش کی جا رہی ہے اُمید ہے کہ بنارس کے علم دوست و حوصلہ مند اصحاب کی امداد و اعانت سے یہ کمی بھی جلد پوری ہو جائیگی۔

ہمارے دوست ایس۔ ڈی۔ راٹھور صابر اور پیارے لال صاحب آنند کے علمی و ادبی ذوق کی بدولت کھنا ضلع لودھیانہ (پنجاب) میں ایک بزم سخن قائم ہے گزشتہ بسنت کے موقع پر اس بزم کا پانچواں

سالانہ جلسہ ہوا تھا جس میں مقامی حضرات کے علاوہ اطراف وجوانب کے شعرا بھی شریک تھے۔ اس جلسے میں جو منظوم کلام پڑھا گیا تھا اسکا انتخاب "ارمغان بسنت" کے نام سے آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ منتخب حضرات میں منشی مہاراج بہادر برق بی۔اے دہلوی۔ چودھری جگت موہن لال رواں منشی تلوک چند محروم بی۔اے، منشی پیارے لال رونق دہلوی۔ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ہم جناب صابر و آنند صاحبان کو اس جلسہ کی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

اس ماہ میں "اُردو شاعری کی ذہنی تاریخ" کے عنوان سے جو افتتاحیہ مضمون ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، وہ ہمارے دوست جناب صفیر صاحب کی ایک مستقل تصنیف سے ماخوذ ہے جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہے یہ تصنیف صاحب موصوف کے وسیع مطالعہ اور تحقیق علمی کا ایک کامیاب نتیجہ ہے۔ اُمید ہے کہ اس قابل قدر کتاب کے شایع ہونے پر اُردو زبان کی شاعری کے متعلق بہت سی کارآمد و مفید باتیں معلوم ہوں گی۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ چند سال سے روزانہ اخبارات قابل قدر ترقی کر رہے ہیں خصوصاً صوبۂ پنجاب و دہلی کے اخبارات میں ایک امتیازی شان کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ چنانچہ۔ تیج (دہلی) بندے ماترم (لاہور) ملاپ (لاہور) زمیندار (لاہور) و انقلاب (لاہور) وغیرہ معمولی روزانہ اشاعتوں کے علاوہ ہر ہفتہ ایک خاص پرچہ "سنڈے ایڈیشن" کے نام سے شایع کرنے لگے ہیں۔ سال میں دو ایک خاص نمبر بھی غیر معمولی اہتمام و ضخامت کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ چنانچہ موقر ہمعصر ملاپ لاہور کا "ہولی نمبر" اور معزز تیج دہلی کا "کرشن نمبر" جو اسوقت ہمارے سامنے ہیں اس دور ترقی کی بیّن دلیل ہیں۔ دونوں پرچے کیا بلحاظ حسن ظاہری اور کیا بہ اعتبار محاسن باطنی قابل دید ہیں۔ مضامین کے تنوع کے ساتھ رنگین تصاویر کا اضافہ بہت پسندیدہ و مقبول خاص و عام ہے۔ ہم اپنے معاصرین کی اس ترقی و کامیابی پر مسرور ہیں اور دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

تصحیح | "زمانہ" بابت ماہ اگست ۱۹۲۹ء میں صفحہ ۹۶ کے حاشیہ پر جو شعر درج ہے وہ حضرت ناسخ کا نہیں بلکہ جناب ذوق دہلوی کا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔



مرتابی مزدور

زمانہ

جلد ۵۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء نمبر ۴

خواجہ حیدر علی آتش

از مرزا جعفر علی خاں اثر بی اے۔ لکھنوی

مراد یواں ہے ملے آتش خزانہ ہراک بیت اسمیں ہے گنج معانی

خاندانی حالات[1] خواجہ حیدر علی نام آتش تخلص تھا، آبا و اجداد قدیم باشندے دہلی کے تھے۔ شجاع الدولہ کے عہد میں انکے والد خواجہ علی بخش درویش سالک دہلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں قیام کیا۔ مسند فقر بھی قائم تھی اور سلسلہ پیری مریدی کا بھی تھا۔ صغر سنی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، کوئی مربی موجود نہ تھا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آتش بانکے اور شورہ پشت ہوگئے۔ اُس زمانہ میں بانکپن اور بہادری کی بہت قدر تھی، آتش کو اپنی جیوٹ دکھانے کے بہت سے موقعے ملے۔ مغل بچوں کی صحبت میں تیغ زنی بھی آگئی تھی۔ کمسنی سے تلوریئے مشہور ہوگئے۔ اس جوہر کے قدردان فیض آباد میں نواب میر محمد تقی تھے۔ آتش کو نوکر رکھکر اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔

وضع و قطع و طرز معاشرت[1] آتش گورے چٹے وجیہہ چھریرا بدن اور رندانہ وضع کے آدمی تھے۔ آدھا سر منڈا ہوا اور آدھے سر پر پٹے۔ کھانڈا باندھتے تھے۔ نواز گنج کے قریب چوبٹیوں سے آگے مادھو لال کی چڑھائی

---

[1] ماخوذ از تذکرۂ آب بقا۔

مشہور ہے، وہاں سے اُتار کو ایک چھوٹا سا باغچہ اور ایک کچا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا اور وہیں رہنے لگے اولاد میں صرف ایک لڑکا محمد علی تھا جو اُنکے انتقال کے بعد صرف دو برس زندہ رہا۔

مولوی صادق علی کہتے تھے کہ آتش کو میں نے دیکھا ہے، گیر داتہ بند باندھتے تھے۔ ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا جس میں ایک سونے کا چھلا ہوتا تھا۔ دوسرے تیسرے فاقے کی حالت میں چھلا رہن رکھکر فاقہ شکنی کرتے تھے۔ سچے کام کا سلیم شاہی جوتا ایک اشرفی قیمت کا پہنتے تھے۔ بے طمع اور بے غرض تھے کبھی شاگردوں سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کرتے تھے اور اکثر اپنی دولت دعوت اور ضیافت میں لٹا دیا کرتے تھے۔ پچاس یا اسی روپیہ ماہوار بادشاہ اودھ کی طرف سے وظیفہ مقرر تھا وہ چار دن میں خرچ کر ڈالتے تھے۔

منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم کہتے تھے کہ ہمنے جس وقت آتش کو دیکھا کوئی ستر برس کے قریب ہو گئے ایک بالشت سے زیادہ داڑھی تھی، مہندی کا خضاب کرتے تھے۔ معالیخاں کی سرا میں رہتے تھے۔ ایک لنگوٹ باندھے ٹوٹے ہوئے کھٹولے پر جو زمیں دوز تھا تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ بیچ بیچا حقہ سامنے رکھا رہتا تھا جو کوئی امیر یا غریب آتا سب کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش ہوتا۔

وارث علی خاں انکے رفیق بھنگ گھوٹ کر پلایا کرتے تھے۔ مزاج میں توکل تھا جو کچھ آتا اُسکو اُسی روز خرچ کر ڈالتے تھے دوسرے روز کے لیے کچھ نہ رکھتے تھے جس روز فاقہ ہوتا دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ رہتے۔ ایک روز رسالہ دار فقیر محمد خاں گویا کو معلوم ہوا کہ آتش آج کل بہت تکلیف میں ہیں کچھ روپیہ لیکر آئے۔ دروازہ بند تھا آواز دی، اندر سے آواز آئی کون ہے یہ بولے فقیر۔ آتش نے کہا فقیر کا میرے یہاں کام نہیں آج خدا مہمان ہے (فاقہ ہے) دوسرے روز پھر آئے مشکل سے دروازہ کھولا۔ انکا لڑکا بہت کمسن تھا کوٹھے پر کنکوا اُڑا رہا تھا سامنے بُلایا اور اُسکا کنکوا چرخی ڈور دیکھکر کہا کہ یہ کنکوا تو اچھا نہیں ہے کٹی لیتا ہوگا، ڈور بھی اچھی نہیں سُتی ہے، دو ہزار کی دو تھیلیاں سامنے رکھوا دیں کہ بھئی اُسکا کنکوا ڈور منگا نا۔ آتش بات کی تہ کو پہنچ گئے کہ خانصاحب مجھکو زیر بار احسان کرنا چاہتے ہیں، کہنے لگے آپ کو چاہئے تھا کہ اسکو تادیب دیتے کہ ایسے اشغال سے باز رہتا نہ کہ آپ خود ڈور کنکوے سے مدد دیں۔ یہ کہکر پانچ روپئے نکال کر لڑکے کو دیئے اور کہا خانصاحب کو سلام کرو اسکی چیز کھانا باقی روپئے خانصاحب کو واپس کر دیئے۔

نواب معتمد الدولہ (آغا میر) ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کے مشاعرے بہت دھوم دھامی ہوا کرتے تھے اکثر آتش کو بھی بلواتے تھے۔ یہ اُسی بانکپن سے اکڑتے ہوئے جاتے تھے۔ تلوار میان سے دو اُنگل باہر رہتی تھی لوگ کہتے تھے خدا خیر کرے ایسا نہ ہو مشاعرے میں خون کی ندیاں بہ جائیں۔ دونوں مشہور شاعر اور دونوں کے بیشمار شاگرد۔ ایک مرتبہ جو مشاعرہ کیا تمام شہر میں مصرع طرح تقسیم کر دیا لیکن آتش کو ایک روز پیشتر

بھیجا۔ آپنے فرمایا شاید معتمد الدولہ بہادر کو ہمارا امتحان منظور ہے۔ خیر یوں تو ہم نہ جاتے مگر اب جانا ضروری ہے۔ غزل کہی تلوار کمر سے لگائی۔ بنکے وار ٹوپی دی۔ شاگردوں کے جم غفیر سے مشاعرہ میں داخل ہوئے دیکھا تو معتمد الدولہ نے نیا مکان جو تعمیر کرایا ہے اُسی میں مشاعرہ ہے۔ مکان کو دیکھکر فی البدیہہ یہ مطلع کہا جب انکے سامنے آیا تو پڑھا ؎

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے　　　زمیں جسکی چہارم آسماں ہے

مطلع تھا موقع کا دشمن کے منہ سے بھی واہ نکل گئی۔ معتمد ولہ نے اُسی وقت خلعت دیا اور بہت عزت کی۔

ایک اور معرکہ اسیطرح کا پیش آیا تھا۔ آغا میر نے مشاعرہ کیا اور ارادہ کیا کہ شیخ ناسخ جب غزل پڑھیں تو سرِ مشاعرہ خلعت دیں۔ یار لوگوں نے خواجہ صاحب کے پاس مصرع طرح نہ بھیجا۔ اُنھیں اُسوقت مصرع پہنچا جب ایک دن مشاعرہ میں باقی تھا۔ خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں ہم نہ رہینگے۔ شاگرد جمع ہوئے اور کہا آپ کچھ خیال نہ فرمائیں نیاز مند حاضر ہیں۔ دو دو شعر کہیں گے تو صدہا شعر ہو جائینگے۔ وہ بہت تند مزاج تھے۔ اُن سے بھی وہی تقریریں کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے۔ پھرتے پھرتے ایک مسجد میں جا بیٹھے وہاں سے غزل کہکر لائے اور مشاعرہ میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کر لیتے گئے بیٹھے ایسے موقع پر کہ عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اول تو آپکا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا اُسپر قرابین بھری سامنے رکھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اُٹھاتے اور رکھدیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کرکے پڑھا ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　　کہتی ہے تجکو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس ساری غزل میں کہیں اُنکے لے پالک ہونے پر کہیں ذخیرۂ دولت پر کہیں اُنکے سامان امارت پر غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور ہے۔ شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے رہے۔ نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ اُن پر قرابین خالی کریں یا میرے پیٹ میں آگ بھردیں۔ اُسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لئے تیار کرو۔ غرض دونوں صاحبوں کو برابر خلعت دیکر رخصت کیا۔ (منقول از تذکرۂ آبحیات)

شیخ ناسخ سے برابر معرکے رہتے تھے مگر جب اُنکے مرنے کی خبر سُنی تو ڈاڑھیں مارکر رونے لگے۔ لوگوں نے کہا کہ وہ تو آپ کے حریف تھے ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی آپکو خوش ہونا چاہیئے کہ ایک دشمن کم ہو گیا۔ کہنے لگے میاں کیا کہتے ہو؟ ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر اور ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ ہمیشہ دوستی کا برتاؤ رہا۔ شاعرانہ نوک جھونک کی اور بات ہے، اتنا پرانا تو دشمن بھی نہیں ملتا۔

ناسخ کے انتقال کے بعد نو برس تک زندہ رہے مگر پھر شعر نہیں کہا۔ فرماتے تھے کہ شعر کہنے کا لطف سُننے

اور سنانے کے ساتھ ہے۔ جس شخص سے سنانے کا لطف تھا جب وہ نہ رہا تو اب شعر کہنا نہیں بکواس ہے'

آتش گھی میں تلی ہوئی مرچیں کھایا کرتے تھے اور آخر وقت میں بینائی جاتی رہی تھی۔

استعداد علمی | والد کے انتقال کے سبب سے ابتدائی عمر میں آتش کی تعلیم نامکمل رہ گئی تھی۔ لکھنؤ پہنچکر آتش کی صحبت بدل گئی۔ کتب بینی کا شوق ہوا اور دن رات علمی چرچے رہنے لگے۔ اُسوقت دوستوں کی تاکید سے درسی کتابیں دیکھیں۔ باوجود اسکے کافیہ کو کافی سمجھکر آگے پڑھنا فضول سمجھا۔ اسی زمانہ میں شاعری کا چرچا دیکھکر اس طرف توجہ ہوئی اور طبیعت مشاعروں میں کمال دکھانے لگی (تذکرۂ آبحیات)

کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافی استعداد بہم پہنچالی تھی۔ غزلوں میں فارسی شعرا (بالخصوص صائبؔ) اور اُردو کے شعرائے متقدمین میرؔ و سوداؔ و دردؔ کا برابر ذکر ہے اور اُنکی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ اکثر موقعوں پر لوگوں نے ٹوکا ہے اور اُنھوں نے اعتراض کا فوراً جواب دیا ہے۔ چنانچہ میر تقی ترقیؔ کے یہاں مشاعرہ تھا خواجہ صاحب نے غزل پڑھی شکم کے مضمون میں موج بحر کافور باندھا تھا۔ طالب علیخاں عیشیؔ نے وہیں ٹوکا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میاں ابھی بہت مدت چاہیئے دیکھو تو سہی جامیؔ کیا کہتا ہے ؎

حبابے خاستہ از بحر کافور

آتش پڑھے لکھے تھے۔ بقول مصنف تذکرۂ گل رعنا ـــــــــ

"اُس زمانہ میں ایک معمولی سے معمولی آدمی کی زبان پر مصطلحات علمی ایسی بے تکلفی کیساتھ رواں ہوتے تھے "کہ انکو سُنکر کسی طرح یہ باور نہیں آتا تھا کہ اس نے درسی کتابیں نہیں پڑھیں۔ اب بھی لکھنؤ میں شاہی زمانہ" "کے جو سن رسیدہ لوگ موجود ہیں اُن سے مل کر اسکی تصدیق کیجاسکتی ہے۔"

"میرے بچپنے میں ایک فقیرنی بھیک مانگنے آیا کرتی تھی، پیر فرتوت مگر آواز میں لوچ اور شیرینی" "صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوانی میں بہت شکیل اور کسی شریف گھرانے کی لڑکی ہوگی۔ میرے" "ایک دوست نے اسکی بہت تعریف کی اور کہا باتیں کرنا چاہو تو دو چار آنہ کی بالائی منگوا کر سامنے رکھدو" "میں نے اُسکو بُلا کر بٹھایا اور بالائی پیش کی تو بیحد خوش ہوئی اور باتیں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ فارسی اور اُردو کے اساتذہ کا کلام خصوصاً سعدیؔ شیرازی کے منتخب اشعار اور گلستاں کے برجستہ فقرے اس طرح برمحل پڑھتی اور ترجمہ کرتی تھی کہ اُسکی حلاوت آج تک یاد ہے۔"

آتش نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں تحصیل علم کی رغبت دلائی ہے اور وہ ایسا آدمی نہ کہ کہے کچھ اور کرے کچھ، دو شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

افسوس ہے انسان ہو علم کا جویا، وہ مال ہے یہ صرف سے جو کم نہیں ہوتا

چاہے شکست جہل تو تحصیل علم کر، وابستہ یہ طلسم ہے لوح کتاب کا

اُنکے کلام میں ایسے مضامین و مسائل و تلمیحات نظم ہیں جن پر بغیر وسیع مطالعہ کے عبور دشوار ہے

غالباً وہ ابتدائی کلام ہے جبمیں لغزشیں ہین۔

تلمذ | مصحفی کے شاگرد تھے۔ مگر کچھ دن بعد ان بن ہوگئی اور کلام دکھانا ترک کردیا۔

مذہب | مذہب شیعہ تھا۔ خود کہتے ہیں۔ ؎

مومن کا مددگار ہے شاہ نجف ایدل، حامی ہے ترا شیر خدا لاتخف ایدل
بت توڑنے کو دوشِ نبی پر وہ چڑھا ہے، کعبہ کو تولد سے ہے اُسکے شرف ایدل،
معصوم ہے عیبوں سے زمانے کے بری ہے، وہ لالہ ہے داغ وہ ہے کلف ایدل
خاکِ نجف اکسیر ہے مومن کی نظر میں، شفاف ہے الماس سے وہ نجف ایدل
حاصل اُسے تو قلزم قدرت کا سمجھ لے، گو ہر ہے علی کون و مکاں ہے صدف ایدل

سنین ولادت و وفات | تذکرۂ آبِ بقا کے مطابق سنہ ولادت تقریباً ۱۷۶۴ء ہوتا ہے۔ سنہ وفات میں کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی ۱۲۶۳ھ ہجری مطابق ۱۸۴۷ء، جو میر ولد حسین فوق کے مصرع تاریخ ع۔ لکھنؤ میں نام آتش کر گئے۔ سے نکلتا ہے۔ اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے مگر اب مکان یا قبر کا پتہ نہیں۔

کلام | سوا غزل کے تمام عمر اور کچھ نہیں کہا۔ نتیجۂ فکر دو دیوان ہیں ایک زندگی میں شایع ہوکر مقبول ہوچکا تھا، دوسرا بعد وفات مرتب ہوا۔

آتش کے متعلق تذکرہ نویسوں کی رائیں | از مشاہیر شعرائے لکھنؤ است .... در نکوئی طبعش سخن نیست،

(تذکرۂ گلشن بے خار)

" مصحفی کے شاگرد تھے اور حق یہ ہے کہ انکی آتش بیانی نے اُستاد کے نام کو روشن کیا بلکہ کلام کی گرمی اور چمک دمک نے اُستاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اُجالے کا امتیاز دکھایا۔۔۔ جو کلام انکا ہے حقیقت میں محاورۂ اُردو کا دستور العمل ہے اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح اُنھوں نے

نے شعر کہہ دیئے ہیں ——— خواجہ صاحب کے کلام میں بول چال اور محاورے اور روزمرہ کا لطف بہت ہے۔ (تذکرۂ آبحیات)

آتش کے کلام میں تشبیہات کی لطافت، استعارات کی نزاکت، رنگ رنگ کے خیالات، تصوف کی جھلک، ہمت، توکل، استغنا کے عمدہ مضامین، فلسفہ، معاشرت، اور خانگی زندگی کے خصوصیات، زمانہ کی رفتار گفتار نشست و برخاست، وضع قطع بود و باش کے طریقے، زندگی کی ضرورتیں جذبات انسانی، مناظر قدرت۔ صحرا جنگل، سبزہ زار، آب رواں، شجاعت و جانبازی کی جیتی جاگتی صورتیں نظر آتی ہیں جن کا مقابلہ کرنے میں انکے معاصرین عاجز تھے۔ (تذکرۂ آب بقا)

آتش و ناسخ اپنی اپنی روش و رنگ میں کامل تھے۔ اگر شیخ صاحب موزونی و صحت الفاظ و تلاش مضامین عالی میں بڑھے ہوئے تھے تو خواجہ صاحب بھی لطف محاورہ و فصاحت و نفاست بندش، خوش اسلوبی طرز بیان میں اُن سے کم نہ تھے اسی وجہ سے پڑھنے والے کے دل پر انکے کلام کا بالمقابل زیادہ اثر ہوتا ہے۔ (تذکرہ خمخانۂ جاوید)

زبان کی صحت و صفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ کے دوش بدوش چلتے ہیں مگر نازک خیالی اور بلند پردازی میں انکا حریف ان سے بہت اونچا جاتا ہے اور سوز و گداز میں یہ اُن سے آگے ہیں۔ (تذکرۂ گل رعنا)

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبدالغفور کے نام ہے کسی تقریب سے یہ قطعہ نقل کیا ہے[5]

اگر چہ شاعران نغز گفتار　　زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں　　خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اسکے بعد اس چیزے دگر کی مثال میں میر تقی میر مرزا سودا قائم اور مومن کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ ناسخ کے ہاں کمتر، آتش کے یہاں بیشتر، یہ سر تیز نشتر ہیں۔

بعض لطائف سے جو آبحیات میں درج ہیں۔ آتش کے توکل اور فطرت معصوم پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک شاگرد اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے اور خواجہ صاحب اپنی آزادہ مزاجی سے کہا کرتے تھے کہ میاں کہاں جاؤ گے، دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو، اور جو خدا دیتا ہے اس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور کہا کہ حضرت رخصت کو آیا ہوں۔ فرمایا خیر باشد کہاں۔ انھوں نے کہا بنارس کو روانہ ہونگا، کچھ فرمایش ہو تو فرما دیجئے۔ آپ ہنسکر بولے اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ہمارا

بھی سلام کہدینا۔ وہ حیران ہوکر بولے کہ حضرت یہاں اور وہاں کا خدا کوئی جدا ہے۔ فرمایا کہ شاید یہاں کا خدا بخیل ہے وہاں کا کچھ سخی ہو۔ اُنھوں نے کہا معاذ اللہ آپکے فرمانے کی یہ بات ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ بھلا سنو تو سہی جب خدا وہاں یہاں ایک ہے تو پھر اسے کیوں چھوڑتے ہو، جس طرح اُس سے وہاں جاکر مانگوگے اُسی طرح یہاں مانگو۔ جو وہاں دے گا تو یہاں بھی دیگا۔ اس بات نے اُنکے دل پر ایسا اثر کیا، کہ سفر کا ارادہ موقوف کیا اور خاطر جمع سے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقۂ سنت جماعت سے تھا اُسنے ویسی ہی نماز سکھائی اور یہ کہدیا کہ اُستاد عبادت اُلہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کرکے اُسی طرح پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل انکے شاگرد خاص اور خلوت وجلوت کے حاضر باش تھے، ایک دن اُنھوں نے بھی دیکھ لیا بہت حیران ہوئے یہ نماز پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا کہ اُستاد آپکا مذہب کیا ہے؟ فرمایا شیعہ ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ نماز سنیوں کی! فرمایا کہ بھئی میں کیا جانوں، فلاں شخص سے مینے کہا تھا اُس نے جو سکھادی سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی دو دو نمازیں ہیں۔ اُسی دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے۔

شاگرد | جتنے شاگرد اُنھوں نے پائے کسی اُستاد کو نصیب نہیں ہوئے۔ ان میں سے سیّد محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ ہدایت علی جلیل۔ صاحب مرزا شاور۔ مرزا عنایت علی بسمل۔ نادر مرزا نیض آبادی۔ پنڈت دیاشنکر نسیم زیادہ نامور گزرے۔ لکھنؤ کے مشہور سخن سنج حضرت ناطق کے والد مولوی سیّد محمد عبدالبصیر حضور بلگرامی بھی آتش کے شاگرد تھے۔

چاند ہندی کے مشہور ماہوار رسالہ "چاند" الہ آباد کے مالک نے اپنے اُردو خواں ناظرین کے اصرار سے اسکا ایک اُردو ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اُردو ایڈیشن کے ایڈیٹر، منشی نیشوری پرشاد سنہا۔ بی۔ ایس۔ سی۔ ایل۔ ایل۔ بی اور منشی کنہیا لال ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس مقرر ہوئے ہیں۔ ہندی چاند کی طرح اُردو ایڈیشن بھی مصوّر ہوگا اور مشاہیر اہل قلم وشعرا کے مضامین نثر و نظم سے اسکے صفحات کو زینت دیجائیگی۔ غالباً آیندہ ماہ میں اس کا پہلا نمبر شائع ہو جائیگا۔

ہندی اور مسلمان

(از مسٹر جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی)

زمانہ قدیم میں سنسکرت زبان کا یہ عروج تھا کہ اُسے ہندوستان کی عام زبان ہونیکا فخر حاصل تھا۔ لیکن انقلاب روزگار کے ہاتھوں وہ ایسی پامال ہوئی کہ ایک خاص طبقہ تک ہی محدود و مخصوص ہوگئی۔ سنسکرت کے بعد دوسرے درجہ کی پراکرت زبانوں نے اوج و فروغ پایا۔ ہندی کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل شمالی ہند میں جو زبانیں مروّج تھیں اُنکی مختصر کیفیت یہ ہے کہ بہار میں مگدہی منہ لگی ہوئی تھی۔ بگھیلکھنڈ اور اودھ کے علاقہ میں اودھ مگدہی کا بول بالا تھا۔ متھرا کے اطراف و جوانب و نیز پنجاب کے سرسبز میدانوں میں "سورسینی" کا طوطی بول رہا تھا۔ اسی سورسینی زبان کے بگڑنے سے پنجابی، برج بھاشا اور پوربی ہندی وغیرہ مختلف زبانیں وجود میں آئیں۔

سنہ ء سے مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے۔ اسی سنہ عیسوی کے اوائل میں محمد بن قاسم نے گجرات کے فرمانروا داہر پر چڑھائی کی۔ اسکے بعد مسلمان حملہ آوروں کا تانتا بندھا رہا۔ ان مسلسل حملوں کا اہلِ ہند پر کوئی مستقل اثر نہوا۔ لیکن تیرھویں صدی کے آغاز میں نو واردِ جفاکشانِ مغرب نے اہلِ ہنود کو پسپا و مرعوب کرکے سرزمین ہند میں اپنی حکومت کا ڈول ڈالا۔ مغلوں کے عہد میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں بہت مستحکم ہوگئیں اور اسکے طول و عرض میں بھی بہت کچھ اضافہ ہوا۔ حالانکہ اسی دور میں اسکا زوال بھی شروع ہوا۔

محمود غزنوی کے ابتدائی حملوں کے بعد ہی سے ہر دو اقوام کے افراد باہم خلط ملط ہونے لگے۔ یہ خلوص و ارتباط سیاسیات وقت پر چاہے کچھ زیادہ اثر انداز نہوا ہو لیکن دو مختلف النسل و طبائع اقوام کا علم و ادب ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہندوستان کا غیر ملکی مورخ البیرونی جو محمود کے ہمراہ ہند میں آیا شاید پہلا مسلمان تھا جس نے سنسکرت زبان پر عبور حاصل کیا۔ ہندوؤں نے بھی حالات سے مجبور ہوکر فارسی (جو مسلمانوں کے ساتھ آئی) علم و ادب کی تحصیل و تدریس کی جانب توجہ کی۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ ظفریاب مسلمانوں پر جوں جوں مہذب ہندوؤں کی اعلیٰ تہذیب کا رنگ چڑھتا گیا وہ اس حقیقت کی اہمیت کا احساس کرتے گئے کہ کوئی قوم یا مذہب اسکی تہذیب و تمدن کے اثرات قبول کئے بغیر زیر نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں ہندی کی حلاوت نے مسلمان کو بھی ہندی زبان کے باغ کی سیر و گلگشت اور اپنی مادری زبان کو اسکے شاداب و خوشنما پھولوں سے زیب و زینت دینے پر مجبور کیا۔ چنانچہ انمیں سے بیشتر خود ہندی علوم و معارف کے چمن پر بہار کی آبیاری میں مشغول ہوگئے۔

فارسی کا مشہور ادیب و شاعر علی حزیں جب ہندوستان آیا تو اسے بھاشا کی شیرینی سے لطف اندوز ہونیکا اشتیاق کشاں کشاں برج بن کے کنجوں کی خاک چھنواتا پھرا۔ وہاں برج کی گوپیوں کی شیریں زبانی دیکھکر یہ حیران و ششدر رہ گیا،

کہا جاتا ہے کہ ہندی میں شعر و سخن کی ابتدا چند ورداؐئی نے بارھویں صدی میں "راسو" لکھ کر کی۔ ہندی لٹریچر کی تاریخ کے اوراق میں چند ورداؐئی سے پیشتر کے آٹھ دس شعراء کا ذکر مدفون ہے۔ مگر حیف اب انکی تصانیف دستیاب نہیں ہوتیں۔ تاہم ایک بات خاص طور پر قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ ان معدودے چند شعراء میں سے (۱) مسعود (۲) قطب علی اور (۳) اکرم فیض یہ تینوں مسلمان تھے۔ آخرالذکر نے "ورت رتناکر" (वृत्तरत्नाकर) کا ہندی میں ترجمہ کیا تھا۔

ہندی ادب کی تاریخ نے امیر خسروؔ، ملّا داؤد خاں خاناں عبدالرحیم اور ملک محمد جائسی جیسی مایۂ ناز ہستیوں کو حیاتِ دوام بخش دی ہے۔ امیر خسرو (۱۲۵۶ء - ۱۳۲۵ء) ہندی کھڑی بولی کے خدائے سخن تھے۔ اُنھوں نے صرف کھڑی بولی میں شعر کہنے ہی کو رواج نہیں دیا۔ بلکہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کو باہم شیر و شکر کرنے کی وہ مشکور کوشش کی جو یادگار روزگار رہے گی۔ اپنے اس بلند مطمح نظر تک پہنچنے کے لئے زندۂ جاوید خسروؔ نے جو ذرائع اختیار کئے انمیں سے ایک یہ بھی تھا کہ اُنھوں نے ملی جلی زبان میں ایک لغات نظم کی جو زبان زد خاص و عام ہوگئی۔ اس قابل قدر نسخہ سے چند اشعار بطور نمونہ ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

فارسی بولی آئی نا، ترکی سوچی پائی نا،
ہندی بولتے آرسی آئے منھ دیکھو جو اسے بتائے
(آئینہ)

امیر خسروؔ کا کلام ہندی زبان میں ہے۔ لیکن اُنھوں نے اپنے اشعار میں بلا تکلف عربی و فارسی الفاظ داخل کئے ہیں۔ آپکا کلام اعلیٰ تخیل و جذبات کا آئینہ ہونیکے ساتھ ساتھ تصنع و بناوٹ سے بھی بالکل مبرّا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُورائے نیناں بنائے بتیاں (آنکھیں چرا کر)
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

آپکی نکریاں تو اسقدر شہرت حاصل کر چکی ہیں کہ اب تک زبان زدِ ہر خاص و عام ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اللہ والوں نے بُت پرستی کے خلاف عام جہاد کا صور پھونک دیا تھا۔ اور ہندوؤں کے معبد گرانا اپنا نصب العین بنالیا تھا۔ انکے معبودوں کی برملا بے حرمتی بُت شکن کارِ ثواب سمجھے ہوئے تھے قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا۔ ہزیمت خوردہ ہندو اپنی منتشر طاقت کا اجتماع کرکے غنیم کے مقابل صف آرا ہوتے، لیکن ان معرکہ آرائیوں میں انکی ایک پیش نہ جاتی تھی۔ اسی آلام و مصائب کے زمانہ میں کبیر صاحب نے پیدا ہوکر "سادھو منتھ" کو ترویج دینے کیلئے اپنی زندگی وقف کردی۔ اس نئے مذہب کی بنیاد اس لئے پڑی کہ اسکے بانی مبانی سنت کبیر "تفریقِ مذہب" کو حرفِ غلط کی طرح مٹادینے کے متمنی تھے۔ آپ پیدائش سے مسلمان تھے تاہم ہندی کے حسن و جمال پر ریجھے ہوئے تھے۔ "بھاشا" پر آپکے بہت احسانات ہیں۔ تقریباً سترہ تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ سنت کی نظروں میں ہندو مسلمان دونوں برابر تھے۔ صاف گوئی کا یہ کمال تھا کہ ہر کس و ناکس کی کمزوریوں پر بلا پس و پیش اعتراض کر بیٹھتے تھے، اوروں کا تو ذکر ہی کیا آپ سکندر لودی (تاجدارِ دلی) کے دبدبہ و جلال سے بھی مرعوب نہوئے۔ آپکا کلام زیادہ تر ادبیت سے بے رنگ ہوتا ہے ملاحظہ ہو کس ادا سے ہم مذہب مسلمانوں پر چوٹ کرکے انھیں مطعون کیا ہے:۔ ؎

دن بھر روزہ رہت ہو رات ہنت ہو گائے
ایک خون اِک بندگی کیسے کھسی کھدائے

اسی مفہوم کا ایک شعر انشا کے دیوان میں بھی ملتا ہے ع "وہی ذبح بھی کرے وہی لے ثواب اُلٹا" اسی بحر کے ایک ہم قافیہ شعر میں کس مزے کے ساتھ ہندوؤں کے چٹکی لی ہے:۔ ؎

موڑ مڑائے ہری ملیں سب کوئی لیئی مڑائے
بار بار کے موڑتیں بھیڑ نہ بکنٹھ جائے

آپکے صاحبزادے ملا کمال بھی ہندی کے شاعر تھے۔ جب مغلوں نے اپنی حکومت قائم کرکے ملک میں امن و امان کی روح پھونکدی، اور رعایا کی آسودگی و آسایش کے سامان مہیا ہوگئے تو عوام کے ادبی مذاق میں بھی ایک تغیرِ عظیم واقع ہوا۔ ابتک شعرا کے کلام میں مذہبی رنگ کی جو جھلک نمودار تھی وہ حسن و عشق کی رنگینیوں کے آگے پھیکی پڑ چلی۔ ہندی میں "شرنگار" رس کی بنیاد انھیں مسلمان مصنفین کی طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ کُتبن شیخ نے "مرگاوتی" جھنجھن نے "مدھومالتی" عثمان نے "چتراولی" جائسی نے "پدماوت" شیخ نبی نے "گیان دیپکا" نور محمد نے "اندراوتی" اور قاسم شاہ نے "ہنس جواہر" وغیرہ مثنویاں لکھ کر ہندی کے گنجینۂ ادب کو عشقیہ مضامین کے جواہر ریزوں سے مالامال کردیا۔ اس عہد میں "رزم و بزم"

دونوں مسلمانوں ہی کے ہاتھ رہے۔ متذکرہ بالا شعراء میں جائسی کو سب پر فوقیت حاصل تھی۔ آپکی زبان نہایت سلیس اور پیاری ہے۔ طرز بیان کا کہنا ہی کیا۔ جب کبھی واردات قلب کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھول جھڑ رہے ہوں۔ تاثیر کی یہ خوبی ہے کہ حسیات و جذبات کی منہ بولتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ پدماوتی کے حسن وجمال کا چربہ اُتارتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

"کہوں ملار دوئج کے جوتی، 　　　　 وہ! جھی جوتی کہاں جگ اوتی
کا سر دی تے ہی دیوں منکو، 　　　　 چاند کلنکی وہ اکلنکو

اُردو میں بھی اسی مفہوم کا کسی کا شعر ہے ؎

تشبیہ کس سے دوں ترے رخسار صاف کو
خورشید زرد رنگ قمر داغدار ہے۔

اِن صوفی مشرب شعرا نے اودھی زبان کا استعمال اور دوہے چوپائیوں کے ڈھنگ پر طبع آزمائی کرکے شعروسخن کا ایک نیا باب کھولدیا۔ انھیں کے نقش قدم پر چلکر گوسوامی تلسی داس جی نے لافانی شہرت حاصل کی۔ اکبر کے عہد حکومت میں بھی مسلمان ہندی کی ادبی خدمات انجام دینے سے قاصر نہ رہے۔ بادشاہ کے دربار میں علماء کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ خود بادشاہ کو بھی ہندی میں شعر کہنے کا ملکہ تھا۔ یہ سب فیضی، ابوالفضل، تان سین اور رحیم جیسے باکمال ہندی شعراء کا فیضانِ صحبت تھا۔

رحیم کی گوسوامی تلسی داس جی سے خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ آپ فارسی، عربی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں کے بڑے عالم و پنڈت تھے۔ ان سب زبانوں میں آپکی تصانیف موجود ہیں۔ آپکا ہندی کلام بڑا ٹکسالی ہے، انکے "نیتی کے دوہے" گوسوامی جی کے دوہوں کے ہم پلہ ہیں۔ کھڑی اودھی برج وغیرہ زبانوں پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ رحیم کے "بروے نائکا بھید" (बरवै नायका भेद) کو دیکھ کر ہی تلسی داس نے بروے رامائن لکھی تھی۔ رحیم کے "مدناشٹک" "بروے نائکا بھید" اور "نیتی سنگرہ" سے انکے کلام کے چند نمونے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں ؎

کلت للت مالا وا جواہر جڑا تھا 　　　　 چپل چکھن والا چاندنی میں کھڑا تھا
کٹی تٹ نچ میلا پیت سیلا نولا 　　　　 البن البیلا یار مرا اکیلا
بالم اس من مل یو جیسے پے پانی 　　　　 ہنسنی بھئی سوتیا دنی بلگا نی
جو رحیم بھاوی کہت [illegible] ہتی اپنے ہاتھ 　　　　 رام نہ جانتے ہرن سنگ سیتے نہ راون ساتھ

کچھ مسلمان شعراء کرشن کے بھگت بھی ہوئے ہیں۔ ان عقیدتمندوں میں ...

ہے۔ آپکی تصانیف ادبی حلقوں میں بڑا وقار رکھتی ہیں۔ تخیّل کی بلند پروازی، بہترین جذبات کی مصوّری شاعرانہ نازک خیالی اور زبان کی پاکیزگی وغیرہ جمیع صفات سے آپکا کلام متصف ہے۔ آپ نے برج بھاشا کے دیگر شعراء کی مانند عام بول چال کے الفاظ کی تراش خراش اور لایعنی تصنّع کو روا نہ رکھا۔ بلکہ نہایت صریح و عام فہم روزمرّہ کے محاوروں سے اپنی لفظوں کو حسین بنایا ہے۔ رس کھان کے سوّ سے فی الواقع "رس" کی "کھان" ہوتے ہیں۔ اور ہندی ادب کی خاص چیز سمجھے جاتے ہیں۔ مئے محبت کے پُرکیف جام سے سرشار ہوکر "گوپیوں" کے "شیام" کی مدح سرائی میں وہ دُرافشانی کی ہے کہ پڑھنے والا وجد میں آجاتا ہے:- ؎

شیش مہیش سُریش گنیش دنیشہو جاہی نرنتو دھیاویں
جاہی اناولی اننت، اکھنڈ، اچھید، ابھید، سووید بتاویں
ناردسے شک ویاس رٹیں پچی ہارے تو وُپنی پار نہ پاویں
تاہی اہیر کی چھوہریاں چھچھیا بھرچھاچھ پہ ناچ نچاویں
یا لکٹی اروکامریا پر، راج تھوپُر کو بجی ڈار دَوں ،
آٹھو سِدھ نو وَ ندھی کو سکھ نند کی گائے چرائے بساروں
نینن سوں رس کھان جبے برج کے بن واگ تڑاگ نہاروں
کوتن ہو کل دَھوت کے دھام کریل کے کُنجن اوپر واروں

عالم کا شمار بھی بلند پایہ شعراء میں کیا جاتا ہے۔ عشق کی عالم آشوبیوں اور حسن کی جلوہ آرائیوں کا بیان جس حُسن وخوبی کے ساتھ حضرتِ عالم کر گئے ہیں اسکا جواب ملنا مشکل ہے۔ آپکے ہر ہر لفظ سے "پریم" کی "پیر" ٹپکی پڑتی ہے:- ؎
درد الفت

جا تھل کینہین بہار انیکن تا تھل کانکری بیٹھی چنیو کریں
جا رسنا تین کریں رس باتن، تا رسنا سوں چرتر گنیو کریں

۱۶۶۰ء کے قریب قصبہ بیانی ضلع ہردوئی میں "بھاشا بھوشن" قادر نامی گذرے ہیں۔ آپکے ایک مشہور کبت کا مصرعہ ہے، ؏ گُن نہ چیرانو گن گاہک چیرانو ہے۔
آپ جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے،

آگرے کے شہرۂ آفاق ادیب طاہر نے ۱۶۷۰ء میں "گُن ساگر" اور "ٹھکر سار" نامی دو کتابیں شائع کر کے ہندی لٹریچر میں گراں بہا اضافہ کیا۔ آپنے "چوٹی" "کنگھی" کے مضامین اس "چوٹی" تک

پہنچا دیئے ہیں جسکے آگے تخیل کا بھی گذر نہیں ہوتا۔ مبارک نے بھی "تل شتک" اور "الک شتک" دو قابل قدر تصنیفیں یادگار چھوڑی ہیں۔ کچھ مختلف اشعار بھی آپکے "اسم مبارک" سے منسوب ہیں ؎

سب جگت پیرت تمن کون ٹھکیو جیت یہ ہیری
تو کپول کو ایک تل سب جگ ڈار یو پیسری

'رس لین' (ہندی کے مشہور مسلمان شاعر) کے کمال فن کا اندازہ صرف اس ایک بات ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ آپکے ؎

امی ہلاہل رس بھرے شویت شیام رتنار
جیت مرت جھکی جھکی پرت جیہیں چتوت اکبار

وغیرہ دوہے اب بھی بہاری کے بتائے جاتے ہیں۔

۱۷۳۵ء میں نظیر اکبر آبادی ہوئے۔ آپ کا وجود اردو اور ہندی دونوں کے لئے مشترکہ طور پر مایۂ ناز ہے۔ حالانکہ اردو داں اصحاب کا ایک ایسا بھی گروہ ہے جو آپکی شاعری کا قائل ہی نہیں لیکن ایسے لوگوں کا بھی نقدان نہیں ہے۔ جنھیں "کرشن مُرلارے" کے ساتھ دلی عقیدت ہے۔ ؎

جب مرلی دھرنے مرلی کو اپنے ادھر دھری   کیا کیا پریم پیت بھری اسمیں دھن بھری

زمانۂ حال کے مسلمان شعراء میں امیر علی میر، کود ظہور بخش، للت کمار سنگھ نٹور وغیرہ نے اچھی شہرت حاصل کی ہے۔ میر صاحب کا کلام "رسک متر" میں ناظرین کی نظروں سے گذرا ہوگا۔ نٹور کے افکار گہر بار سے ہندی رسائل و جرائد بڑے فخر کے ساتھ اپنے صفحات مزین کرتے ہیں۔

آخر میں ہم زمانہ کی قیود کو بالائے طاق رکھ کر سید انشاء اللہ انشا کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ اردو کے معروف شاعر ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ریختہ کے کلام کے علاوہ بھی دیگر چھ زبانوں میں شعر کہے ہیں حالانکہ ہندی میں آپکی کوئی تصنیف کبھی مطبوع نہیں ہوئی۔ تاہم ہندی آپکی شرمندۂ احسان ہے۔ انشا نے پچاس صفحات کی ایک کہانی لکھی ہے۔ یہ کہانی بھی اردو کا سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔ مگر خود انھیں کی زبان مبارک سے سنئے کہ کیا فرماتے ہیں:-

"اب یہاں سے کہنے والا یوں کہتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی کہ کوئی ایسی کہانی کہئے جسمیں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے۔ تب میرا جی پھول کر کلی کے روپ کھلے۔ اپنے ملنے والوں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے سر ہلا کر گلا پھلا کر لال لال آنکھیں پتھرا کر کہنے لگے یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے کہا میں کچھ ایسا بڑبولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں،

سے نہو سکتا۔ تو بھلا منھ سے کیوں نکالتا۔

گھوڑے پہ اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں … کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں

اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی … کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں"

انشا کی انشا پردازی کے جوہر دیکھئے اور دور حاضرہ کی اُردو کے چند نمونے سامنے رکھ کر خود فیصلہ کیجئے کہ یہ کہانی اُردو زبان میں لکھی گئی ہے یا ہندی میں؟

دھمپد پاکٹ سائز۔ حجم ۳۱۴ صفحات۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ۔ لالہ منبی دھر چاول والے کھاری باؤلی۔ دلّی۔

دھمپد بدھ مذہب کی ایک نہایت قدیم کتاب ہے۔ جس میں مہاتما بُدھ کے اُپدیش اور اقوال درج ہیں۔ لائق مرتب نے اس کتاب میں دھمپد اور بودھ دھرم کی بعض دوسری کتابوں سے مدد لیکر اصل کتاب پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے اخلاقی معلّمین و مبلغین مثلاً بھرتری، سعدی، کنفیوشس، کبیر وغیرہ کے اقوال بھی جابجا دیئے ہیں۔ دھرم۔ ادھرم۔ گیان۔ ویراگ وغیرہ کی تشریح و توضیح دلچسپ انداز میں کی گئی ہے۔ آخر میں مہاتما بودھ کے چار سو سے زائد اقوال جمع کئے ہیں۔ غرض اخلاق کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے مطالعہ سے ہر اہل دل بقدر حوصلہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ لائبریریاں اور مختلف انجمنیں صرف ۳ر محصول ڈاک بھیجکر اس کتاب کو مفت منگا سکتی ہیں۔

رسید کتب

النجمۃ السائرہ مترجمہ سید سبط حسن صاحب۔ مطبوعہ الواعظ پریس۔ نخاس جدید لکھنؤ۔ قیمت ۱۰ر

نغمہ اور اسلام - از حضرت میکش۔ میوہ کٹرہ۔ آگرہ۔ قیمت ۱۲ر

رباعیات سرمد - پاکٹ سائز مجلد قیمت ۴ر } مرغوب ایجنسی

رباعیات عمر خیام پاکٹ سائز مجلد قیمت ۴ر } لاہور

چمنستان شعراء - از رائے لچھمی نرائن اورنگ آبادی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

فلسفہ قواعد اور وضع اصطلاحات

(از مسٹر سلیم جعفر)

دنیا میں انسان سے جتنے فعل سرزد ہوتے ہیں قانون علت و معلول کے تحت واقع ہوتے ہیں علت کے تحت میں تمام وہ فعل و عمل آتے ہیں جنکے ذریعہ پذیر ہونے سے ایک خاص نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو مقصود فاعل و عامل ہوتا ہے اور معلول غایت فعل و عمل کی تشکیل ہے معلول سے لوگ اکثر پہلے دوچار ہوتے ہیں لیکن علت تک نظر پہنچنے کا دار و مدار نقطہ نظر پر ہے۔ اگر معلول کی ہستی کو مفاد و مضار کی عینک سے دیکھا جائیگا تو یقیناً اسکو ایک شئے موجود تسلیم کرکے اس سے بحث کی جائیگی لیکن خیال اگر کسی وجہ سے اس طرف گیا کہ شئے موجود کیونکر عرصہ وجود میں آئی تو اُن اعمال و افعال کی جستجو ہوگی جن کا وہ نتیجہ ہے۔ ان دونوں نقطہائے نظر کے درمیان معلول ایک ایسی منزل ہے جیسے کہ ماضی و استقبال کے درمیان حال یعنی ایک صورت میں وہ سلسلے کی آخری کڑی ہے اور دوسری میں ابتدائی یا یوں کہئے کہ ایک صورت میں وہ موضوع بحث کی غایت ہے اور دوسری میں خود موضوع بحث اور اسکے مضار و مفاد غایت بحث۔ جو اسباب و علل کی جستجو کرتا ہے اسکے میدان عمل سے مفاد و مضار معلول خارج ہوتے ہیں اور جو متجسس مفاد و مضار رہے اسے اسباب و علل سے بحث نہیں ہوتی۔ اسباب و علل معلول مفاد و مضار معلول سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لئے جن اصول و قوانین سے اسباب و علل کا متلاشی بحث کریگا ان سے مفاد و مضار سے تعلق رکھنے والا بحث نہیں کرسکتا۔ کسی علم کی جن کتابوں میں علت معلول سے بحث کی جاتی ہے وہ علمی یا نظری اور داخل فلسفہ ہیں اور جن میں محض معلول کے مفاد و مضار کا بیان ہوتا ہے وہ عملی یا معلوماتی۔

ادبیات کے بہت سے شعبے ہیں جنمیں سے ایک کا نام قواعد ہے جسکو انگریزی میں گرامر اور سنسکرت میں ویاکرن کہتے ہیں۔ اسکے دو حصے ہیں ایک عملی یا معلوماتی اور دوسرا علمی یا نظری۔ پہلے کا یہ کام ہے کہ زبان کا صحیح صحیح بولنا سکھائے اور یہ بتائے کہ کونسا لفظ کس معنی میں اور کس غرض کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اسکی کیا شکل ہوتی ہے۔ اظہار مدعا کے لئے ترتیب الفاظ کیا ہونی چاہئے۔ یہ لفظوں کو ایک شئے موجود مانکر ان سے بحث

کرتا ہے۔ وہ اس سے غرض نہیں رکھتا کہ کون کون سی ضرورتوں اور خواہشوں نے اعمال دماغی کو مصروف کار رکھا۔ وہ بتائیگا کہ فلاں مصدر سے ماضی اس طرح بنتی ہے۔ فلاں لفظ کی یہ پہچان ہے لیکن اسے اس سے غرض نہیں کہ جس زبان کے لفظوں سے بحث کی جارہی ہے اسکے بولنے والوں کا زمانۂ گزشتہ میں وقوع فعل ظاہر کرنے کا عام طریقہ کیا تھا۔ وہ ہر مصدر کو ایک شئے موجود مانے گا اور پھر اسکی اور دوسری شئے موجود (ماضی وغیرہ) کی شکل میں جو فرق ہے بتائیگا اور یہ بھی کہے گا کہ کہاں کیا گھٹ اور کیا بڑھ گیا تاکہ شناخت میں وقت نہو مگر وہ ہر صورت میں جوکچھ موجود ہے صرف اسی سے بحث کریگا۔ وہ کبھی نہ کہے گا کہ فلاں غرض و غایت کے لئے زبان کے بولنے والوں کا فلاں طرز عمل رہا ہے اور ان کا یہ طرز عمل وسیع الاستعمال ہے کیونکہ یہ نتیجہ ہے فلاں عمل دماغی کا یعنی وہ اپنے مضمون کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ اس سے کیا کیا فائدے ہیں اسکی روش علمی ہے اور اگر کہیں کوئی بات ایسی بیان کرتا ہے جو اسے علمی حدود سے نکال کر علمی قلمرو میں داخل کردیتی ہے۔ تو وہاں بھی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ طالب علم زبان لفظ مروج کی غلط ہئیت استعمال نہ کرے۔ اس لئے کسی زبان کی اس قسم کی کتابیں علمی حصہ قواعد سے تعلق رکھتی ہیں۔

علمی یا نظری حصے کے موضوع بحث تمام وہ اعمال ہیں جو ہمیشہ خاص خاص حالتیں اور صورتیں پیش آنے پر دماغ سے صادر ہوتے ہیں اور جنکا نتیجہ ہمیشہ یکساں ہوتا ہے۔ اس شعبے کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تیار مصالح پر نظر ڈالتا اور یہ دیکھتا ہے کہ طرح طرح کی چیزیں جو اس کی حد نظر میں پھیلی پڑی ہیں انھیں کون کون سے اسباب عرصہ وجود میں لائے۔ دماغ نے کون کون سی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے کیا کیا طریقے اختیار کئے۔ وہ ہمیشہ اپنا دامن اسکے بیان سے بچاتا ہے کہ عادات مستمرہ کے جو نتیجے ہیں انکے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے کبھی اس کا ذکر نہ آنے دیگا کہ فلاں لفظ فلاں محل وقوع پر بولا جاتا ہے۔ اسکے پیش نظر ہر وقت ان اعمال دماغ کی جستجو رہے گی جن کو عرف عام میں بنیادی و اساسی اصول کہتے ہیں۔

اس شعبے سے فقط وہ کتابیں تعلق رکھتی ہیں جو (مثلاً اردو میں) یہ نہیں بتاتیں کہ نا علامت مصدر ہے بلکہ وہ کتابیں جو کہتی ہیں کہ آریائی قوموں میں سے فلاں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ وقوع فعل بلا قید زمان ظاہر کرنا چاہتی تھی تو اس قسم کے لفظ (مادہ) پر ایک اور جزو (نا) بڑھاتی تھی۔ اگر وقوع فعل کا تعلق اپنی ذات کے سوا کسی اور سے ہوتا تھا تو موسیقیت و ترنم کو مدنظر رکھ کر کبھی آنا کبھی لانا کبھی وانا اور کبھی پانا کے اضافے سے کام لیتی تھی اسی پر قناعت نہ تھی بعض بعض دفعہ لفظوں کو ملا کر انکی ایسی ہڈیاں پسلیاں توڑتی مروڑتی تھی کہ عیاذاً باللہ سطحی نظر دیکھ بھی نہیں سکتی کہ کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ ایک مصدر مرکب بنایا اور اسے توڑ مروڑ ڈالا ہندیا

له Persian - English Dictionary by Dr. F. Stiengass Page - 1110. and 1111.

اُردو کی سگی بہن اور ارث مشترکہ میں شریک سہیم ہے اس لئے اُردو میں بھی اکثر اس کی مثالیں ملتی ہیں بالخصوص جہاں ایسے لفظوں سے مصدر بنائے گئے ہیں جنکو شبد ساگر अनुकरण शब्द سے موسوم کرتا ہے یعنی وہ لفظ جو آوازوں یا حرکتوں کی نقل ہیں مثلاً پکنا ٹپکنا چٹکنا۔ جھلکنا وغیرہ۔ ان میں سنسکرت کا करण کنا بنکر جلوہ گر ہے۔ کہیں کہیں یہ करण کرانا بھی بن گیا ہے مثلاً مسکرانا (कृ + स्मय) چونکہ ہندی میں بتقلید سنسکرت کاف ماقبل مفتوح (अक) لگاکر اسم بنائے جاتے ہیں اس لئے دھوکا ہوتا ہے کہ پہلے مادّے سے اسم اور پھر اس پر نا بڑھا کر مصدر بنالیا۔ آریائی زبانوں میں اسم سے بھی مصدر بنائے گئے ہیں اور یہ خیال معقولیت سے معرا نہیں لیکن اسموں سے مصدر بنانیکا دستور اس قدر نامقبول و نامطبوع یا قلیل الاستعمال تھا کہ سنسکرت جو ہندی یورپی خاندان میں اپنی سب بہنوں سے عمر میں بڑی ہے، دو ہزار مادّوں میں سے پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں پیش کر سکتی۔ برخلاف اسکے ایسے مصدروں کی کمی نہیں جو [illegible] اور कृ لگاکر بنائے گئے ہیں۔ پھر سب سے زیادہ قابل غور یہ بات ہے کہ مادّوں میں جو لاحقے سنسکرت لگاتی ہے انکی دو قسمیں مقرر کی گئی ہیں۔ پہلی قسم کے لاحقے کرِت (कृत) کہلاتے ہیں جو سالم مادہ میں یا اسمیں کچھ ردوبدل کرکے لگائے جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے لاحقوں کا نام تدہِت (तद्धित) ہے یہ وہ لاحقے ہیں جو اسموں پر بڑھائے جاتے ہیں یعنی سب سے پہلے مادّے میں قسم اول کے لاحقے لگاکر اسم بنالیا جاتا ہے اور اس اسم کے معنی میں ترمیم و توسیع کی غرض سے ایک لاحقہ اور لگایا جاتا ہے۔ क یا अक (کاف ماقبل مفتوح) اور अन (جس سے نا نکلا ہے) تینوں قسم اول کے لاحقے ہیں سنسکرت انکا اجتماع روا نہیں رکھتی۔ اس لئے یہ کہنا کہ ٹپ سے پہلے ٹپک بنا اور پھر ٹپکنا کم سے کم اُردو کے باب میں ضرور نامناسب ہے جسکی ماں یعنی پراکرت سنسکرت کی بیٹی نہ سہی تو بہن ہے۔ مختصر یہ کہ دستور زبان اس نظریے کی تائید کرتا ہے جو سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔

ان کتابوں میں سے جن کو بہ لحاظ مبحث فلسفہ میں داخل کرنا چاہئے ایک کتاب "وضع اصطلاحات" ہے۔ مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم نے یہ کتاب اس غرض سے لکھی ہے کہ مغربی علوم کا ترجمہ بآسانی کیا جاسکے جو آجکل اُردو میں بہ کثرت منتقل کئے جارہے ہیں جنکی اصطلاحوں کے لئے مترجم لفظ ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور نہیں ملتے اور جنکو قبائے اُردو پہنانے کے لئے بہت زور لگایا جائے تو عربی سے بھیک مانگنی پڑتی ہے اور وہ بھی اکثر یہ کہکر سوال رد کردیتی ہے "آپ ہی میاں منگتے باہر کھڑے درویش"۔ مرحوم کے حوصلۂ عالی نے کوشش کی کہ جو وسائل اسوقت زبان میں موجود ہیں انھیں سے کام لیں۔ انکی حد نظر میں قلعۂ معلیٰ سے لیکر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک کا ذرا سا میدان یا چوک اور امین آباد کی تنگناؤں کے مٹھی بھر رقبے ہی شامل نہ تھے بلکہ انکے شہباز فکر کی فضائے پرواز ہمالیہ کی بلندیاں اور سمندروں کی وسعتیں اپنے دامن میں لئے ہوئے تھی۔ انھوں نے اقصائے مغرب و مشرق پر نظر ڈالی جہاں جہاں آپ ملتی

قومیں آباد تھیں انکی عادتوں کا گہرا مطالعہ کیا اور جو جو باتیں انھیں اس خاندان کی خصوصیات نظر آئیں انھیں لکھا کر دیا۔ وہ شاہ راہیں دکھا دیں جن پر گامزن ہوکر منزل مقصود تک پہنچ جانا ممکن ہے لیکن دیکھئے آپ کہیں دھوکا نہ کھا جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ وہ رہبری کرکے آپکی قوت امتیازی سلب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ انصاف کا خون ہوگا۔ اُنھوں نے تمام وہ مسالہ اکٹھا کر دیا جس سے ایوان زبان کے کنگرے اتنے بلند کیے جاسکتے ہیں کہ انھیں فلک بوس کہنا داخل مبالغہ نہو۔ اب اس مواد[1] مسالہ سے اسطرح کام لینا کہ بھونڈے لفظ زبان میں نہ داخل ہونے پائیں آپکا کام ہے نہ کہ مولوی صاحب مرحوم کا۔ انکا فرض تھا کہ زبان جن جن اُصول پر عمل کر چکی ہے انکی طرف اشارہ کر دیں۔ انھیں اس سے غرض نہ تھی کہ اب فصاحت و شستگی کیا فتویٰ دے رہی ہے۔ مثلاً وہ اس سے بیخبر نہیں ہوسکتے کہ اب لاچار کی جگہ ناچار آتا ہے اور لاپتا اور لاپروا گنوار بولتے ہیں تاہم اس اُصول کو نظرانداز کر سکتے تھے جس نے کسی زمانے میں لاچار اور لاسخن بنائے تھے۔ لاچار آج غیر فصیح ہے تو ہوا کرے مگر کیا فارسی اس اُصول سے کام نہیں لیچکی کیا اُردو فارسی سے ہمیشہ بے تکلف مرکبات ناقص (PHRASES) اور لفظ نہیں لیتی رہی۔ کیا لا حرف نفی نہیں۔ کیا عربی، فارسی اور سنسکرت میں الفاظ کے شروع میں حرفِ نفی لاکر نفیٔ اثبات نہیں کرتے۔ کیا وہ زبانیں جو بے مایہ ہیں مثلاً انگریزی اپنا افلاس دور کرنے کے لئے پیش و پس گدائی نہیں کرتیں۔ انگریزی کی کتب لغات اُٹھاکر دیکھئے سینکڑوں لفظ ملیں گے جنکے مادے کسی زبان کے ہیں اور لاحقے اور سابقے کسی زبان کے۔ ایک معمولی سے لفظ (DENTIST) (دندان ساز) ہی کو لیجئے۔ مادہ لاطینی سے لیا گیا ہے اور لاحقہ یونانی کا لگا ہوا ہے EN-DEAR پر غور کیجئے سابقہ لاطینی یا فرانسیسی کا ہے مگر مادہ ان دونوں میں سے کسی سے واسطہ نہیں رکھتا۔ زبان کے کسی اُصول سے چشم پوشی انکے دائرۂ اہتمام والتزام سے خارج تھی اس لئے اُنھوں نے بیخوف لومۃ لائم اسکا بیان کیا۔ اسیطرح فارسی میں اسم سے مصدر بنانیکی رسم تھی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ تفس (तप +यस) سے تفسیدن مشت (मुष्ट) سے مشتن[1] وار (वारि = پانی) سے باریدن (و = ب) اور دند (दन्त) کو دندیدن[2] بنائے جارہے ہیں۔ اسکی طرف بھی توجہ دلائی

مختصر یہ کہ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم ترقی زبان کا ایک بڑا سامان اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ خواہ انکے شعر انکے مضمون، انکے ادبی مشغلے گلدستۂ طاق نسیاں بنجائیں لیکن یہ تصنیف آیندہ نسلوں کے دلوں میں انکی یاد تازہ رکھیگی کیونکہ یہ وہ منتر ہے جسے پڑھکر ہندوستانی طلسم خانۂ مغرب کے دروازے اپنے ہموطنوں کے داخلے کیواسطے کھولدینگے اور وہ ترقی کے اس اوج پر پہنچ جائینگے جس پر پہنچکر انسان انسانیت کا مدعی ہوسکتا ہے۔

---

1. To rub- P.1244 - Persian English Dictionary by Dr. Stiengass.

2. To boil with rage- P.538- ibid.

فلسفۂ حیات کے متضاد نظریے

(از میر ولی اللہ صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایبٹ آباد)

آسکر وائلڈ نے ایک فسانہ لکھا ہے، جس کا عنوان "دی پکچر آف ڈورین گرے" ہے۔

ڈورین گرے ایک متمول نوجوان ہے جو خوبصورت، خوش اخلاق ہے اور کم سخن ہے، ایک مصور اس کا دوست ہے جو اس سے بیحد محبت کرتا ہے اور اسکی شبیہہ اُتارنے میں مصروف ہے۔ انکی محبت عشق کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ مصور کا عشق پاک اور خاموش ہے۔ وہ اس نوجوان کو اپنے تکمیل فن کا ذریعہ بنالیتا ہے۔ چنانچہ اس کا موقلم اور جتنے رنگ اسکے سامنے ہیں وہ صرف حسن وعشق کے طلسمات اور جذبات کے اظہار کے لئے وقف ہوجاتے ہیں۔

تصویر ابھی بن ہی رہی تھی کہ مصور کی تحریک سے اسکے ایک اور دوست لارڈ ہنری کا اس نوجوان سے تعارف ہوگیا۔ لارڈ ہنری کی گفتگو بہت دلاویز ہوتی تھی اور اسکے خیالات اور نظریئے اپنے اندر عجیب ایک مسلسل تضاد رکھتے تھے جسکی بدولت اسکی گفتگو دلفریب ہوجاتی تھی۔ لارڈ ہنری کا فلسفۂ حیات تمام دنیا سے نرالا تھا، اسکے خیالات کیا تھے؟ شکر آمیز زہریلا بل کی گولیاں تھیں جنھیں وہ لوگ جو حقائق حیات سے ناواقف ہیں شکر کے دھوکے آسانی سے کھا جائیں، چنانچہ چند ہی روز کے بعد مصور کا نوجوان دوست بھی لارڈ ہنری کی گولیوں کو مفرح القلوب سمجھکر بلاتکلف نوش جان کرنے لگا۔ مصور جہاندیدہ اور گرم وسرد زمانہ چشیدہ آدمی تھا۔ اس نے لارڈ ہنری کو بھی منع کیا اور ڈورین گرے کو بھی نرمی کے ساتھ سمجھایا کہ ان غلط نظریوں کے دھوکے میں نہ آئے مگر اسکی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

لارڈ ہنری کے غلط فلسفہ نے رفتہ رفتہ اس نوجوان کی تمام بہترین صفات کو اسکے صفحۂ دل سے حرف غلط کی طرح مٹادیا جسکے بعد طرح طرح کے خیالات فاسد نے اسکے دل میں جگہ کرلی اور وہ کچھ سے کچھ ہوگیا،

The Picture of Dorian Gray, Oscar Wilds. ؎

بالآخر یہ نوجوان ایک ایکٹریس پر عاشق ہوگیا مگر چند ہی روز میں اس نے اُس سے سفاکانہ بے وفائی کرکے قطع تعلق کر لیا جسکے سبب سے اُس بیچاری نے خودکشی کر لی۔ اس سانحہ سے نوجوان کے دل میں غم و ہمدردی کے جذبات بیدار ہوئے، لیکن ہنری کے فلسفہ نے جلد ہی ان کے جوش و خروش کو سرد کر دیا۔

ڈورین گرے کا ضمیر روز بروز کمزور ہوتا گیا۔ کئی مردوں اور کئی عورتوں کی زندگی کو اس نے تلخ اور برباد کر دیا حتیٰ کہ اپنے قدیم دوست مصور کے خون سے بھی اپنے ہاتھ رنگ لئے۔ ہنری کے وساوس کا اسکے دماغ پر اسقدر بعد اثر ہوگیا کہ وہ ایک قسم کے جنون میں مبتلا ہوگیا اور خود اپنی تصویر میں جو اُسکے دوست مصور نے بنا کر دی تھی، اپنی سیہ کاریوں کا عکس نظر آنے لگا۔ جیسے جیسے اُسکی روح گناہ کی ظلمتوں سے تاریک ہوتی گئی اُسکی نگاہ میں تصویر کے خال و خط بھی بدنما ہوتے گئے۔ گویا وہ تصویر اسکی بد اعمالیوں کا آئینہ بن گئی بالآخر اسی جنون میں اُس نے خودکشی کر لی، اور اس طرح ایک انسانی زندگی کا جسے بُری صحبت نے تباہ کر دیا تھا خاتمہ ہوگیا۔

لارڈ ہنری کا فلسفہ جو اس ہولناک انجام کا باعث ہوا یہ تھا:۔

(۱) مشہور ہونا دنیا میں سب سے بُری چیز ہے لیکن اس سے بھی زیادہ بُری چیز شہرت سے محروم رہنا ہے۔

(۲) چہرہ سے علمیت کا اظہار ہوتے ہی خوبصورتی غائب ہوجاتی ہو۔ ذہنی استعداد ایک طرح کی افراط و تفریط ہے جس سے چہرے کی موزونیت تباہ ہوجاتی ہے۔ انہاک ہی سے آدمی کی صورت بگڑنے لگتی ہے، اسکے خط و خال کی خوبیاں غائب ہونے لگتی ہیں۔ چنانچہ کسی علم و فن کے فاضل کو دیکھو اسکی صورت نہایت بھدی و نازیبا ہوگی۔

(۳) بدصورت اور احمق لوگ ہی دنیا میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

(۴) جاہ و جلال اور دولت، ذہن اور علم و فن اور خوبصورتی ان خداداد نعمتوں کے عوض انسان کو بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

(۵) جن لوگوں کو میں پسند کرتا ہوں انکا نام کسی کو بتانا نہیں چاہتا، کیونکہ انکا نام بتا دینے سے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں نے انکا ایک جزو دوسروں کے سپرد کر دیا ہے۔

(۶) ایک نہایت ہی معمولی بات بھی طرب انگیز ہو سکتی ہے، بشرطیکہ اُسے پوشیدہ رکھا جائے۔

(۷) ازدواج میں فریقین کے لئے دھوکے کی زندگی بسر کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

(۸) ضمیر اور بزدلی درحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ بزدلی کا تجارتی نام ضمیر ہے۔

(۹) دوستی شروع کرنے کے لئے بھی قہقہہ کوئی بری چیز نہیں لیکن دوستی ختم کرنیکا بہترین طریقہ بھی قہقہہ ہے۔

(۱۰) برادرانہ تعلقات، معمولی واقفیت اور گہری دوستی کے بین بین ہوتے ہیں۔

(۱۱) خیالات کی قدر و قیمت اُنکے ظاہر کرنے والوں کے خلوص قلب پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ جسقدر خلوص کم ہوگا اسیقدر خیالات زیادہ عالمانہ ہونگے، کیونکہ اس صورت میں ظاہر کردہ خیالات میں قائل کی ضروریات، خواہشات اور عقائد شامل نہ ہونگے۔

(۱۲) شعر کی مقبولیت جذبات پر منحصر ہے۔ ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی طبع ثانی سے محروم نہیں رہتی۔

(۱۳) میں نے اپنا دل ایک ایسے شخص کو دیا ہے جو اُسے اپنے لباس ظاہری کی زینت کے لئے ایک پھول کے بمنزلہ سمجھتا ہے جس سے اپنے پندارِ حسن کی زیبائش بڑھتی ہے۔

(۱۴) ذہنی استعداد خوبصورتی سے زیادہ پائدار ہوتی ہے۔

(۱۵) اگر آپ اپنی زندگی کو افسانہ بنا دینگے تو موت کے بعد آپ کی زندگی کا کوئی افسانہ باقی نہ رہیگا

(۱۶) کوئی شخص کسی شخص پر نیک اثر نہیں ڈال سکتا۔ ایسا اثر علمی نقطۂ خیال سے کسی کے لئے کبھی نیک نہیں ہو سکتا کیونکہ جب ایک شخص دوسرے شخص پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو گویا اسکی روح دوسرے شخص کے جسم میں سرایت کر جاتی ہے اور زیر اثر شخص کے خیالات اسکے ذاتی خیالات نہیں رہتے، نہ اسکے جذبات اسکے اپنے جذبات ہوتے ہیں، اسکی نیکیاں بھی اسکی نیکیاں نہیں رہتیں اور اسکے گناہ بھی (اگر دنیا میں کوئی ایسی چیز موجود ہو جسے گناہ کہہ سکیں) قطعاً مستعار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عامل کے راگ کی صرف ایک صدائے بازگشت بن جاتا ہے وہ ایک ایسے پارٹ کا ایکٹر ہو جاتا ہے جو اسکے لئے نہیں بنایا گیا تھا انسانی زندگی کی علت غائی تو یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو برسر کار لائے اور اسے نشوونما دے۔ ہم کو دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ ہم اپنی انانیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ آجکل لوگ اپنے آپ سے ڈرتے ہیں۔ وہ یہ بات بالکل بھول گئے ہیں کہ انکا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ خود اپنے ذاتی حقوق کو جو اُن پر واجب ہیں ادا کریں۔

(۱۷) انسانی نسل میں نہ تو دلیری باقی ہے اور نہ کبھی موجود تھی۔ ہم پر ہر وقت ایک خوف سا طاری رہتا ہے جو ہمیں کچھ کرنے نہیں دیتا۔ یہ خوف یا تو سوسائٹی کا ہے جو ہمارے تمدنی اخلاق کی بنیاد یا خدا کا خوف ہے جو ہمارے مذہب کا راز ہے۔ یہی دو خوف ہیں جنھوں نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔

(۱۸) جسم جب ایک دفعہ گناہ کرتا ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے کیونکہ عمل ایک پاک کرنے والی قوت ہے۔ گناہ کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا۔ صرف ایک لذت کا خیال یا افسوس البتہ باقی رہجاتا ہے نفسانی خواہشات سے نجات پانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آدمی ان خواہشات کے سامنے گردن تسلیم خم کر دے۔ کسی خواہش کو ایک دفعہ روک کر دیکھو، روح اس شجر ممنوع کی آرزو سے پُر ہو جائیگی اور انسانی خود ساختہ بے معنی قوانین کی ممانعت سے تنگ آجائیگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے واقعات انسانی دماغ میں وقوع پذیر ہوئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ دنیا کے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب بھی انسانی دماغ ہی میں ہوتا ہے۔

(۱۹) حسن ایک قسم کا خداداد کمال فن، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، اسکے عرفان کے لئے کسی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں ہوتی،

(۲۰) جاہ وحشمت اور دولت مندی کا سب سے بڑا فن بیکاری ہے۔

(۲۱) ہر نفیس چیز کے پس پردہ ایک ہولناک مصیبت ہوتی ہے۔

(۲۲) دوبارہ جوان بننے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی گزشتہ غلطیوں کا اعادہ کرے۔

(۲۳) آجکل لوگ عوام کی پیروی کرنے میں تباہ ہو رہے ہیں۔ جب وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف انسانی غلطی ہی وہ چیز ہے جس پر انسان کبھی پشیمان نہیں ہوتا۔

(۲۴) حسن کی تلاش زندگی کا اصلی راز ہے۔

(۲۵) جذبات عالیہ بیکار لوگوں کی جاگیر ہیں،

(۲۶) عاشق ابتدا میں اپنے آپ کو اور آخر میں دوسروں کو دھوکا دیتا ہے۔

(۲۷) اکثر لوگ زندگی کی نثر پر فضول روپیہ خرچ کرکے مفلس ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی نظم کے لئے تباہ ہوں تو بیشک فخر کی بات ہے۔

(۲۸) زمانے کی رہبری اُصول نہیں بلکہ شخصیتیں کرتی ہیں

(۲۹) صاحبان فن کی زندگی صرف فن کے اندر ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ لوگ اپنے فن سے علیحدہ بطور خود کچھ دلچسپ نہیں ہوتے۔ کامل شاعر کی زندگی قطعاً غیر شاعرانہ ہوتی ہے۔

(۳۰) روح وجسم، جسم و روح ایک معمہ ہے، نہ روح حیوانیت سے خالی ہے، نہ جسم روحانیت سے۔ حواس ترقی کرکے لطیف ہو سکتے ہیں اور عقل تنزل پذیر ہو کر کثیف بن سکتی ہے۔

(۳۱) ہم اپنے آپکو سمجھنے میں ہمیشہ اور دوسروں کے سمجھنے میں کبھی کبھی غلطی کر جاتے ہیں۔

(۳۲) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت ہم بہ خیال خویش دوسروں پر تجربہ کرتے ہیں تو حقیقت میں ہم خود ہی تختۂ مشق بن جاتے ہیں۔

(۳۳) محبّت کرنا اپنی حد سے گذر جانا ہے۔

(۳۴) میں کبھی کسی چیز کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا۔ ایسا کرنا محض حماقت ہے۔ ہم دنیا میں اسلئے نہیں بھیجے گئے کہ لوگوں کو اپنے اخلاقی اصول کی پابندی کرنے پر مجبور کریں۔ میں اس بات کی بھی پروا نہیں کرتا کہ عوام کیا کہتے اور خواص کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو میں پسند کرتا ہوں تو وہ اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے جو طریقہ بھی اختیار کرے۔ مجھے پسند خاطر ہوتا ہے۔

(۳۵) شادی کرنے میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس سے آدمی خود غرض نہیں رہتا اور جو شخص خود غرض نہ ہو وہ بالکل دلچسپ نہیں ہوتا ہو۔ وہ اپنی شخصیت ہی سے محروم ہوجاتا ہے۔

(۳۶) صرف وہی زندگی تباہ کہلا سکتی ہے جسکی اصلی کیفیت کی نشو و نما رُک جائے۔ اگر آپ کسی کی زندگی تباہ کرنا چاہیں تو اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

(۳۷) اپنی اصلیت کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کا نام نیکی ہے۔

(۳۰) میرا خیال ہے کہ ایک مہذب انسان کے لئے اپنے زمانہ کے معیار کو قبول کرلینا حد درجہ کی بداخلاقی ہے۔

(۳۹) خوبصورت گناہ خوبصورت چیزوں کی طرح اُمراء کے لئے مخصوص ہیں۔

(۴۰) عورتیں ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتی ہیں جو انسان دیوتاؤں کے ساتھ کرتے ہیں، وہ ہماری پرستش کرتی ہیں اور ہر وقت کسی نہ کسی چیز کے لئے ہمکو تنگ کرتی رہتی ہیں۔

(۴۱) فن عشق باقی تمام فنوں سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔

(۴۲) صرف دو قسم کے آدمی دلچسپ ہوسکتے ہیں ایک وہ جو سب کچھ جانتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کچھ بھی نہیں جانتے۔

(۴۳) جن آدمیوں سے ہم نے محبت کرنا ترک کردی ہو ان کے جذبات ہمیشہ مضحکہ انگیز ہوتے ہیں۔

(۴۴) عورتیں مردوں کی بہ نسبت غم برداشت کرنے کی زیادہ اہل ہیں۔

(۴۵) اس زمانے میں صرف وہی چیزیں ہمارے لئے ضروری رہ گئی ہیں جو محض غیر ضروری ہیں۔

(۴۶) نیک ارادے ہمیشہ بعد از وقت ظاہر ہوتے ہیں۔

(۴۷) نیک ارادے قوانین قدرت کو بدلنے کی بے فائدہ کوششیں ہیں۔ ایسے ارادوں کی ابتدا

پند ار محض اور ان کی انتہا صفر مطلق ہے
(۴۸) تفصیلات ہمیشہ نفاست سے عاری ہوتی ہیں۔
(۴۹) زمانۂ ماضی کی سب سے بڑی دلکشی یہی ہے کہ وہ گزر چکا ہے۔
(۵۰) ہم جس واقعہ کا کبھی ذکر نہ کریں وہ کبھی واقع ہی نہیں ہوا۔
(۵۱) جس شخص کو اپنے آپ پر اختیار ہو وہ غم کو اتنی ہی آسانی سے محو کر سکتا ہے جتنی آسانی سے وہ ایک مسرت کو پیدا کر سکتا ہے۔ میں اپنے جذبات کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننا چاہتا میں ان سے عشرت اندوز ہونا چاہتا ہوں۔
(۵۲) اہل فن کے تخلیقی جذبات اسکی مخلوق میں کبھی نمایاں نہیں ہوتے۔ رنگ اور صورت صرف رنگ اور صورت ہی کے ترجمان ہو سکتے ہیں، اور بس میرے خیال میں اہل فن کا فن اسکی حقیقت کو اتنا ظاہر نہیں کرتا جتنا پوشیدہ کرتا ہے۔
(۵۳) پرستش اور عبادت کو کبھی الفاظ کا جامہ نہیں پہنانا چاہئے۔
(۵۴) عیش و عشرت کی طرح ہر مسرت کے پردے میں بھی ایک ظلم پنہاں ہوتا ہے۔
(۵۵) انسانی خیال جب اپنی دوربین آنکھوں سے گزری ہوئی نسلوں کو تاریخ کے میدان میں چلتا پھرتا دیکھتا ہے تو افسوس کرتا ہے کہ ابن آدم کتنی قربانیاں کر چکا ہے۔ انمیں سے بعض تو بالکل بیفائدہ تھیں بعض کو دیدہ ودانستہ مجنونانہ نفس کشی کہنا چاہئے۔ درحقیقت یہ تمام قربانیاں خوف پر مبنی تھیں۔ انسان کا اپنی خودی کو مٹا دینا ان تمام مفروضہ ذلتوں سے زیادہ ذلیل تھا، جن سے وہ اپنے زعم باطل میں بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔
(۵۶) گناہ وہ چیز ہے جو ارتکاب کے وقت گنہگار کے چہرہ پر مرئی حروف میں لکھی جاتی ہے
(۵۷) جس بدبخت انسان کے اندر کوئی بدی ہوتی ہے وہ اس کے چہرہ کے نقوش سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسکی آنکھوں سے نظر آجاتی ہے اور اسکے ہاتھوں کی ساخت سے بھی واضح ہو جاتی ہے
(۵۸) جوانی میں بلا وجہ ہنسی آتی ہے اور یہی سب سے بڑی خوبی و دلاویزی ہے۔
(۵۹) مرد ہر عورت کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسکے ساتھ محبت نہ کرے۔
(۶۰) میں مردوں میں ان لوگوں کو پسند کرتا ہوں جن کے سامنے شاندار مستقبل ہو اور عورتیں مجھے وہ پسند ہیں جو شاندار ماضی رکھتی ہوں۔
(۶۱) میں ان عورتوں سے تنگ رہتا ہوں جو مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ دلچسپ

وہ عورتیں ہوتی ہیں جو نفرت کرتی ہیں، ایسی عورتیں زیادہ خوبصورت بھی معلوم ہوتی ہیں

(۶۲) افسوس کی بات ہے کہ آدمی کو ایک غلطی کی پاداش میں کئی دفعہ سزا بھگتنی پڑتی ہے اور بار بار کفارہ دینا پڑتا ہے۔ آدمی کے ساتھ قدرت کا حساب کتاب کبھی بند نہیں ہوتا۔

(۶۳) اچھا ہونے سے خوبصورت ہونا بہتر ہے اور بد صورت ہونے سے اچھا ہونا قابل ترجیح ہے

(۶۴) فن کیا ہے؟ ایک عارضہ، عشق کیا ہے؟ ایک طلسم، مذہب کیا ہے؟ اعتقاد کا مہذب نام

(۶۵) متوسط قابلیت کے لوگ ہمیشہ ہر دلعزیز ہوتے ہیں

(۶۶) بد اعتقادی بہت لطف انگیز ہوتی ہے۔ دھندلکے میں ہر چیز بھلی معلوم ہوتی ہے۔

(۶۷) حصول تہذیب کے صرف دو طریقے ہیں۔ ایک علم و فضل اور دوسرا بدکاری۔ قصبات کے لوگ ان دونوں چیزوں سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ غیر مہذب رہتے ہیں۔

تاریخ اخلاق یورپ (جلد اول)

از مولانا عبد الماجد بی۔اے۔ حجم ۳۹۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سے؍
ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد (دکن)

انگریزی کے مشہور عالم مصنف ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی کتاب "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ملخص ترجمہ ہے۔ اس جلد میں تین باب ہیں (۱) اخلاق کی طبیعی تاریخ (۲) اخلاق قبل مسیح (۳) روما کا قبول مسیحیت۔ ان ابواب کے ذیل میں یورپ قدیم یعنی رُوما کے فلسفہ، معاشرت، تمدن، مذہب، اخلاق پر قدیم تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترجمہ کی خوبیوں کے واسطے مترجم کا نام کافی ضمانت ہے جو حضرات قدیم یورپ کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے واسطے یہ کتاب خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے اور عام شائقین کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتی۔

رسید کتب

تاریخ ادب اُردو۔ مترجمہ مرزا محمد عسکری بی۔اے۔ قیمت للعہ؍ مطبوعہ منشی نولکشور پریس لکھنؤ۔

ظہور رحمت۔ از مولانا شاد عظیم آبادی مرحوم۔ قیمت ۸؍ دارالاشاعت رحمانی مہندرو۔ پٹنہ۔

ہند کے چند سرتاج (دو حصے) از پروفیسر جے دیو سنگھ ایم۔اے۔ قیمت ۲؍ روپے ۹؍ سٹی بک ہاؤس کانپور۔

ماں

از مولوی محوی صدیقی لکھنوی

اے میری سببِ وجود و علتِ آفرینش، اے میری رفیق آلام، دُکھ درد میں میری اُمید کا سہارا اور مصیبت میں موجب تسکین، اے میری لذتِ زندگی اور میری راحتِ موت، اے میری عہد طفلی کی نگہبان اور خواب و بیداری کی مسرت بخش ہستی اور میری عقل کی راہ نما، اے میرے گہوارے پر ہنسنے خوش ہونیوالی اور میری خاکِ گور پر آنسو بہانے والی ماں! تو کسقدر پیاری اور عزیز ہے۔

تمام دنیا مجھے چھوڑدے لیکن میں جانتا ہوں کہ تو مجھے کبھی نہ چھوڑے گی، اور گو مجھ سے میرے دوست احباب بیزار ہوکر الگ ہوجائیں مگر تو مجھ سے ہرگز بیزار نہ ہوگی۔ گو میں زندگی بھر ناروا سلوک کرتا رہوں؛ مگر تو مجھ سے درگذر کرتی۔ اور اپنی ماما سے کام لیتی رہے گی۔ تجھ سے درد دل دور ہوجاتا اور میری مصیبت رفع ہوجاتی ہے۔

تو نے مجھے درد و کرب کے ساتھ پیدا کیا، تو نے سخت تکلیف اُٹھا کر مجھے پالا، تھکن اور محنت کی آنکھوں سے میری رکھوالی کی۔ دُکھ اور مشقت کی چھاتی سے لگا کر میری حفاظت کرتی رہی، گو میں نے تیرے غموں کو کم کیا، مگر پھر تجھ سے جدا ہوگیا اور تیری خوشی کی دنیا میں ہل چل ڈالدی۔ اس طرح میں نے اپنے بانیٔ حیات کو فراموش کردیا، اپنے پاک خون کی توہین کی۔ آہ میں کسقدر نافرمان ہوں اور تو مری ماں وفا کی دیوی ہے میں تیری ماما بھری آنکھوں سے غائب رہا۔ اور میری نگاہوں سے تیرا مسکراتا ہوا چہرہ بھی اوجھل ہوگیا میں نے تیرے لطیف و نازک آثار محبت کو اور تیرے رحم آفریں معانیٔ تمنا کو بھلا دیا۔ میرے سر پر آلام و محن اپنی ہولناک شورشوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے، میری قوتِ فکر پریشان ہوگئی، اور میرا دل دھڑکن اور خفقان سے پریشان ہوگیا۔ سختیوں اور بدبختیوں کی موجوں کے تھپیڑوں نے مجھے اپنا نشانہ بنالیا۔ خوفناک گہرائیوں میں جا پڑا۔ تیرہ و تار تاریکیوں میں پہنچ گیا اور میری دونوں آنکھوں پر رعب و خوف چھاگیا۔ اب جو میں نے اپنے یاس و حزن کی بے تھاہ گہرائیوں کو غور سے دیکھا اور اُن پر ایک بیکسانہ نگاہ ڈالی تو مجھے تیرے چہرہ کا شاداب چمن نظر آیا جس کا ہر خط و خال دور دراز فاصلے سے میری طرف تبسم ریز تھا۔ مجھے ضبط کی

تاب نہ رہی، میں رو پڑا، اور چلا کر پکار اُٹھا- "اے میری ماں! اے میری ماں!!"

آہ! غریب الوطنی بھی کتنی سنگ دل ہے، اور وحشت تنہائی بھی کسقدر تلخ و ناگوار چیز ہے۔ یہ بُعدِ مکانی مجھے بہت ناگوار ہے، میرا جی اب رہی سہی اُمید کا مشتاق ہے۔ میں اب عالی شان محلوں، بلند اور رفیع منزلت عمارتوں میں رہنا سہنا، چلنا پھرنا پسند نہیں کر سکتا، عمدہ سے عمدہ عطر کی خوشبوئیں مجھے نہیں بھاتیں، جو اُن تصاویر سے آرہی ہیں جو میری چشم دل کے سامنے آتی رہتی ہیں، قدرت کے رنگین، نظر فریب مناظر میرا جی نہیں بہلا سکتے، میرے دل و دماغ اب تو صرف اس ماں کی نکہت کے آرزومند ہیں جو تیرے پاک و آزاد باغ محبت کی ہوا میں مخلوط ہو کر پھیلتی ہے۔ مجھے بڑے سے بڑے شہر کی شاندار عمارتیں اور اسکی سڑکوں اور باغوں کی کشادگی بُری لگتی ہے، بلکہ میرے لئے زندگی میں تیرے سوا ہر چیز بُری ہے۔

شام کو جب میں اپنے سخت اور تکلیف دہ بستر پر لیٹتا ہوں تو تیرے دونوں نرم و نازک ہاتھ یاد آتے ہیں اور رات کو جب میرے خیالات پریشانیوں کے بوجھ سے دب دب کر چور ہونے لگتے ہیں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پلنگ کے گرد تیرے دونوں قدم میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر صبح کو جب میری آنکھ کھلتی ہے تو میں تجھے نہیں پاتا۔ اپنے کمرے کی تاریک دیواروں کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا اور نہ تیری آواز یا آہٹ سُنائی دیتی ہے۔ پردیسیوں کی آوازوں کے سوا کچھ سننے میں نہیں آتا۔ میں ان عورتوں کو غور سے دیکھتا ہوں اور تجھے ڈھونڈھتا اور یہ پوچھتا چلا جاتا ہوں کہ "اے شریف خواتین! تم نے کہیں میری ماں کو بھی دیکھا ہے"؟

کتوں کے پلے اپنی ماں کی گود میں کھیلتے رہتے ہیں، مرغی کے بچے اپنی ماں کے پروں میں مست رہتے ہیں، درختوں کی کونپلیں اپنی ماؤں کے گلوں سے لپٹتی ہیں اور میں تنہا تیرے لئے بیتاب اور آرزومند رہتا ہوں۔

جب میں مر جاؤنگا، جب میرا شوقِ محبت مجھے مار ڈالے گا اور میری آرزوئیں دفن ہو چکیں گی، اس خاکِ غربت میں، اس مغرب کی بے درد و ناآشنا سرزمین میں تو تو، اے میری ماں! غروب آفتاب کے وقت بلوط کے جنگل میں بیٹھ جاتا اور کان لگا کر سُننا وہاں میری روح جو نسیم وحشت کی جھونکوں میں جذب ہو چکی ہوگی اور صحرا کے درخت جو آہستہ آہستہ جھومتے اور ہلتے جاتے ہونگے، بار بار یہ نغمہ سُنا رہے ہوں گے۔ "اے میری ماں، اے میری ماں، اے میری ماں!"

(ترجمہ از عربی)

ایک پیسہ

از مسٹر جے کرشن

ایک پیسے کی حقیقت ہی کیا؟ خاصکر ایک دولتمند کی نظروں میں، دولتمند کو بھی جانے دیجئے ہم اور آپ بھی ایک پیسے کو ٹھیکری جیسا سمجھتے ہیں۔ اگر ایک پیسہ کہیں گر پڑے تو ہمیں چنداں افسوس نہیں ہوتا، یہ تو سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ ایک پیسے میں ایک دیاسلائی کی ڈبیہ یا اور کوئی چھوٹی چیز خریدی جاسکتی ہے، لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کیونکہ جب ہمارے پاس روپیہ موجود ہے تو ایک پیسے کی اُسکے سامنے حقیقت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ لیکن اکثر ایسا موقع آجاتا ہے کہ ہم محض ایک ہی پیسے کے لئے تکلیف اُٹھاتے ہیں، چاہے ہمارے پاس سیکڑوں روپے کیوں نہوں اُسوقت ہم کو اُس ایک پیسے کی جسکو ہم اکثر تنبولی کی دوکان پر صرف ایک بیڑے کے لئے لاپروائی سے پھینک دیتے ہیں قدر معلوم ہوتی ہے، اسوقت ایک ہی پیسہ لاکھوں روپیہ کے برابر ہوجاتا ہے۔ ایک پیسے کے بغیر ہمارے ضروری سے ضروری کام رُک جاتے ہیں اور اکثر ذلیل بھی ہونا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی یہی ایک پیسہ وہ معجزے دکھلاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اِس قسم کے واقعات آئے دن ہماری نظروں سے گذرتے رہتے ہیں۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ میں کانگریس میں شریک ہونے کے لئے کلکتہ جارہا تھا، اتفاق سے اُسی گاڑی سے ایک بابو صاحب بھی کلکتہ جارہے تھے۔ اُن کے ساتھ میں دو نوکر تھے۔ سامان بھی رئیسانہ تھا۔ وہ بڑھیا چمکدار اچکن اور چوڑی دار پائجامہ پہنے ہوئے تھے۔ کلائی میں ایک خوبصورت سونے کی گھڑی بندھی تھی۔ جوتے بھی پندرہ بیس روپیہ سے کم کے نہ ہونگے۔ لیکن اُن میں کوئی خصوصیت نہ تھی کیونکہ اس قسم کے سامان تو ہر ایک رئیس زادہ کے لوازمات ہوا کرتے ہیں۔ میرے پاس بھی ایک چھوٹا سوٹ کیس اور ایک بستر تھا اور میں اکیلا ہی تھا۔ میرے ہی ہاتھ پاؤں میرے خادم اور مخدوم تھے ابھی ٹکٹ فروخت ہونے میں دیر تھی، میں پلیٹ فارم پر ایک بنچ پر بیٹھا ہوا بابو صاحب کے سازوسامان

کو متحیر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت میرے دماغ میں یہ خیال تھا کہ مجھے اور انھیں (بابو صاحب) دونوں کو خدا نے بنایا ہے لیکن دونوں میں اسقدر فرق کیوں ہے؟ ذرا دیر کے لئے مجھے قدرت کی اِس بے انصافی پر غصہ آیا، لیکن غریب کا غصہ ہی کیا! ان کی آن میں کافور ہو گیا۔

گھنٹی کی ٹن ٹن کی آواز نے مجھکو محویت سے ہوشیار کر دیا۔ پورب کا ٹکٹ تقسیم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اسٹیشن پر بڑی بھیڑ تھی۔ زیادہ تر مسافر کلکتہ ہی کا ٹکٹ لے رہے تھے۔ جہانتک نظر جاتی تھی مردوں عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ ٹکٹ لیتے وقت ہر شخص کی آؤ بھگت دھکوں سے ہوتی تھی۔ اکثر لوگوں کے پیر بُری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ لیکن کانگریس دیکھنے کا شوق ہر شخص کو مجنوں بنائے ہوئے تھا۔ سب کے سب بیتاب عاشقوں کی طرح ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے پاس جمع تھے۔ چنانچہ میں بھی اس دعوت عام کے خمیازہ سے بچ نہ سکا۔ کسی بندۂ خدا نے میرے سینہ پر اس زور کا دھکّا مارا کہ میں سانس نہ لے سکا۔ خیر تھوڑی دیر میں کسی نہ کسی طرح ٹکٹ لینے کی مہم فتح ہو گئی۔

باہر آکر دیکھا تو ہمارے بابو صاحب ہاتھ میں چھڑی لئے چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ایک نوکر کو ٹکٹ لینے کے لئے بھیجا تھا۔ ذرا دیر میں وہ دوڑتا ہوا آیا اور اپنے مالک سے بولا "ٹیشن ماسٹر کہت ہیں کہ ٹکس کے پور پور دام لاؤ تبے ٹکس ملی نا ہیں تو نہ ملی"

یہ سُنکر بابو صاحب بولے۔ "میں نے تو تجھے پچاس روپئے کا نوٹ دیدیا ہے۔ پاگل کہیں کا۔ جا جلدی سے ایک ٹکٹ اوّل درجے کا اور دو تیسرے درجے کے لے آ"

"اُو نہیں دیت مالک۔ کہت ہیں کہ نوٹ سوٹ ہم کا کری۔ پور پور دام لاؤ"

یہ سُنکر بابو صاحب بہت جھلّائے اور بولے۔ "چل میں چلتا ہوں"۔ ٹکٹ گھر میں پہونچکر اُنھوں نے کہا۔ "بابو صاحب! ایک ٹکٹ فرسٹ کلاس کا اور دو ٹکٹ تھرڈ کلاس کے دیدیجئے"۔ یہ کہکر پچاس روپے کا نوٹ اُنکے آگے پھینکدیا۔ بھلا اسوقت ٹکٹ بابو کو اتنی فرصت کہاں کہ آنہ پائی کا حساب کرنے بیٹھیں۔ ٹکٹ کے پورے پورے دام لیکر ٹکٹ دیتے تھے۔ اگر کسی صاحب کا حساب کرنے بیٹھتے تو اُسی کے ہو جاتے۔ اُنھوں نے نظر اُٹھاکر بابو صاحب کی طرف دیکھا اور پھر بولے۔ "نوٹ نہیں۔ تین ٹکٹوں کی پوری پوری قیمت دیجئے"۔ یہ کہکر اُنھوں نے نوٹ واپس کر دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

بابو صاحب پھر بولے۔ "میرے پاس ریزگاری نہیں ہے اور نہ ٹکٹوں کی قیمت کے پورے روپئے ہیں۔ صرف نوٹ ہی نوٹ ہیں"

"تو میں کیا کروں۔"

"آپ کچھ نہیں کر سکتے کیوں؟"

"کہہ تو دیا کہ اتنی فرصت نہیں۔"

اب تو بابو صاحب کو بہت غصہ آیا مگر بیکار۔ اُنھوں نے آجتک ایسی زک نہ اُٹھائی ہوگی۔ گاڑی دیر سے کھڑی تھی، اب اُسکی روانگی میں صرف دس منٹ باقی رہ گئے تھے، اُنھوں نے اپنا منی بیگ ٹٹولا، پھر جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ٹکٹوں کی قیمت کا حساب لگایا تو اُنکا رنگ زرد پڑ گیا ایک پیسہ کم تھا، دفعتاً اُنکے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور ایک پان والے کی دوکان پر جاکر تنبولی سے بولے۔ "چار آنے کے پان لگا دو۔" جب اُس نے پان کی گلوریاں بابو صاحب کے ہاتھ میں دیں تو بابو صاحب اُسکو ایک روپیہ دینے لگے۔ تنبولی بولا۔ "بابو جی اتنے پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔"

"آخر کتنے ہیں۔"

اُس نے اپنی چھوٹی سی صندوقچی دیکھکر کہا۔ "صرف پانچ آنے ہیں۔"

"پانچ ہی آنے دیدو۔ جلدی کرو۔"

تنبولی نے مشتبہ نظروں سے اُنکی طرف دیکھا۔ وہ سمجھا کہ شاید یہ کوئی ذات شریف ہیں، پھر بھلا ایسے موقع پر وہ ایمانداری جتانے سے کیوں چوکتا، پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو سُنا کر کہنے لگا۔ "بابو صاحب مجھ سے ایسی بے ایمانی کی اُمید نہ رکھئے۔ وہ گھر اور ہیں جہاں آپ جیسوں کی دال گلتی ہے۔"

پاس ہی ایک کانسٹبل کھڑا تھا۔ تنبولی کے یہ الفاظ سُنکر بولا۔ "کیا کہا بھگت آپ جیسوں کی دال....؟"

"نہیں چیف صاحب آپ سے کچھ تھوڑا ہی کہا ہے۔ کہتا ہوں ان (بابو صاحب کیطرف اشارہ کرکے) بابو صاحب سے کہ یہاں آپ جیسوں کی دال نہیں گلتی۔"

"کیوں بھائی کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں، یہ ہمیں سبق پڑھانے گئے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہاں انکے بھی چچا موجود ہیں۔"

ناچار بابو صاحب نے پان لوٹا دیئے اور روپیہ لے لیا۔ مارے غصہ کے اُنکا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا مگر کرتے تو کیا کرتے ہونٹ چبا کر رہ گئے، ایک تنبولی کے مُنہ سے ایسی باتیں سُنکر اُنکے بدن میں آگ لگ گئی۔ اگر اسٹیشن نہ ہوتا تو شاید وہ اس بدتمیز تنبولی کی بُری طرح سے خبر لیتے کہ وہ بھی

عرصہ تک سوا کرتا مگر یہاں وہ بے بس تھے، اُنکا ساتھ دینے کو کوئی شخص موجود نہ تھا۔ بہرحال بہ خیال دور اندیشی، خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

اسوقت اُنکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ فرسٹ کلاس کے بجائے سکنڈ کلاس میں شاید وہ جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایک نوکر کو کم کر دینا بھی خلاف شان تھا۔ دو مہتے سی کتنے ہیں۔ پھر آخر کرتے تو کیا کرتے، اسی اُدھیڑ بن میں تھے۔ عقل دنگ تھی، ایک رئیس زادہ اسوقت ایک پیسے کے نہ ہونے سے کسقدر پریشان تھا۔ آج سے پہلے کتنے ہی پیسے جا و بیجا انکے ہاتھوں سے صرف ہوئے ہونگے۔ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں پیسوں کو اُنھوں نے ٹھیکریوں کی طرح پھینکا ہوگا۔ شاید اُنھیں پیسوں کی روح نے اب صرف ایک پیسے کا جامہ پہنکر اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھانی تھی۔

میں کھڑے اُنکی یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ میں اُنکی باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ انکے حساب میں صرف ایک پیسے کی کمی رہ گئی ہے۔ بار بار میرے جی میں آتا تھا کہ جاکر عرض کروں کہ "بابو صاحب صرف ایک پیسے کی بات ہے مجھ ہی سے لے لیجئے۔ بعد میں مجھے دیدیجئے گا" لیکن اس خیال سے کہ کہیں ناگوار خاطر نہ ہو اُنکے پاس تک جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سوچتا تھا کہ کہیں بُرا نہ مان جائیں اور دو چار اُلٹی سیدھی باتیں سنا بیٹھیں تو کیا ہو؟ بڑے آدمیوں کا مزاج بھی تو بڑا ہوتا ہے۔!

گاڑی چھوٹنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سوچا کہ ایکبار عرض کرنے میں کیا حرج ہے۔ ماننا نہ ماننا اُنکا کام ہے۔ اگر اُنھوں نے مجھے کچھ کہہ بھی دیا تو کیا؟ انسان کی عزت کچھ نمک کی کنکری نہیں ہے کہ باتوں کی چند چھینٹوں سے گھل جائے۔ اُسے اپنا فرض پورا ہی کرنا چاہئے۔ بہرحال ان خیالات سے میرے دلمیں ہمت پیدا ہوگئی۔ بات کی بات میں میں نے انکے پاس پہونچکر کہا۔ "بابو صاحب۔ ایک پیسے کی تو بات ہی ہے۔ مجھ ہی سے لے لیجئے، میں بھی کلکتہ جا رہا ہوں۔ بعد میں روپیہ بھُناکر دیدیجئے گا۔ اسمیں شاید کوئی حرج نہ ہوگا۔"

یہ سُنکر وہ بڑے غور سے میرے چہرے کیطرف دیکھنے لگے، پھر ذرا ٹھہر کر بولے۔ "نہیں آپکو کیوں تکلیف دوں، میں دوسری ٹرین سے چلا جاؤنگا۔"

"اسمیں تکلیف کی کونسی بات ہے۔ آخر آدمی کے کام آدمی ہی آتا ہے۔"

یہ باتیں میں نے بڑی سنجیدگی سے کہیں۔ اُسوقت ذرا بھی خیال نہ تھا کہ میں بے پیسے والا ہوں

اور یہ دولتمند ہیں؟ وہ کچھ ہچکچا کر بولے - "اچھا تو پھر دیدیجئے .... شکریہ"
میں نے جیب سے ایک پیسہ نکال کر چپکے سے انکے ہاتھ میں دیدیا - فوراً ٹکٹ آگئے - اور وہ ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں جاکر بیٹھ گئے، دونوں نوکر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے میرے ہی درجہ میں بیٹھے،

گاڑی سیٹی دے چکی تھی، اور چھوٹنا ہی چاہتی تھی؛ میں اُس روز کا لیڈر دیکھ رہا تھا کہ بابو صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور میرے درجہ میں بیٹھ گئے - میں نے گھبرا کر پوچھا "کہئے کیا بات ہے"
"کچھ نہیں میں اسی درجہ میں آپکے ساتھ ہی چلونگا"

الایمان

نوشتۂ مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی - تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۱۵۲ صفحات
ملنے کا پتہ - مسلم یونیورسٹی پریس - علی گڈھ

مسلمان بچوں کو اسلامی عقائد سے واقف کرنا اس رسالہ کی تالیف کا مقصد ہے اور اس کے دو حصے ہیں - پہلے حصہ میں آمنت باللہ کی مختصر تفسیر ہے اور دوسرے میں اسکو زیادہ تفصیل سے لکھا ہے - جملہ ارکان دین بہت سادگی کے ساتھ سمجھائے ہیں جن پیغمبروں کے نام قرآن شریف میں مذکور ہیں اُنکا ذکر بھی کیا ہے اور پیغمبر اسلام کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں - علاوہ آیات قرآن شریف - احادیث نبویؐ کئی سو مع ترجمہ جمع کی ہیں - زبان آسان اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے اور معمولی اُردو جاننے والے اسکو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں -

---

رسید کتب

سلائی کی کتاب - از لئیق النساء صاحبہ - ۴؍
فرہنگ امثال - از سید مسعود حسن رضوی - ایم - اے - قیمت ۱؍
ہند کے جانثار - از منشی سورج نراین ماتھر - بی - اے - قیمت ۱۲؍
} رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالا پبلشر الہ آباد

جواہر اللغات (فارسی) - از منشی بشمبھر دیال - قیمت ۱؍
عود ہندی - از مرزا غالب دہلوی مرحوم
} مسٹر رام نراین لال بکسیلر الہ آباد

وھمپد - قیمت ۸؍ - لالہ چند دلال چاول والا - کھاری باؤلی - دہلی -

تنقید کتب

پروازِ خیال

از خواجہ حمید الدین حمید لکھنوی۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ جیبی تقطیع۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ

یہ خواجہ حمید صاحب کی غزلوں کا منتخب مجموعہ ہے۔ حمید صاحب اُن سخنوروں میں ہیں جو:۔

"گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے زبان کی سچی اور صحیح خدمت کر رہے ہیں نہ کسی سے ملتے نہ مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں۔ نہ انانیت کی ہوا ان کو لگی ہے نہ اپنے ہوا خواہوں کے ذریعہ سے شہرت کے جویاں ہیں۔" (دیباچۂ پروازِ خیال)

اسی لئے ادبی دنیا اگر اُن سے پورے طور پر واقف نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حمید صاحب لکھنؤ کے مشہور سخنور و اہل قلم خواجہ عشرت صاحب کے شاگرد رشید ہیں جو اس امر کی دلیل ضرور ہے کہ اُنکا کلام زبان و فن کے نقائص سے پاک ہوگا اور واقعی وہ ایسا ہی ہے۔

شروع میں خواجہ عشرت لکھنوی کا ایک مختصر مگر جامع مقدمہ ہے جسمیں زبان اُردو کی ابتدائی تاریخ کو دُہراتے ہوئے خواجہ صاحب نے حسب معمول اہل زبان اور مرکز زبان کا قصہ چھیڑ دیا ہے اور ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں جہاں اہل علم اُردو کی ترقی و ترویج میں اپنی اپنی بساط کے مطابق کوشاں ہیں اُن کو "اُردو زبان کے مرکز" لکھنؤ کا اتباع نہ کرنے کی بنا پر مورد عتاب کیا ہے۔ دکن کو آپنے خصوصیت سے مورد الزام قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اسالیب و لہجہ اختیار کیا ہے جس سے بجا طور پر شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔

آپنے موجودہ دور کے شعراء کو لکھنؤ اور دہلی کی تقلید نہ کرنے کی وجہ سے ہدف ملامت بناتے ہوئے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ "ابھی تک لکھنؤ میں چند شرفا شعر و سخن کا صحیح مذاق رکھنے والے ایسے ہیں جو فن شعر کو باضابطہ حاصل کرتے ہیں اور زبان و محاورات کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔ اسکے بعد حمید صاحب کے کلام پر ایک اجمالی نظر ڈالکر عزیز شاگرد کے محاسن کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

عشرت صاحب کے مفروضہ مرکز زبان کے نظریہ سے بحث کرنا اسوقت ہمارے موضوع سخن سے الگ ہے۔اس لئے اب ہم "پرواز خیال" پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔
اسمیں شک نہیں کہ اس مجموعہ میں اکثر اشعار ایسے ہیں جنمیں اگرچہ کوئی خاص بات تو نہیں مگر بقول حضرت عشرت ہر صحیح مذاق رکھنے والا ان کو قبول کر سکتا ہے۔ ؎

بے خبر اس بات سے اب تک دل ناکام ہے راحت و آرام دنیا میں خیال خام ہے
زندگی و مرگ میں کچھ نامہ و پیغام ہے خالی از علت نہیں یہ آمد و رفت نفس

اس سے نہیں کچھ مطلب کعبہ ہو کہ بت خانہ منزل ہے وہی میری جس جا ترا جلوہ ہے
ملتے ہیں مزے کیا کیا محفل میں حمید اسکی ہر وقت ہے آنکھوں میں اب جلوۂ جانانہ

زمیں پر ہے نہ زیر آسماں ہے، جہاں کوئی نہیں ہے تو وہاں ہے،
گلہ اُس کے تغافل کا ہے سب کو خدا جانے وہ کس پر مہرباں ہے،

لیکن اس کے ساتھ ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن کی وجہ سے لکھنؤ کا عام مذاق سخن بدنام ہے ؎

چارہ گر ہچکی نہ تھی یہ موت کا پیغام تھا، دم نکلتے ہی مرا افسانہ طشت ازبام تھا
آمد و رفت نفس کا سلسلہ جاتا رہا ایک ہچکی کیا تھی گویا موت کا پیغام تھا

نبض ساقط ہو چکی ہے نزع کا ہنگام ہے جلد آ اے آنے والے اک ضروری کام ہے

نہ کیوں وقت عیادت وہ عرق آلود ہو جائیں پسینہ موت کا ہے روئے بیمار محبت پر

نہیں آئے جو عیادت کو تو اچھا نہ سہی میری میت کے بھی ہمراہ چلوگے کہ نہیں

سخت جانی سے مری ایسا ہوا وہ بدگماں پہلے نبضیں دیکھ لیں دیکھا پھر اس نے تیر کو

بایں ہمہ یہ مجموعہ اہل سخن کے مطالعہ کے قابل ہے اور اگر خذ ما صفا و دع ما کدر کو پیش نظر رکھکر دیکھا جائے تو اسمیں دلچسپی کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔

واقعات عالم

مصنفہ حضرت خطیب قادر بادشاہ مرحوم رئیس وانمباڑی - چھوٹی تقطیع - حجم ۴۸ صفحات
قیمت ۴ر - ملنے کا پتہ :- خطیب محمد عبد الرشید - ۶۹ گوڈوں اسٹریٹ - مدراس

اصناف سخن میں تاریخ گوئی ایک مشکل صنف ہے - اگلے زمانہ کے شعراء دوسرے اصناف سخن کے ساتھ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل کرنا کامل الفن ہونے کے لئے ضروری سمجھتے تھے - یہی وجہ ہے کہ قریب قریب تمام متقدمین و متاخرین سخنوروں کے مجموعۂ کلام میں قطعات تاریخ پائے جاتے ہیں - مگر موجودہ دور میں اسکو یا تو مشکل یا غیر ضروری سمجھکر نظر انداز کر دیا گیا ہے - حضرت بادشاہ مرحوم جنوبی ہند کے ایک خوش فکر شاعر تھے اور اُن کو تاریخ گوئی میں بہت مہارت تھی چنانچہ اس مختصر رسالہ میں فارسی اور اُردو کے وہ قطعات تاریخ جمع کئے گئے ہیں جو مرحوم نے بعض اہم ملکی و غیر ملکی واقعات علماء و فضلاء کی وفات وغیرہ کے متعلق کہے تھے - شاعری بذات خود ایک مشکل فن ہے اور اسمیں کمال پیدا کرنا "عمرے باید کہ یار آید بہ کنار" کے مصداق ہے - اور تاریخ گوئی کے لئے بھی مشق کی ضرورت ہے - پھر بھی بعض مادے برجستہ اور عمدہ ہیں - آخر میں چند واقعاتی نظمیں بھی ہیں - زبان بیان اور فن شعر کے اعتبار سے یہ مجموعہ کچھ زیادہ قابل التفات نہیں، تاہم جنوبی ہند کے ایک باشندے نے جسکی مادری زبان اُردو نہیں جس صورت میں بھی داد سخن سنجی دی وہ غنیمت ہے - اس مجموعہ میں مصنف کی تصویر بھی شامل ہے

تذکار سلف

مصنفہ مولوی ضیاء احمد ضیا ایم - اے - بدایونی - لیکچرار انٹرمیڈیٹ کالج،
مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

یہ نو قطعات کا ایک مختصر مجموعہ ہے - اسلامی تاریخ، پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین کے زمانہ کے بعض اہم اخلاقی واقعات کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے - واقعاتی نظموں میں شاعرانہ خوبیوں کو تلاش کرنا بیکار ہے - ایسی نظمیں کہنے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ واقعات کی اصلیت کو قائم رکھکر حتی الامکان اُن کو مؤثر بنا دیا جائے - اس لحاظ سے یہ قطعات ایک کامیاب کوشش کہے جا سکتے ہیں - شروع میں مولنا عبد الماجد بی - اے اور مولنا عبد السلام ندوی نے تقریب و مقدمہ کی صورت میں اس مجموعہ مجملاً اظہار خیال کیا ہے -

---

تاریخ عالمگیری

مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی - ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس الہ آباد - تقطیع ۲۲×۱۸/۸
حجم ۲۴۲ صفحات - قیمت ۶ر

اورنگ زیب عالمگیر کے حالات کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مگر زیر نظر کتاب کی ترتیب سب سے جدا ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں مکاتیب عالمگیر اور مستند مورخین کی رائیں جمع کرکے شہنشاہ موصوف کے ذاتی حالات اور اخلاق و عادات نیز عدل گستری و رواداری وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور دوسرے حصہ میں شاہجہاں، اورنگ زیب، شاہزادگان معظم، داراشکوہ وغیرہ اور بعض ہندو اور مسلمان اُمرائے سلطنت کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہیں ان راجگان ہند کی فہرست معہ مختصر حالات دی ہے جو عالمگیری دربار میں معزز مناصب پر فائز تھے۔ غرض شہنشاہ اورنگ زیب اور اسکے درباریوں کے حالات میں یہ ایک عمدہ اور لائق مطالعہ کتاب ہے۔ صاحب سوانح اور روضۂ تاج گنج کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ اسکے مصنف چودھری نبی احمد صاحب ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں، ایک سرگرم پولیس افسر ہونیکے باوجود آپ کی تحقیق علمی قابل داد ہے۔ شاہان مغلیہ میں اورنگزیب کا درجہ ہمارے نزدیک کچھ بلند نہیں ہے تاہم جس محنت سے چودھری صاحب نے "وقائع عالمگیری" کا کل مسالہ یکجا کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

تاریخ حسینی

مترجمہ پروفیسر آغا مہدی حسین ایم۔اے۔ تقطیع $\frac{22\times18}{8}$ حجم ۱۴۴ صفحات
ملنے کا پتہ:۔ منیجر حسین بک ڈپو آگرہ۔

یہ علامہ علی بن موسیٰ حسینی کی عربی تالیف "لھوف علیٰ قتلی الطفوف" کا ترجمہ ہے۔ اسمیں حضرت امام حسین علیہ السّلام کی پیدائش سے لیکر شہادت اور اسکے بعد اہل بیت اطہار کے مدینہ منورہ پہنچنے کے حالات ایک دردانگیز پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں چونکہ مقصد تالیف مومنین کے جذبۂ غم کو اُبھارنا ہے اس لئے اس میں تاریخی واقعات کے ساتھ مذہبی معتقدات و روایات بھی ہیں خصوصیت سے اہل تشیع کے مطالعہ کی کتاب ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس ہے جسپر ہم قابل مترجم کو مبارکباد دیتے ہیں۔

جمال الدین افغانی

چھوٹی تقطیع۔ حجم ۴۴ صفحات (ٹائپ) قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

سید جمال الدین اصل میں ایرانی نژاد تھے مگر عنفوان شباب میں ترک وطن کرکے افغانستان چلے گئے تھے اور اسی وجہ سے "افغانی" مشہور ہوئے۔ سید صاحب ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب و خطیب تھے اور اکثر مشرقی و مغربی زبانوں سے واقف تھے۔ عربی میں اُن کی قابلیت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ

اُنھوں نے کئی سال جامع الازہر مصر میں طلباء کو درس دیا تھا۔ فرانسیسی میں وہ بلا تکلف لکھتے پڑھتے تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان - عرب - ترکی - مصر - انگلستان - روس - جرمنی - فرانس اور امریکہ وغیرہ ممالک کی سیر کی تھی اور ہر ملک کے اہل علم و ماہرین سیاست انکا ادب و احترام کرتے تھے۔ وہ دلیر، اولوالعزم، محب قوم اور مستقل مزاج تھے اور حق و صداقت کی حمایت میں ہمیشہ سر بکف رہتے تھے۔

سیّد صاحب کا سیاسی نظریہ اُصول جمہوریت پر مبنی تھا اور وہ استبداد پسند شخصی حکومتوں کے مخالف تھے۔ وہ تمام اسلامی ممالک کو یورپ کی جوع الارض کا شکار ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک عالم گیر اسلامی اتحاد کے حامی تھے اور عمر بھر اسی مقصد کی تبلیغ اور تکمیل میں مصروف رہے، چونکہ وہ خصوصیت سے انگلستان کو عالم اسلام کا دشمن سمجھتے تھے اور ایران کی ظالم شخصی حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتے تھے اس لئے ان ممالک کے ارباب حل و عقد اُن سے ہمیشہ خائف رہتے اور اُن کی سرفروشانہ جد و جہد کو جو وہ تمام عالم اسلام کو ایک سلک اتحاد میں منسلک کرنے کے لئے کر رہے تھے برباد کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے بایں ہمہ یورپ کے اکثر مدبرین سید صاحب کی علمی قابلیت، سیاسی نظریہ اور اصابت رائے کے آجتک معترف ہیں

۱۸۹۷ء میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں اس علمبردار حریّت و مساوات نے اس عالم فانی سے ملک جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

اس کتاب میں سید صاحب مرحوم کے سوانح حیات، ملکی و قومی خدمات، سیاسی نظریہ، مشرقی و مغربی ممالک میں قیام اور وہاں کے ارباب بست و کشاد سے اسلامی معاملات پر تبادلۂ خیالات و مباحث وغیرہ غرض جملہ حالات مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ درحقیقت موصوف ایک غیر معمولی دل و دماغ کے شخص تھے اور مشرقی ممالک میں جو بیداری آجکل نظر آرہی ہے وہ بہت کچھ ان ہی کی تعلیمات کی منت پذیر ہے۔ صاحب سوانح اور شیخ محمد عبدہ فاضل مصری شاگرد سید صاحب مرحوم کی تصاویر بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

عدالت خداوندی مرتبہ پروفیسر ظفر تاباں - لیکچرار رام جس کالج دہلی - چھوٹی تقطیع حجم ۹۶ صفحات قیمت ۸ / ۔ ملنے کا پتہ - دائرہ شرقیہ دارالاشاعت - دریاگنج - دہلی،

یہ اخوند ملا فتح علی اصفہانی مرحوم کے رسالہ "خواب شگفت" کا آزاد ترجمہ ہے۔ ملا فتح علی ایران کا ایک اہل دل، دردمند قوم اور محب وطن شخص تھا۔ جو اپنے اہل ملک کو جہالت و نادانی اور لہو و لعب میں مصروف دیکھکر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا اور اسکو اس بات کا صدمہ تھا کہ ایران دوسرے مہذب ممالک کے

مقابلہ میں منزل ترقی میں بہت پیچھے ہے ۔ صنعت و تجارت، ریل اور تار برقی وغیرہ کے ہنر سے اہل ایران محض ناواقف اور اپنی ضروریات زندگی کے لئے غیر ممالک کے دست نگر ہیں۔ مُلّا فتح علی آزاد منش اور سیاحت پسند تھا۔ اطرافِ ایران۔ ماورالنہر اور ہندوستان کی سیاحت کر چکا تھا۔ انگریزی زبان سے بھی بخوبی واقف تھا اور اکثر یوروپین مصنفین کی کتابیں اُسکے مطالعہ میں رہتی تھیں جسکی وجہ سے وہ مغربی ممالک کے اُصول سیاسی سے بخوبی واقف تھا۔ اپنے ملک کو بیدار کرنے کے واسطے وہ اکثر درس و تدریس میں مشغول رہتا تھا اور اپنی عمر کے آخری ایام میں اُس نے یہ مختصر رسالہ تصنیف کیا تھا جسمیں فرضی طور پر عالم خواب کے مناظر دکھائے گئے ہیں یعنی عرصۂ قیامت میں مختلف اُمم و ملل کے افراد موجود ہیں اور داور محشر اُنکے افعال و اعمال کا جائزہ لے رہا ہے، وہ اپنے عاقبت نااندیشانہ طرز عمل کو اچھا سمجھنے کی وجوہات بیان کرتے ہیں مگر اُس عالم الغیب کے روبرو اُنکی تمام دلیلیں محض بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ اِس ضمن میں مختلف عقائد کے افراد کی حالتیں اس خوبی سے بیان کی گئی ہیں کہ یہ خواب حقیقت پر مبنی معلوم ہونے لگتا ہے اور دراصل حقیقی واقعات کو خواب کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس تصنیف کا مقصد اہل ایران کو اُنکی موجودہ حالت سے آگاہ کرکے اصلاح کی تعلیم دینا ہے اور مصنّف اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اہل ہند کے لئے بھی اسکا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں، ترجمہ میں الفاظ کو نظر انداز کرکے مصنف کے خیالات کی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے اس میں تصنیف کی شان نمایاں ہے۔

کایستھوں کی تاریخ[۱] حصہ اوّل (انگریزی) ازمسٹر گوپی ناتھ سنہا۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات قیمت ع۲؍ ملنے کا پتہ۔ مسٹر بھگوان داس ورما۔ محلہ قانون گویان۔ بریلی،

غالباً انگریزی زبان میں اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ پہلی کتاب ہو۔ قوم کایستھ کی اصلیت و حقیقت افراد قوم کے شاندار کارنامے۔ موجودہ زمانہ میں ہندو سوسائٹی میں فرقہ کایستھ کی عظمت وغیرہ پر مدلل بحث کی گئی ہے اور تمام ماخذات کے حوالے دیکر کتاب کو بہمہ وجوہ مکمل بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ قوم کایستھ کے ان افراد کو جو انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہوں اپنی قوم کی حقیقت و عظمت سے واقف ہونے کے لئے اس کتاب کی قدر کرنا چاہئے۔ اور دوسرے اصحاب کے لئے اسکا ترجمہ اُردو اور ہندی میں کیا جائے تو بہتر ہو۔

---

[۱] A History of Kayasthas.

کشمیر گائڈ

مولفہ میر ارشاد علی ارشد دہلوی دبا واد تاتل سیاح - چھوٹی تقطیع ضخامت ۲۰۴ صفحات قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ - دی رائل بک سٹال جنرل پوسٹ آفس - لاہور

کشمیر جنت نظیر اگر ایک طرف اپنے دلفریب قدرتی مناظر کے لئے مشہور ہے تو دوسری طرف قدیم تاریخی یادگاروں اور زیارت گاہوں کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے خصوصاً "امرناتھ" کی یاترا کے لئے ہر سال ہزاروں زائرین وہاں جاتے ہیں - اس کتاب میں یاتریوں اور سیاحوں کی آگاہی کے لئے کشمیر کے تمام قابل زیارت ولائق دید مقامات کا مفصل حال، راستوں کی حالت، طریقۂ سفر، ضروریات سفر اور ہر مقام کے قدرتی مناظر کی کیفیت سلیس زبان اور دلنشین پیرایہ میں بیان کی گئی ہے - چونکہ مولفین نے خود چند بار کشمیر کی سیر کی ہے اس لئے تمام حالات بالتفصیل لکھے ہیں، خصوصاً مناظر فطرت کی تصویر ایسے دلچسپ انداز میں کھینچی ہے کہ اصل مناظر کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور بے اختیار دل یہ چاہتا ہے کہ ہم بھی اس بے نظیر خطہ کی سیر کر کے لطف حاصل کریں - مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر بالقابہ والیٔ کشمیر اور متعدد فطری مناظر کی تصاویر نیز راستہ کے نقشوں سے کتاب کی زینت بڑھ گئی ہے - آخر میں کشمیری زبان کے الفاظ و فقرات اور اُن کے مقابل اُردو ترجمہ ہے - خاص خاص مقامات پر تو اُردو زبان بخوبی بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر دور و دراز پہاڑی مقامات کی سیر کرنے والوں کے واسطے یہ الفاظ اور فقرے بہت کچھ کام دیسکتے ہیں - جو حضرات یاترا یا سیر کے لئے کشمیر جائیں انکو یہ کتاب اپنے ہمراہ ضرور رکھنی چاہیئے -

---

سلائی کی کتاب (پہلا حصہ)

مصنفہ لئیق النساء صاحبہ - ہیڈ مسٹرس میونسپل اُردو گرلس اسکول - کانپور ضخامت ۱۱۰ صفحات قیمت ۸/ - ملنے کا پتہ - رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ پبلشر - الہ آباد -

دستکاری کے متعلق ہندوستانی زبانوں میں عموماً اور اُردو زبان میں خصوصاً بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں - حالانکہ ہندوستانی عورتوں کے لئے سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا وغیرہ سیکھنا بہت ضروری ہے - اگرچہ اس قسم کی دستکاری کسی نہ کسی حد تک ہر شریف گھر کی عورتیں اور لڑکیاں سیکھتی ہیں مگر ہر فن میں کمال حاصل کرنے کے واسطے اسکے متعلق ضروری باتیں جاننا نہایت ضروری ہے - یہ کتاب سینے پرونے کے متعلق ہے - اسمیں مردانہ و زنانہ کپڑوں کا تراشنا اور سینا خاکے بنا کر سمجھایا گیا ہے - ہندوستانی اور مغربی طرز کے ہر قسم کے کپڑوں کے تراشنے اور سینے کی ترکیب نیز پُرانے کپڑوں کی درستی، کپڑوں کو دھونا، رنگنا اور ان کی حفاظت کے طریقے بھی بیان کئے ہیں - تعلیم یافتہ عورتیں اور لڑکیاں عملی طور پر ہر قسم کے کپڑے سینے میں اس کتاب سے بہت کچھ مدد حاصل کر سکتی ہیں - سرورق مصور ہے اور کتاب مجلد -

بجلی کی پہلی کتاب

از مسٹر محمد سمیع اللہ۔ چھوٹی تقطیع۔ حجم ۲۴۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت عہ
ملنے کا پتہ:۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار۔ لاہور

موجودہ زمانہ میں قوت برقی کے کرشمے روز بروز عام ہوتے جا رہے ہیں مگر ہندوستانی زبانوں میں اس کے علم و اثر کے متعلق بہت کم کتابیں ہیں جسکی وجہ سے بجلی کا کام کرنیوالوں کو بہت دقت ہوتی ہے اور وہ اپنے کام میں ایک محدود دائرہ سے آگے ترقی نہیں کرسکتے۔ اس ضرورت کو محسوس کرکے مصنف نے یہ کتاب سادہ اُردو زبان میں مرتب کی ہے۔ اور ہر مضمون کو تصاویر کے ذریعہ سے سمجھایا گیا ہے۔ موٹر کاروں اور برقی مشینوں میں خرابیاں پیدا ہونے کے اسباب اور ان کو درست کرنے کے طریقے نیز برقی قوت کے اثرات حتی الامکان وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ بجلی کا کام کرنے والے اصحاب علی کام کیساتھ اگر اس کتاب کو بھی پیش نظر رکھیں تو ان کو بہت کچھ فائدہ ہوگا۔

:

پتھر سے ہیرا

از ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔ تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$۔ حجم ۱۱۲ صفحات
ملنے کا پتہ:۔ منیجر "نظام المشائخ" پوسٹ بکس ۵۱۔ دہلی،

یہ ایک دلچسپ ناول ہے جسمیں دکھایا گیا ہے کہ کسطرح ایک غیر تربیت یافتہ، شریر و بدتمیز لڑکا صحیح تربیت ملنے پر مہذب، باتمیز اور نیک بن گیا۔ بیشک بچوں کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور صحیح اُصول پر بچوں کی تربیت اُسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ والدین اسکی اہمیت وحقیقت سے بخوبی واقف ہوں۔

مصنف کا یہ قول کہ یہ ایک بالکل سچا واقعہ ہے' ذرا غور طلب ہے۔ دنیا عالم امکان ہے اور اسی بنا پر عجیب سے عجیب واقعات کا رونما ہونا ممکن ہے، مگر اس ناول کے واقعات کچھ ایسے طلسمی طریقہ پر ظاہر ہوئے ہیں کہ بظاہر خیالی و قیاسی معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال واقعات اصلی ہوں یا فرضی' بہت دلچسپ ہیں' اور جس مقصد کو پیش نظر رکھکر یہ ناول مرتب کیا گیا ہے اُسمیں یہ کامیاب ہے۔

رسید کتب

جواہرات نثر۔ از مسٹر محمور اکبرآبادی۔ رام پرشاد اینڈ برادرس۔ چوک۔ آگرہ

ماں اور بچہ۔ از ڈاکٹر بردھ راج۔ قیمت عہ۔ میلارام روڈ۔ لاہور



پنڈت جواہر لال نہرو صدر منتخب
انڈین نیشنل کانگریس-لاہور



مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کا خیر مقدم[1]

از پنڈت آنند نراین مُلّا - ایم اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ

یہ کسکی زیارت کا ہمیں آج شرف ہے؟ تعظیم کو کسکے لئے آراستہ صف ہے؟
کیوں آج مرے لب پہ صداقت کا حلف ہے؟ کیا روئے سخن حضرتِ گاندھی کی طرف ہے؟
نکلیگی جو دل سے میں وہی بات کہونگا
آج اپنے تخیل سے ذرا کام نہ لونگا

اے طبع! تکلف ترا ابھنے کا نہیں آج انداز بیاں تیرا پنپنے کا نہیں آج
جز رنگِ صداقت کوئی جمنے کا نہیں آج مضموں کوئی الفاظ میں چھپنے کا نہیں آج
سب ساز الگ زینت تقریر کے رکھدیں
آج اپنے کلیجے کو فقط چیر کے رکھدیں

آمد ہے تری آج نشیمن میں ہمارے ہر چار طرف جشن ہے گلشن میں ہمارے
جو داغ تھے اب پھول ہیں دامن میں ہمارے انداز ترانہ کا ہے شیون میں ہمارے

[1] ہماری خوش نصیبی ہے اس ماہ اضلاعِ صوبہ متحدہ کو مہاتما گاندھی کے خیر مقدم کا اعزاز نصیب ہوا۔ چنانچہ اس شاندار دورہ کی یادگار اور اہل صوبہ کی دلی عقیدت کے اظہار میں یہ قابل قدر نظم ہدیۂ ناظرین زمانہ ہے جسے نوجوان شاعر نے اخلاص و احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے جس دلکش انداز میں اظہار خیالات کیا ہے اس سے اگر ایک طرف اہل صوبہ کے دلی جذبات کی ترجمانی کا حق ادا ہو گیا تو دوسری طرف مہاتما جی کی بلند پایہ شخصیت بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ آنند نراین صاحب مُلّا کے نظموں میں ندرت خیال اور دلکش انداز بیان دونوں کا لطف رہتا ہے مگر اس نظم میں تو آپنے واقعی کلیجے کو چیر کر رکھدیا ہے۔"

سینوں میں ہمارے ہے کبھی فخر کبھی شرم
گہ تیری طرف چشم ہے، گہ اپنی طرف چشم

لذت تری باتوں میں ہے صہبائے وطن کی ہونٹوں پہ ہنسی ہے گل رعنائے وطن کی
آنکھوں میں چمک ہے تری فردائے وطن کی تو ایک جھلک ہے رخ زیبائے وطن کی

ہستی پہ تری ناز ہو جتنا ہمیں کم ہے،
اس ملک کی قسمت ترے ماتھے پہ رقم ہے،

تو معنیٔ انساں ہے۔ جمعیت کی ہے تصویر تو شرح محبت کی، اخوت کی ہے تفسیر
اُمید گی اپنی تری ہمت پہ ہے تعمیر تو قوم کی تدبیر ہے۔ تو ملک کی تقدیر

آنکھوں میں نہاں ہیں ترے جلوے ابھی کچھ اور
برسے ہوئے بادل میں ہیں قطرے ابھی کچھ اور

اس خاک کو عزت ہے ترے نقش قدم سے صحرائے وطن رشک چمن ہو ترے دم سے
بڑھکر ترا رتبہ ہے کسی قیصر و جم سے تو اپنے لئے کیا ہے یہ پوچھے کوئی ہم سے

از تو ہمہ دیوانگی محفل ماہست
تو شیشہ و تو ساغر و تو بادہ و تو مست

یاروں کو ابھی خواہش انعام بہت ہے کم حب وطن ہے ہوس نام بہت ہے
دیوانگیِ عشق بدانجام بہت ہے شوریدگیِ ولولۂ خام بہت ہے

ہر لب پہ فقط اپنی ستایش کا سخن ہے
ہر پھول سمجھتا ہے وہی نازِ چمن ہے

تو نے یہ سبق خدمت قومی کا سکھایا جو لب سے کہا پہلے اُسے کرکے دکھایا
یوں عشق زبانی تو بہت سب نے جتایا پر وقت پڑا جب تو تو ہی سامنے آیا

تیرا سا ہمیں چاہنے والا نہ ملےگا،
ہمت کا دھنی، قول کا سچا نہ ملیگا،

تو مہر برستا رہا دشمن کی جفا پر صدمے ہوئے کیا کیا تجھے غیروں کی خطا پر
آیا نہ کبھی حرف تیرے صدق و صفا پر ہستی تری تفسیر ہے آئین وفا پر

تو اپنے عدو سے بھی کدورت نہیں رکھتا
پیمانۂ دل جز مئے الفت نہیں رکھتا

اک عمر وطن کے لئے قربان کی ساری　　اک زندگی انسان کی خدمت میں گذاری
پلہ ہے تری ذات سے اس ملک کا بھاری　　مغرب سے کوئی جاکے کہے بات ہماری

تہذیب میں تیری ہے بشر بھی کوئی ایسا!
ہے تیرے خزانہ میں گہر بھی کوئی ایسا!

کسی کی یاد

از سید مقبول حسین بی-اے. احمد پوری

آئی جو بہار گلستاں میں　　خاصیت نے ہوئی زباں میں
گلشن میں ہزار چہچہائی　　وجد آیا گلوں کو بوستاں میں
بلبل ہمہ تن ہوئی مخاطب　　یا محو تھی گل کی داستاں میں
پھولوں کی ادا نہ دل کو بھائی
ہمکو جو کسی کی یاد آئی

سینہ سے اک آہ ایسی نکلی　　پنہاں ہوئی جاکے آسماں میں
جی چاہا کہ پھول نوچ ڈالوں　　خنداں تھے جو دست باغباں میں
کچھ یاد نہ تھا کہ اُنکے دل کو　　ہیں پھول پسند کل جہاں میں
شوق اُنکا گلوں سے یاد آیا
آنکھوں سے وہ دست گل لگایا

مہرِ مادری

از منشی اقبال ورما سحرؔ ہتگامی

اے مہرِ مادری! طرب افروزِ جاں ہے تو
دنیائے دوں میں واقعی جنّت نشاں ہے تو
عالم کی پستیوں سے ملی برتری تجھے
جسکے تلے زمین نہیں وہ آسماں ہے تو
جس پر ادب سے آکے فرشتے بھی سر جھکائیں
اصلیتِ بشر کا وہ پاک آستاں ہے تو
ہے بسکہ تازہ نخلِ حیات اب بھی یاد سے
ہوتی نہیں جو خشک وہ جوئے رواں ہے تو
خوشبو مشامِ جاں میں ہے اب بھی بسی ہوئی
مصئون جو خزاں سے ہے وہ گلستاں ہے تو
ہے برقرار اب بھی وہی فیض گستری
معمور ہے جو لُٹ کے وہ گنجِ نہاں ہے تو
ہے بات ہی کچھ اور تصور کے کیف کی
بنتا ہے جو بگڑ کے وہ دلکش سماں ہے تو
جو دل ہے لازوال محبت کی یادگار
اے مہرِ مادری، اسی دل کا بیاں ہے تو
وہ زندگی ہے تیری جو قائم ہے موت سے
ایثار پر تُلی ہوئی ہر ہر زماں ہے تو
وسعت ہے تجھمیں کیا کہ تجھے خود خبر نہیں
کتنی نہاں ہے، ساتھ ہی کتنی عیاں ہے تو
کیوں اس انوکھے پن کے نہ قربان جائیے
ارزاں ہے گو کہ اصل میں جنسِ گراں ہے تو
دل تیری خوبیوں پہ نہ کیونکر نثار ہو
دلکش ہے، دلفریب ہے، اور دلستاں ہے تو

توصیف تیری ہو سکے کس سے جہان میں؟
دل میں زبان اور نہ دل ہے زبان میں!

پیشِ نظر جو ہوتا ہے عالم خیال کا،
ماضی میں پھر سماں نظر آتا ہے حال کا
آتا ہے اپنے سامنے ایک اسطرح کا وقت
رہتا نہیں ہے فرق جہاں ماہ و سال کا
اے مہرِ مادری! دلِ پُر شوق کے لئے
وہ وقت ہے ترے عملِ بے مثال کا
پھرتا ہے چشم میں وہ ترا منظرِ لطیف
ہو جسمیں کچھ اثر نہ زوال و کمال کا

ندہ اور گزشتہ زمانے ہیں ایک سے — اب تجھ سے بڑھ کے عکس ہو تیرے جمال کا
رہے گا اب جو مُدام اپنی روح کو، — وہ لطف افتراق میں ہے اِتّصال کا
ینوں سے جبیں زیادہ ہے دلکشی — یہ رنگ اصل میں ہے ہر امرِ محال کا
ستہ مصلحت سے ہی یوں حکم ایزدی — جبیں گزر ذرا بھی نہیں قیل وقال کا
مع اگر ہوں گوش تو قدرت کے ساز سے — شافی جواب ملتا ہے ہر ہر سوال کا
مہرِ مادری! غرض اب تیری یاد میں — ہوتا ہے جذب خاصۂ دل کے ملال کا
تیری غائبانہ تشفی کی برکتیں — پیدا الم میں کرتی ہیں لطف اعتدال کا
سحر اپنے اِس دلِ بیتاب کے لئے — صبر آفریں نظارہ ہے تیرے سال کا

ہاں وہ نظارہ ہے جو نہاں چشمِ عام سے
وابستہ ہے جو تیری بقائے دوام سے

زندگی

(از پنڈت چھوپتی صاحب - ایم - اے صادق)

چھتے ہیں موت سے کھو کر نشانِ زندگی — موت کیا ہے؟ نقش برآبِ روانِ زندگی
ہوتے راہِ اجل میں رہروانِ زندگی — ہے اجل دراصل سنگِ آستانِ زندگی
چمک تھی برق کی سی دم زدن کی بات تھی — مختصر کر دی اجل نے داستانِ زندگی
ت تو ہے ایک - یہ اثبات ہے اور وہ نفی — ہے یہی رازِ اجل اے رازدانِ زندگی

رہروانِ زندگی کا دیکھئے صادق سُراغ
تھی اجل گردِ غبارِ کاروانِ زندگی

رموزِ فطرت

(از مولانا محمود اسرائیلی)

رموزِ فطرت انساں کو بحرِ بیکراں پایا ابھی آنکھوں نے کیا دیکھا، ابھی ساحل کہاں پایا
بہت میخانۂ عالم میں کی پیمانہ گردانی کسی کو سرنگوں دیکھا، کسی کو خونچکاں پایا

بدی نیکی کا موجب، نیکیوں سے ہے بدی پیدا نہ کچھ ہستی بدی کی ہے، نہ کچھ معیار نیکی کا
مگر طرزِ عمل سے ذھن میں جو آگیا نقشا کہا نیکی کسی نے اسکو اور کوئی بدی سمجھا
رموزِ فطرت انساں کو بحرِ بیکراں پایا
کوئی قانون ملکی کے دلائل بحث میں لایا کہ جسکو صیقل آئینۂ اخلاق بتلایا
کسی کو کچھ نظر آیا، کسی کو کچھ نظر آیا نہ آیا جب سمجھ میں کچھ تو پھر ہر ایک شرمایا
ابھی آنکھوں نے کیا دیکھا ابھی ساحل کہاں پایا
بہت سے مسلوں میں گم ہے اب تک عقل انسانی ہیں اسکی آنکھ سے اوجھل تجلیات ربانی
کسی نے اس مئے رنگیں کی صورت تک نہ پہچانی دکھائی لاکھ گو خورشید بنکر اس نے تابانی
بہت میخانۂ عالم میں کی پیمانہ گردانی
ریاضِ دہر کی ہر شے میں اک رازِ نہاں پایا یہاں کے تخم کم مایہ میں عکسِ گلستاں پایا
ملا ماہر کوئی اسکا نہ کوئی رازداں پایا کسی کی طرزِ خاموشی میں اندازِ بیاں پایا
کسی کو سرنگوں دیکھا، کسی کو خونچکاں پایا

حُسن زار کشمیر کا ایک منظر

(از رضا صاحب مولوی محمود علی خاں الہ آبادی)

ملاحت اسقدر چہرے پہ ہے دریائے جہلم کے   چڑھائے ہیں ورق قدرت نے خود گویا کہ نیلم کے
بہار آئی ہے دریا پر بھی اک کیف جوانی ہے   کسی معصوم کے دل کی شفاف پانی ہے
ہر اک ساحل پہ اُسکے دورِ مستی کا زمانہ ہے   زباں پر مَوج کے جشنِ مسرت کا ترانہ ہے
کہیں پر مہ جبین یوں چُلبلے پن سے نہاتے ہیں   جبیں پر بھرکی گویا ستارے جگمگاتے ہیں
نہانے آئی ہیں دریا پہ وہ کشمیر کی پریاں   نگاہیں دیکھنے والونکی ہر سو ہو گئیں حیراں
وہ گورے گورے پنڈے اور گلابی رنگ چہرے کے   ہر اک کے حُسن گلگلوں پر ہزاروں حسن ہیں صدقے
شہابی رنگ چہرے کے ہیں اور لتے چمکتے ہیں   عبادتگہ میں گویا سُرخ انگارے دہکتے ہیں
چمک معصومیت کی ہے ہویدا چشم روشن سے   نکلتے ہیں ہزاروں نور عصمت اُنکے دامن سے
ہر اک کی چشم میگوں عیش و عشرت کی نشانی ہے   شباب حُسن میں مستور ہر اک کی جوانی ہے
رُخ رنگیں شباب حُسن سے اتنا چمکتا ہے   مے گلگوں کو گویا جام بلورین میں رکھا ہے
نشاں چہروں سے ہیں سب کے نمایاں شادمانی کے   نشیلی انکھڑیوں میں سُرخ ڈورے ہیں جوانی کے
رُخ و عارض ہیں رنگیں اور جوانی کا زمانہ ہے   سُنہرے قمقموں میں سُرخ بجلی کا خزانہ ہے
ترقی پر ہے اتنا حُسن ضو افگن جوانی کا،   ہوا ہے عکس سے رُخ کے گلابی رنگ پانی کا

اُدھر ہے چہرۂ گلگوں پہ سُرخی کی فراوانی   ادھر ہر اہل دل کا ہوتا جاتا ہے لہو پانی
نشاط رُوح کھنچکر آگئی ہے چشم اُلفت میں   سمٹ کر آگیا ہے حُسن کثرت حسن وحدت میں
یہ سب کچھ ہے مگر روحوں میں ہے پاکیزگی اتنی   نہ کانوں نے سُنی ابتک نہ آنکھوں نے کہیں دیکھی
پلٹ کر سب نے جو دیکھا تو یہ منظر نظر آیا   کسی کو اُن سبھوں نے اپنی جانب گھورتا پایا
ہوئیں خاموش سب اور ذوقِ راحت میں کمی آئی   نگہ نیچی ہوئی رنگین آنکھوں میں نمی آئی
حیا کی شمع جل اُٹھی حریم پاکبازی میں   چڑھے تیور ہزاروں بل پڑے چشم مجازی میں
نگہ خنجر لئے نکلی حریم دلربائی سے،   نکل کر خون دل کا کر دیا دست حنائی سے
ہوا کرتی تھی جنکو فتح بزم دلنوازی میں،   شکست اُنکو ہوئی آخر حریم پاکبازی میں
لباس زندگانی پہ نئی لیکر شکن اُٹھے   مے الفت کے پینے والے لب تشنہ وہیں اُٹھے

کلام جگر

از جناب جگر مرادآبادی

آوارۂ ہر نگاہ زجرم نگاہ کیست   دیدن گناہِ ماست ندیدن گناہ کیست
ہستی تمام مستی و مستی تمام کفر   دائم بجام و میکدہ کافر نگاہ کیست
دیوانہ وار جان بفشاندن گناہ ماست   بیگانہ وار رخ ننمودن گناہ کیست
ساقی بریز بادہ واز کیفِ سرمدی   آنہم یکے نگاہ کہ گویم نگاہ کیست
مستند اہلِ درد و نہ بنیند یک نفس   در دامنِ نسیم سحر خاکِ راہِ کیست
شغل گناہ کردن و رفتن گناہ ماست   ذوق گناہ دادن و دیدن گناہ کیست
مطرب بزن سرود و بانداز دلبری   ایں دشنہ باز خوان کہ نگاہم نگاہ کیست

صد نقش سجدہ تا در بتخانہ دیدہ ایم
انہم جگر اشارۂ طرفِ کلاہ کیست

حُسن سے بھی دلکو بے پروا کیا   کیا کیا اے عشق تونے کیا کیا
لاکھ چشم شوق سے پردا کیا   دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا
وہ بھی نکلی اک شعاعِ برقِ حُسن   میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا
لذتِ ناکامیابی الاماں   تونے ہر امروز کو فردا کیا
اُٹھتے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی   جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار
اس نے بھی اندازِ دل پیدا کیا

مباحثہ

(۱) ازمنۂ وسطیٰ کے معاشرتی و اقتصادی حالات

مکرمی ایڈیٹر صاحب "زمانہ"

"زمانہ" بابت مئی ۱۹۳۲ء میں میری کتاب "ازمنۂ وسطیٰ کے معاشرتی و اقتصادی حالات" پر پنڈت لکشمی کانت ترپاٹھی نے جو تبصرہ کیا ہے اُسپر میں کچھ اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں، اُمید کہ آپ مجھے اسکی اجازت دینگے۔

فاضل پنڈت صاحب کے قدر افزا ریمارکس کا میں شکر گزار اور اس توقع میں اُن سے پورے طور پر متفق ہوں کہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اُردو ہندی اور مسلم اور ہندؤں کے واسطے وطن مالوف کی ادبی خدمت کرنے کے لئے ایک عام پلیٹ فارم قائم کر دیگی۔ پنڈت صاحب موصوف ہندوستان کے وسطی زمانہ کے متعلق میری رائے سے متفق نہیں ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

"ہماری رائے میں اگرچہ عبد اللہ یوسف علی صاحب نے مہاراج ہرش کے دور سلطنت سے ازمنۂ وسطیٰ کا آغاز درست کیا ہے مگر اُسے زبردستی اور بلا کسی قابل اطمینان وجوہات بتلائے چودھویں صدی کے اختتام پر ختم کر دینے میں کچھ زیادتی کی ہے۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نے زمانۂ وسطیٰ کو چودھویں صدی کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں کیا ہے۔ کتاب مذکور الصدر کے صفحہ ۱۵ پر میں نے صاف لکھدیا ہے کہ زمانۂ وسطیٰ کا تیسرا دور ۱۳۱۰ء سے شروع ہوکر ۱۵۲۶ء تک جاتا ہے۔ صفحات ۵۸ تا ۱۶۱ پر میں نے ان وجوہات کا مفصل ذکر کیا ہے جن کی بناء پر میں ۶۴۷ء سے ۱۵۲۶ء تک کے زمانہ کو تاریخ ہند کا وسطی زمانہ سمجھتا ہوں، ہاں تیمور کے حملہ کو میں قطعی کسی نئے دور کا آغاز نہیں قرار دیتا لیکن بابر کی فتحیابی کے بعد سے یقینی طور پر وہ حالات پیدا ہونا شروع ہوگئے جن پر ہندوستان جدید کی بنیاد قائم ہوئی۔ عہد مغلیہ کے زمانہ سے ہندوستان کی اقتصادیات کا سلسلہ یورپ کی تجارت سے وابستہ ہوگیا اور اس سلسلہ نے ہندوستان کو دنیا بھر کی طاقتوں کے نرغہ میں پہنچا دیا جس سے ہمکو اسوقت بھی سابقہ پڑ رہا ہے، یہ بات یقیناً بحث طلب ہے کہ سلطنت مغلیہ درحقیقت وسطی زمانہ میں قائم ہوئی لیکن یہ امر مسلمہ ہے

کہ سلطنت مغلیہ کا آغاز تیمور کے حملہ سے نہیں ہوا۔

آخر میں مجھے اسقدر اور عرض کرنا ہے کہ میں اُردو میں تاریخی مسائل پر مباحثوں کو تہ دل سے پسند کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ بہت جلد ہماری زبان میں قابل قدر تاریخی لٹریچر پیدا ہو جائیگا۔ میں خود بھی ہندوستانی اکیڈمی کے لئے عہد برطانیہ میں ہندوستان کے اخلاقی، تمدنی، اقتصادی تحریکات پر ایک مفصل و مبسوط تاریخ لکھنے کے واسطے مسالہ جمع کر رہا ہوں۔

لندن ۲۴ ستمبر ۱۹۲۹ء

آپکا نیازمند
عبد اللہ یوسف علی

---

(۲) منشی نند لال گویاؔ

جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ زمانہ

زمانہ اپنی وسیع المشربی اور راست روی کے لئے محمود زمانہ ہے، اس نے اپنی مخلصانہ خاموش کوششوں سے جو وقعت و عزت حاصل کرلی ہے وہ ہندوستان کے کسی ادبی رسالہ کو حاصل نہیں ہے، میں طالب علمی کے زمانہ ہی سے بالاستعجاب اسکا مطالعہ کرتا اور اس سے فائدہ اُٹھاتا رہتا ہوں مگر اگست ۱۹۲۹ء کے رسالہ میں ایک مضمون دیکھکر بہت افسوس ہوا، کیونکہ اُسمیں ادنی تعصبانہ غیر تاریخی رویہ کو اختیار کیا گیا ہے جسے نہ آپ پسند کرتے ہیں اور نہ میں، اس مضمون سے میرا مقصد مسٹر ہری کرشن اسی، ٹی آر، اے، کا مضمون منشی نند لال گویا ہے، میرا تو خیال ہے کہ لائق مضمون نگار نے کامل فن گویا کے حالات کو اسقدر غلط طریقہ سے پیش کرکے خود اُنکے کلام کی عظمت کو صدمہ پہنچایا ہے، اگر فاضل مضمون نگار اپنی معلومات کے ماخذ ظاہر کر دیتے تو شاید تمام تر ذمہ داری اُن پر عائد نہ ہوتی، لیکن موجودہ حالت میں ہر دعویٰ کے ثبوت کا بار اُنکی گردن پر ہے۔ یہاں پر میں بعض بہت عام تاریخی غلطیوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ

" یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندو شعراء کسی طرح اپنے ہمعصر اسلامی شعراء سے کم نہ تھے۔ تذکرہ جات میں انکا نام نہ آنا اسلامی مصنفین کی دریا دلی کا ثبوت ہے "

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت سے ہندوؤں نے فارسی سیکھ کر اُسمیں شاعری شروع کی اُسوقت کے بعد سے فارسی کے جتنے تذکرہ ہندوستان میں لکھے گئے اُنمیں ہندو شعراء کا حال موجود ہے، اور یہ الزام بالکل بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر گویا کا حال کیوں نہیں ہے، تو اسکا جواب یہ ہے

کہ دنیائے ادب اُنکی شاعری سے سرے ہی سے واقف نہ تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان تو مسلمان خود دو مشہور ہندو تذکرہ نویسوں (بندرابن خوشگو اور لچھمی نرائن شفیق) نے بھی اپنے تذکروں میں گویا کا نام تک نہیں لیا ہے ہندو مصنفین کے اس بخل کو مسٹر کرشن کیا کہیں گے؟

اُسکا دوسرا دعویٰ کہ نند لال کا اورنگ زیب کے دربار سے تعلق تھا، اور وہ شہزادہ معظم کا اتالیق مقرر ہوا تھا، تاریخی حیثیت سے قابل قبول نہیں، اورنگ زیب اور اسکے بعد کی تاریخوں میں کہیں بھی اسکا نام نہیں آتا، اور مسٹر کرشن کو چاہئے کہ وہ اس کا ثبوت بہم پہونچائیں اور جب یہ ملازمت و اتالیقی کا واقعہ ہی غلط ہے تو اس کمزور بنیاد پر جو عمارت کھڑی کی گئی ہے، اُسکا جو حال ہوگا اسکا فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔

اورنگ زیب پر جو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اُسنے گویا سے کہا کہ وہ اسلام قبول کرلے، ورنہ قتل کردیا جائیگا، یہ تاریخی حیثیت سے مضحکہ خیز اور سرتاپا اختراع ہونے کے علاوہ اُصولاً غلط بھی ہے۔ اورنگ زیب کا ہندوؤں کے ساتھ جو رویہ رہا ہے اُسکو میں نے رقعات عالمگیر کے دیباچہ میں جو زیر طبع ہے، مفصل طور سے لکھا ہے، یہاں پر صرف اُسکے ایک حکم کی چند سطریں لکھتا ہوں، ایک سنی افسر نے اورنگ زیب کو لکھا تھا کہ اُسکے دو لون بخشی اثنا عشری ہیں اسلئے کم از کم ایک سنی رکھا جائے اورنگ زیب کے الفاظ یہ ہیں:-

"آنچہ از قدم خدمت خود نوشتہ بیان واقع است...... آنچہ از بد مذہب ایرانیاں نوشتہ امور دنیا را بامذہب چہ نسبت؟ وچہ کار ہائے مذہب را بتعصب چہ دخل؟ لکم دینکم ولی دین، اگر ہمیں قاعدہ مقرر می بود بائست کہ جمیع راجہا و تبعۂ آنہا را ست حل می کردیم، اینہا از تغیر کارِ بلاں نزد عقلا مذموم است" (احکام عالمگیری شائع کردہ سر جادو ناتھ سرکار طبع ثانی صفحہ ۹-۴۸)

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، گویا کے متعلق جو افسانہ لکھا گیا ہے، وہ سرتاپا مہمل اور صداقت سے دور معلوم ہوتا ہے۔

عالمگیر کا اصول تعلیم کے متعلق جو خیال تھا اُسکا بہترین ماخذ اُسکے وہ خطوط ہیں جو اُسنے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو لکھے ہیں، خیر اورنگ زیب کا اس سلسلہ میں جو خیال بھی ہو، یہاں پر میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسٹر کرشن نے ملا جیون اور اورنگ زیب کا جو مکالمہ لکھا ہے وہ بھی غیر تاریخی ہے، ملا جیون اورنگ زیب کے پاس پہلے پہل اُسوقت پہونچے ہیں جبکہ اُنکو بادشاہ ہوئے زمانہ گزر چکا تھا، اور بادشاہ ہونے کے بعد اُسنے اپنی عمر کے آخری زمانہ میں اُنسے تبرکاً استفادہ کیا تھا۔ اس لئے ملا جیون کا نام بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ برنیر نے اپنے سفرنامہ میں اورنگ زیب کی ایک ایسی تقریر نقل کی ہے مگر اُس نے اُستاد کا نام محمد صالح دیا ہے، مگر اورنگ زیب کے سب سے بڑے مورخ سر جادو ناتھ سرکار

سنے اس بیان کی تردید کر دی ہے،

اب رہی گویا کی شاعری، اسکے متعلق میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ اُنکا کلام مغلیہ عہد کے کسی ہندوستانی فارسی گو شاعر کے کلام سے کسی صورت سے کم نہیں ہے،

مجھے افسوس ہے کہ میں سنے اس عریضہ کے ذریعہ ناظرین کا قیمتی وقت ضائع کیا، لیکن مجھے زمانہ اور اسکی پالیسی سے جو محبت ہے وہ مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ زمانہ کے دامنِ اوصاف کو اِن بدنما داغوں سے خراب نہ ہونے دیں۔

خادم نجیب اشرف ندوی

تصاویر

اس نمبر میں ہم یورپین مصوری کا ایک اور نمونہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جسمیں مزدوروں و سرمایہ داروں کے باہمی کشمکش کا ایک مؤثر مرقع کھینچا گیا ہے۔ یہ تصویر مسٹر ہیوبرٹ فان ہرکومر کے کمال فن کا نمونہ ہے۔ آئے دن کی ہڑتالوں میں غریب مزدوروں کی جو حالت ہوجاتی ہے وہ اس تصویر سے بخوبی آئینہ ہے۔ غریب مزدور اور اسکے اہل و عیال فاقہ کشی سے پریشان ہیں۔ اسکی بیوی اپنے معصوم بچے کو گود میں لئے ہوئے افسردہ دلی اور مایوسی کی تصویر بنی ہوئی اپنے شوہر کے کندھے پر ہاتھ ڈالے کھڑی ہوئی ہے۔ اسی کے برابر اسکی لڑکی بھی ہے جو بیچارہ پریشان معلوم ہوتی ہے مزدور کے بشرے سے غم و غصہ کے آثار نمایاں ہیں وہ ایک دماغی کشمکش میں بھی مبتلا معلوم ہوتا ہے۔ ایکطرف اُسے سرمایہ داروں کی خود غرضی و بیدردی پر غصہ ہے تو دوسری طرف اسکے اہل و عیال کی خستہ حالی اسے شاق گزر رہی ہے۔ کھانے پینے کا کیا ذکر پائپ میں تمباکو تک نہیں موجود ہے، تاکہ اسی کے دو چار کش سے دل بہلا سکے غرضکہ ہر طرح سے عسرت و بے سروسامانی ہی نظر آرہی ہے۔ خودداری کا تقاضہ ہے کہ اپنی جماعت کے ساتھ رہے۔ خانگی ضروریات ہڑتال سے کنارہ کش ہونیکو مجبور کر رہی ہیں۔ تصویر میں چابکدست مصور نے اس کشمکش کا پورا خاکہ کھینچکر رکھدیا ہے۔ ہرکومر کو اس قسم کی مصوری میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ غربا کی حالت کا نقشہ کھینچنے میں اُسے کمال حاصل ہے۔

[illegible]

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو آیندہ لاہور اجلاس نیشنل کانگریس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے ہیں، مہاتما گاندھی پچھلے دو ماہ سے ہمارے صوبہ میں دورہ فرما رہے ہیں۔ اس دورہ کی یادگار میں انکی یہ تازہ ترین تصویر ہدیہ ناظرین ہوتی ہے، آپ باتفاق رائے آیندہ لاہور کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے مگر آپنے اس اہم ذمہداری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی جگہ پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو کانگریس کی صدارت کے لئے پیش کیا چنانچہ آیندہ اجلاس کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال صاحب ہی منتخب ہوئے ہیں۔

افغانستان میں جو انقلابات عظیم رونما ہو رہے ہیں انکے سلسلے میں بچہ سقہ اور نادر خاں کی تصویریں شائع ہو چکی ہیں، "بچہ سقہ" تو جو اُدہم مچا رکھا تھا وہ شاہ نادر خاں کی بدولت ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا ہے، جو لوگ شاہ امان اللہ کے واپسی کے خواستگار تھے انھیں نادر خاں کی موجودہ طرز عمل سے مایوسی ہوئی لیکن بحالات موجودہ جنرل موصوف نے بادشاہی کی ذمہ داری قبول کرکے افغانستان کو کم سے کم بچہ سقہ کی بے سروپا حکومت سے تو نجات دلائی۔ دوسرے رخ میں ۱۸۰۰ء سے لیکر ابتک جتنے حکمراں ہوئے ہیں ان سب کی تصویریں موجود ہیں۔

معشوق کی نیرنگی و کج ادائی سے

کشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے   اور زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

شاہدِ فطرت

جوشِ بہار سے

مرغِ بسمل کی طرح رقص کرینگے طاؤس   چار دن اور اگر ابر گلستاں نہ گیا

اوس پڑنے سے پھول اور نکھرتے ہیں سے

ہوئے فصلِ گل بھڑکا رہی ہے آتشِ گل کو   چمن میں کر رہا ہے کارِ روغن آبِ شبنم کا

مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ سے

ہر ستارے سے لڑی آنکھ ہر اک گل سونگھا   تھا تماشہ جو کچھ اس ارض و سما کا دیکھا

رعنائیٔ بہار سے

بہار آئی ہے عالم میں گل و نسرین و سوسن پر   جوانانِ چمن نازاں ہیں اپنے اپنے جوبن پر

اقلیمِ چمن سے

حکمرانی پہ ہوا میل سلیمانِ بہار   عشق پیچاں بن گیا طغرائے فرمانِ بہار

زلفِ سنبل کو سمجھئے گوشِ گل کو جانئے   نرگسِ شہلا کو کہئے چشمِ فتانِ بہار

چاکِ پیراہن ہر اک گل کا بعینہ زخم ہے   کھیت ہے تلوار کا یارب کہ میدانِ بہار

آبجو بیں ہیں صفائے سینۂ اشراقیاں   ہر گل خوشبو ہے افلاطونِ یونانِ بہار

رنگ میرا اور تیرا دیکھ کر حیراں ہوئے   نقشبندانِ خزاں و نقشبندانِ بہار

بہارِ صحرا سے

شمعِ مینا سے ہو ساقی شہر میں بھی روشنی   لالہ نے روشن کئے کوہ و بیاباں میں چراغ

پھولوں کے درختوں پر نرم و باریک مٹی چھان کر چڑھائی جاتی ہے۔ آتش نے اس کا مشاہدہ کیا اور رنگِ تغزل میں اس طرح بیان کیا سے

غنچہ ہنوز شگفتہ نہ چھوڑیں جو باغباں   تیرے قدم کے نیچے کی لے دو نہالِ خاک

بہار کی کیف انگیزی سے

گل ہوتے ہیں بہارِ چمن سے چراغِ عقل   کام آستیں کا کرتی ہے گو آستیں نہیں

مرغانِ چمن کی زمزمہ سنجی سے

مرغِ چمن ہوں زمزمہ پیرا بہار میں   ہنگامہ گرم شیفتۂ رنگ و بو کریں

ہمت عشق

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

آہ! بے وفا حسن

ہم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے چلئے سدھاریے

سزائے محبت

تیغ ابرو سے مجھے قتل کیا قاتل نے
وہ سزا دی جو محبت کے گنہگار کی تھی

دہائی ہے

اشتیاق وصلت میں جان لب تک آئی ہے
عشق نے ستایا ہے حسن کی دہائی ہے

عشق کامل

عشق کامل ہے سبب حسن سے یکرنگی کا
شمع و پروانہ کا جل جانے میں اک مذہب ہے

حسن تکلف سے بری ہے

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

معشوق کی ادائے شرم قاتل ہے

رہ گئے مشتاق طالب جلوۂ دیدار کے
مار ڈالا اس پری پیکر نے جھرمٹ مار کے

عشق میں ہمدرد کی آرزو

ہرچند حالت دل ناگفتنی تھی لیکن
رو کر کہا کچھ اس سے جو اہل درد پایا

عشق سب کچھ ہے

داغ دل زخم جگر ہے نعمت الوان عشق
سیر اپنی جان سے ہو جاتے ہیں مہمان عشق

حق یہی مذہب ہے باطل ہے جو ہے اسکے خلاف
مرد مومن ہے وہی لایا ہے جو ایمان عشق

تولتے ہیں موتیوں میں اشک حسن یار کو
دونوں آنکھیں اپنی ہیں دو پلۂ میزان عشق

ارغوانی اشک ہیں تو زعفرانی رنگ ہے
اپنی خاطر ہے مہیا آج کل سامان عشق

قطع ہو جاتے ہیں دنیا کے تعلق یک قلم
چھٹ گیا وہ ہو گیا جو قیدی زندان عشق

دو جہاں میں اس سے آتش کوئی شے بہتر نہیں
وصف جو کچھ کیجئے اعلیٰ ہے اس سے شان عشق

ادا و ناز کے بغیر حسن میں کچھ کمال نہیں

ادا و ناز نہیں جس میں وہ خوش جمال نہیں
ہوئی جو چاند سی صورت تو کچھ کمال نہیں

حیرت آنکھوں کو ہے نظاروں میں اس محبوب کے ۔۔۔ یہ نہیں کھلتا کہ کشتہ دل ہے کس انداز کا

نازک مزاج معشوق سے بناوٹ کی صورت نظر نہیں آتی ؎

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے ۔۔۔ دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

معشوق کے کوچے تک رسائی تمام حسرتوں سے بے نیاز کر دیتی ہے ؎

اے مراد دل ترے کوچے میں قدم رکھتے ہی تھا ۔۔۔ حسرتیں جو کچھ کہ تھیں خواب پریشاں ہو گئیں

معشوق کی رنگین ادائی ؎

پسے دل اسکی چتون پر ہزاروں ۔۔۔ ہوئے بے ساختہ پن پر ہزاروں

معشوق صرف عاشق کی ضد سے غیر پہ مہربان ہو جاتا ہے ؎

مری ضد سے ہوا ہے مہرباں دوست ۔۔۔ مرے احساں ہیں دشمن پر ہزاروں

عاشق کو لالے کا پھول بھی معشوق کا شہید معلوم ہوتا ہے ؎

تیرے خونی کفنوں کی یہ ادا رکھتے ہیں ۔۔۔ پھول لالے کے لباس شہدا رکھتے ہیں

معشوق کے نقش قدم کی رعنائی ؎

سر کون سا ہے جس میں کہ سودا نہیں ترا ۔۔۔ ہوتی ہیں تیرے نقش قدم کی زیارتیں

معشوق کی ایک شوخ ادا ؎

کہتا ہے وہ شوخ آئینے میں عکس سے آتش ۔۔۔ تم ہم سے زیادہ ہو تو ہم تم سے زیادہ

اثر حسن ؎

حسن وہ فتنے ہے کہ پتھر میں بھی کرتا ہے اثر ۔۔۔ چشم عاشق کی طرح آئینے حیراں ہو گئے

معشوق کی جامہ زیبی ؎

موسم گل کر دیا اُنکی قبائے سرخ نے ۔۔۔ چاک تا دامن ہزاروں ہی گریباں ہو گئے

عشق کی سرمستی ؎

کوچۂ یار میں چلئے تو غزلخواں چلئے ۔۔۔ بلبل مست کی صورت سے گلستاں چلئے

معشوق کا حسن عالمتاب ؎

تم اندھیری رات میں اُٹھو جو چہرے سے نقاب ۔۔۔ روئے رشک مہر ذروں کو جگا دے خواب سے

عاشق کی نگاہ حسرت ؎

حال دل ہوتا ہے حسرت کی نگاہوں سے عیاں ۔۔۔ میری اُسکی گفتگو میں اب زباں خاموش ہے

پھر اسے ادھر زلفوں کے پیچ و خم خیالات میں انتشار پیدا کر رہے ہیں ادھر جمال رخ جاذب نظر ہے اس تضادِ کشش کا لازمی نتیجہ جنون ہے۔ علاوہ بریں یہ مسلمات شاعری میں ہے کہ معشوق کی زلف جنوں زا ہوتی ہے ؎

مصور کو تری تصویر کا سودا مبارک ہو — مقام گیسوئے مشکین و زلف عنبریں آیا

حسن کی نظروں میں عشق ایک ناقابل معافی جرم ہے ؎

حسن کس روز ہم سے صاف ہوا — گنہ عشق کب معاف ہوا

زلف کا مضمون بہت پامال ہے مگر دیکھئے اس مطلع کے انداز بیان نے کیا مزہ بھرا ہے ؎

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا — جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

ناکامیٔ عشق ؎

کہوں کیا ہوئی عمر کیونکر بسر — میں جاگا کیا بخت سویا کیا

افسانۂ حسن کی دلکشی ؎

پردہائے گوش تک سننے کو آجاتی ہے جاں — کس قدر دلچسپ حسنِ یار کا افسانہ تھا

زبان تیر میں دل میں نہ معلوم کیا کیا "مسودے" ہوتے ہیں مگر معشوق کے سامنے ہونٹوں پر مہر سکوت لگ جاتی ہے اور بعد کو پچھتاوا ہوتا ہے کہ ہائے حال دل کیوں نہ کہا ؎

کہے جاتے وہ سنتے یا نہ سنتے — زباں تک حال دل آیا تو ہوتا

رشک ؎

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری — خط دیا لیکن نہ بتلایا نشان کوئے دوست

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

تفتیش جو کرتے ہیں مری حالت دل کی، — در پردہ پتہ پوچھتے ہیں تیرے مکاں کا

انتہائے عشق میں صبر ناممکن ہے ؎

انتہائے شوق ہے اب صبر کی طاقت کہاں — ابتدائے عشق میں چندے تامل ہو گیا

معشوق شوخ و شنگ و بیداد گر ہو طبیعت اور زیادہ ٹوٹ کر آتی ہے ؎

محبت میں مزہ ملتا ہے ایذائیں اٹھانے سے — اسی کو ہم نے چاہا جو حسیں بیداد گر دیکھا

وقت نظارہ فرطِ حیرت سے یہ انداز مشکل ہو جاتا ہے کہ دل معشوق کی کس ادائے خاص کا کشتہ ہے ؎

کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا   ں سے میں نہ پوچھا دلِ شکستہ کا

گریباں چاک کرنا علامت عشق و جنون ہے ۔ یہ مضمون بہت پامال ہے مگر ایسے دلکش پیرایہ میں نظم ہوا ہے کہ شعر میں نہ معلوم کتنے ضمنی لطائف پیدا ہو گئے ہیں، تشریح میں طوالت ہے صاحبان ذوق لطف اُٹھائیں ؎

کیا یہ اُس کو کسی محبوب کا دامن سمجھا   چھوڑتا میرے گریباں کو نہیں دست جنوں

شاعروں نے معشوق کی آنکھوں کو قاتل اور لبوں کو زندہ کرنے والا باندھا ہے، آتش نے دونوں کی متحدہ کیفیت دکھا کر عجب دلکشی پیدا کی ہے حیات و مرگ اپنا اپنا کام کر رہے ہیں، اور عاشق دونوں کی لذتیں ایک ساتھ لوٹ رہا ہے ؎۔

لب جاں بخش دکھایا کئے اعجاز اپنا   کام کرتی رہی وہ چشم فسوں ساز اپنا

عاشق خوف و رسوائی سے راز محبت کو چھپانے کی کوشش میں ضبط آہ و نالہ کرتا ہے مگر لوگ اسکی خاموشی سے تاڑ جاتے ہیں ؎

پاسِ رسوائی نے ہمکو اور رسوا کر دیا   آہ و نالے سوا چرچا خموشی کا ہوا

عشق وہ بلائے بے درماں ہے کہ معشوق کا التفات، بے التفاتی سے زیادہ باعث آزار ہے ؎

خم شمشیر معشوقوں کا توڑا ناہے گردن کا   تواضع دشمن جاں کی زیادہ قتل کرتی ہے

ابروئے معشوق کی تشبیہ مہ نو سے عام ہے مگر انداز بیان نے عجب گل کھلائے ہیں ؎

مہ نو نے ترے ابرو کا کیا خم پیدا   آسماں شوق سے تلواروں کا منھ برسائے

معشوق کا ایک نظر دیکھ لینا عاشق کے لئے سامان صد نشاط ہے ؎

آنکھ اُٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا   بھر گیا دامن نظارہ گل نرگس سے

عشق کی ایذا طلبی مشہور ہے مگر دوسروں کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا ۔ ؎

زبان خار صحرا کو نہ صدمہ تشنہ کامی کا   بلا سے مجھ کو ایذا ہو پر اے جوش جنوں پہنچے

معشوق سے چھیڑ چھاڑ ؎

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا   گئے منھ پر بھی چڑھ جانے دیتے دیتے گالیاں کتنا .

مندرجہ ذیل شعر میں لفظ مقام اس خوبی سے صرف ہوا ہے کہ تعریف ناممکن ہے ایک اور بات دیکھنے کی یہ ہے کہ دوسرا مصرع توالی اضافت کے سبب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیخودی اپنا رنگ جما رہی ہے۔ قائل بھی منصور کی طرح آپے سے باہر ہو گیا ہے اور دوسرا مصرع جھوم جھوم کر [illegible] لیکر

۵۔ سادگی و بے ساختگی۔ ۶۔ جدت ادا۔

۷۔ الفاظ کا فصیح و برمحل استعمال ۸۔ الفاظ کا مجموعی توازن

معنوی خوبیوں کا انحصار ان باتوں پر ہے:۔

۱۔ ندرت خیال ۲۔ لطافت احساس

۳۔ قوت مشاہدہ ۴۔ صدق اظہار

ظاہری اور معنوی خوبیاں مل کر شعر میں سادگی و اصلیت کے ساتھ جوش و خروش یا سوز و گداز یا شان محاکات پیدا کر دیتی ہیں۔ ایسا شاعر کبھی تو جذبات حسن و عشق کی مصوری کرتا ہے کبھی اسرار و معارف بیان کرتا ہے کبھی تصوف و فلسفہ و نفسیات و مابعد الطبیعیات کے دقیق ترین مسائل باتوں باتوں میں حل کر دیتا ہے اور سامع مجبور ہوتا ہے کہ اُسکے قول کو باور کرے حالانکہ بخلاف دیگر لوگوں کے وہ کوئی سند یا دلیل اپنے دعوے کے ثبوت میں نہیں پیش کرتا۔ وہ پند و نصیحت بھی کرتا ہے تو ایسے الفاظ میں جو دل پر اثر کرتے ہیں اور واعظ کی گفتگو کی طرح تلخ و ناگوار نہیں ہوتے۔

غزل کے موضوعات | شاعری خصوصاً غزل کے مضامین چار بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں،

۱۔ حسن و عشق ۲۔ حقائق و معارف

۳۔ اخلاق و موعظہ ۴۔ تصوف

اب میں آتش کے کلام سے ہر قسم کے منتخب اشعار ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتا ہوں۔

حسن و عشق | مضامین حسن و عشق کی گوناگونی و بوقلمونی کی حد و نہایت نہیں ہے۔ وسیع مشرب شاعر کی نظر میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ حسن و عشق سے لبریز ہے۔ یہاں صرف ایسے شعر درج ہونگے جن میں حسن و عشق کا مجازی پہلو نمایاں ہے یا فطرت کی مصوری ہے حسن مطلق اور عشق مطلق کا بیان تصوف کے تحت میں ہوگا۔

محفل محبوب میں عاشق کی باریابی عید سے کم نہیں مگر وہاں کثیر مجمع ہے۔ عاشق اس سوچ میں ہے کہ ایسی جگہ بیٹھے جہاں سے معشوق کا دیدار اچھی طرح نصیب ہو اور شاید گفتگو کا بھی موقع مل جائے، بیچارہ اسی اُدھیڑ بُن میں رہتا ہے کہ محفل برخاست ہو جاتی ہے۔ اتنے بڑے خیال کو جس میں تازگی بھی ہے چند الفاظ میں اور کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے ‏ میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

عاشق کے دلِ شکستہ کی ناقدری مشہور ہے۔ خریدنا تو در کنار کوئی مول بھی نہیں پوچھتا ؎

ہیں ع۔ کس حال نیست صوفیِٔ عالی مقام را۔ فلسفی کا بھی یہی مقصود ہے۔ مگر وہ بجائے ذوق وجدان کے زیادہ تر دماغ سے کام لیتا ہے۔ زیادہ تر میں نے اس وجہ سے کہا کہ بغیر ذوق کی رہبری اور قوت متخیلہ کی اعانت کے وہ بھی بہت دور نہیں چل سکتا۔

آتش کی شاعری اُسکے کردار کا مرقع ہے۔ وہ ایک بانکا سپاہی تھا توکل وقناعت اُسکا مذہب تھا اہل دنیا کی تعریف اور اُنکی صحبت سے اُسکو نفرت تھی' انسان اور مناظر قدرت کا اُسنے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا' مکان ایسی جگہ واقع تھا کہ ایک طرف آبادی اور دوسری طرف جنگل۔ جیسا تذکرہ "آب حیات" میں درج ہے' ویرانوں اور شہر کے باہر جنگلوں میں اکثر پھرتا اور دل بہلاتا تھا۔ ان سب اُمور نے ملکر اُسکی شاعری میں عجب لذت وکیفیت پیدا کر دی ہے۔ اُسکے اشعار میں وہی سرور ونزہت ہے جو جنگل کی مست ہواؤں میں' وہی روانی ہے جو بہتے دریاؤں میں' وہی موسیقی ہے جو ستاروں کی چشمک اور کل نظام فطرت میں ہے' وہ ایک آزاد شاعر تھا جو شعر کہتے وقت (باستثنا اُن حالتوں کے جب اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کرنا ہوتا تھا) یہ بھول جاتا تھا کہ اُسکا مذہب کیا ہے۔

عمل شاعری | شاعری کے اصلی اجزا دو ہیں۔ تخیل اور اسلوب بیان۔ کیا کہا اور کن الفاظ میں کہا۔ آتش نے عمل شاعری کی مکمل تعریف ان دو اشعار میں کی ہے ؎

فکر رنگیں کام اُس پر کرتی ہے پرواز کا | کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکہ خیال
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا | بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں

شعر کو ایک مرصع کار زیور سے مثال دی ہے۔ اس زیور کا خاکہ خیال نے تیار کیا۔ فکر رنگیں نے اسکے نقش ونگار ترتیب دیئے پھر زیور کو جلا دی اور یہ طے کیا کہ اس زیور میں کون کون جواہر کہاں کہاں جڑے جائینگے' قد کیا ہو گا رنگ کیا ہونا چاہیے۔ خیال نے ایک صورت اختیار کر لی حدیں مقرر ہو گئیں' اب طبیعت نے الفاظ کے نگینے نصب کرنے شروع کئے اور شعر عالم ظہور میں آیا اگر نگوں (الفاظ) کے انتخاب اور اُنکی ترتیب میں سلیقہ نہیں برتا گیا یا خود زیور کا خاکہ (تخیل) خوبصورت نہیں ہے تو اہل نظر اُسے صناعی کا اعلیٰ نمونہ قرار نہ دینگے اور ایسے زیور کی قدر نہ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ شعر میں تخیل اور اسلوب بیان دونوں اہمیت رکھتے ہیں۔ دونوں نہ صرف خوبصورت ہوں بلکہ انمیں توازن وتناسب بھی لازم ہے۔

شعر کی ظاہری ومعنوی خوبیاں | شعر کی ظاہری خوبیوں کا مدار مندرجۂ ذیل اُمور پر ہے۔

۱- سلاست وروانی
۲- انتخاب الفاظ
۳- ترتیب ونشست الفاظ
۴- حسن ترکیب

زمانہ

ایڈیٹر دیا نراین نگم بی۔اے

جلد ۵۳	نومبر ۱۹۲۹ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

تصاویر:- (۱) شاہان افغانستان
(۲) سر سنکرن نائر چیرمین انڈین سنٹرل کمیٹی

۱- آتش کے کلام پر تبصرہ
از مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی۔اے - - - - ۲۸۱

۲- باغ آرزو
از ابو الفاضل راز چاندپوری - - - - - ۲۹۲

۳- مد و جزر عرفان
از مسٹر رگھوپت سہائے فراق بی۔اے - - - - ۲۹۳

۴- علمی خبریں اور نوٹ
- - - - - - - - - - ۲۹۵

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ۴ر

فی پرچہ

قیمت ممالک غیر سے سالانہ ... ششماہی ... ہندوستان کیلئے ششماہی ...

وھیلر کمپنی کے ریلوے بک اسٹالوں میں زمانہ مل سکتا ہے

گلہائے بہار کی تازگی اور طائروں کے چہچہے سے

رنگ لائی چہرۂ گل پر نسیم نو بہار — اپنی اپنی زمزمہ سنج چمن گانے لگے

موسم بہار کی مستی۔ پہلے شعر کی محاکات اور دوسرے کی تشبیہ قابل داد ہے سے

(۱) چمن کی سیر پہ ہوتا ہے جھگڑا — کہ میسری ہے دست باغباں ہے

(۲) باغ میں دکھلا رہی ہے اپنی نیرنگی بہار — کثرت گل سے جو بوٹا ہے دم طاؤس ہے

بہار کا میخانہ سے

سبوئے غنچہ ہے معمور جام گل لبریز — ٹپک رہی ہے شراب ابر نو بہاری سے

کاروان بہار سے

صدا جرس کی ہے غنچوں کے کھلنے سے آتی — روانہ نکہت گل کا ہے کارواں ہوتا

بہار کی آتش افروزی سے

بہار لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن میں — گریباں پھاڑ کر چل بیٹھئے صحرا کے دامن میں

آمد بہار سے

چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے — رت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے

بہار آئی مراد چمن خدا نے دی — شگفتہ غنچے ہوئے بوئے گل صبا نے دی

بہار گلستان کی ہے آمد آمد — خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

بہار آئی ہے دیوانے وجد کرتے ہیں — سرود کی ہے صدا غلغلہ سلاسل کا

اسی سلسلہ میں نامناسب نہ ہوگا اگر آتش کے "خمریات" درج کر دیئے جائیں۔ شراب اور جنّت میں خاص ربط ہے،

خمریات | شکرانہ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش — لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

آتش مست جو مل جائے تو اُس سے پوچھوں — تو نے کیفیت اُٹھالی ہے خرابات میں کیا

ہے سیہ مستی میں اپنی عالم دیوانگی — حلقۂ چشم پری خط ہے ہمارے جام کا

بوٹے[1] رکھتی ہے اس میکدے میں کیفیت — محتسب توڑ کے شیشے کو پشیماں ہوگا

لے لیا شکر کر کے ساقی سے — دُرد اس میں ہوا کہ صاف ہوا

صوفی ہیں دور جام ہے جوشِ شراب ہے — خرقے ہیں اور داغ مئے لالہ رنگ کا

ساقی نہ قطع سلسلۂ دور جام ہو — مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا

---

[1] بوٹے یہاں چھوٹے درخت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ساقیا تعریف تیرے میکدے کی کیا کروں،
ساتھ کیفیت کے تھا لبریز جو پیمانہ تھا

شیشہ خالی ہوا ساقی کہ مرا دم نکلا
روح مستانہ ہے مینا ئے مئے ناب میں بند

کیا ہے کس نے طریق سلوک سے آگاہ
مرید کسکا ہے پیر مغاں نہیں معلوم،

وہ بادہ کش ہوں میری آواز پاکو سنکر
شیشوں نے سر حضور ساغر جھکا دیے ہیں

ملی ہے ہم کو بھی خمخانۂ افلاک میں راحت
سرہانے ہاتھ رکھکر سوئے ہیں زیر سبو برسوں

ساقیٔ میکدہ نے مجھ کو یہ خدمت دی ہے
نشے میں مست جو گرتا ہے اُٹھا تا ہوں میں

ایسی پلا کہ بے خبری ہووے ساقیا،
اب تک تو امتیاز ہے دُرد و زلال میں

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

ابرو دریا پار آپہنچا قریب میکدہ،
ناخدائے کشتیٔ مے ساقیٔ گلفام ہو،

ہمارے حلقے میں کرتا ہے شیشہ دل خالی
ہمارے دور میں لبریز جام ہوتا ہے

گل ہر اک ساغر بکف بلبل ہر اک نغمہ طراز
سیر باغ آتش مجھے ایک نائے و نوش ہے

شغل میخواری چمن میں چل کے آتش کیجیے
فرش سبزے کا لب جو ہے ہوائے ابر ہے

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

پھراتا ہے عبث واعظ سراپا بک کے رندوں سے
تکلف برطرف یاں لا ابالی کارخانہ ہے

اللہ رے تکلف ساقی بہار میں
مے کی گلابیاں ہیں مرصع کے کام کی

بہار آئی چھکا ساقی شراب روح پرور سے
خزاں کا غم بھلا دے بادۂ گلگوں کے ساغر سے

فصل گل ہے شیشہ و پیمانہ کا ہے دور دور
خانقاہیں بند ہیں میخانہ کا در باز ہے

اُتار اُتار نا ساقی جو شیشہ طاق سے ہے
لبوں پر آئی مری جان اشتیاق سے ہے

اب کی بہار میں تو مجھے پار اُتار دے
کشتیٔ مے دو آبۂ اُمید و بیم سے

بہار باغ ایمائے شراب ارغوانی ہے
تسلسل خواہ دور جام دور آسمانی ہے

ساقیا گردش ساغر میں تامل کیا ہے
خم و خمخانہ ہے باقی مے و مینا باقی،

شیشے شراب کے رہیں آٹھوں پہر کھلے
ایسا گھرے کہ پھر نہ کبھی ابر تر کھلے

ساقی زلال و دُرد جو توفیق ہو سو دے
مستوں کو تیرے ہوش کہاں امتیاز کا،

ساقی ہوں تیس روز سے مشتاق دید کا
دکھلا دے جام مے میں مجھے چاند عید کا

عید کا روز ہے مسکین ہیں فطرہ لیتے
خیر خم ہم کو بھی ساقی کوئی ساغر ملتا

ساقی حدیث اُسکو سمجھتے ہیں تیرے مست | پیر مغاں کے منہ سے جو ارشاد ہو گیا،
ساقی کی نگاہوں نے مرے ہوش اُڑائے | آنکھوں سے دیا جام مئے بے خبری کا
اک جام میں کھلتا ہے طلسمات جہاں کا | مستی میں کسے مرتبۂ جم نہیں ہوتا
شیشے میں ہے جو روشنیٔ بادۂ گلگوں | فانوس میں یہ شمع کا عالم نہیں ہوتا
مگر اسکو فریب نرگس مستانہ آتا ہے | اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے | خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

حقائق و معارف | بالفاظ حضرت سہیل۔

"یہی مقام شاعری کی معراج ہے۔ اگر ایک شاعر عالم رنگ و بو سے گزر کر فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ، مذہب کے اسرار و رموز، اور مراحل سلوک و عرفاں کی کیفیات مجردہ اسی ترنم اسی جدت بیاں اور اُسی حسن مصوری کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اسکی شاعری سحر سے گزر کر اعجاز بن جاتی ہے، اس طرح کے شاعر کے لئے بصیرت، تاثر، اور قوت بیان تینوں کا اجتماع ضروری ہے یعنی ایکطرف تو قوت مشاہدہ اتنی تیز ہونی چاہئے کہ نہایت دقیق نکتوں تک پہنچ سکے دوسری جانب احساس اتنا لطیف ہونا چاہئے کہ وہ غیر مادی حقائق سے بھی لذت اندوز ہو سکتا ہو اور ان دونوں مراحل کے بعد قوت بیان ایسی ہونی چاہئے کہ عرفان و ذوق کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر ایک نئے انداز کے ساتھ شعر کے نغمۂ موزوں میں کھینچ کر دوسروں کو بھی لذت اندوز کر سکے تو یہ ایک باکمال شاعر ہے"

"یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ نظم و شعر کا جو فرق ہے وہ یہاں بھی قائم رہتا ہے، نازک سے نازک نکتۂ حکمت اور لطیف سے لطیف سر معرفت کو محض خشک طریقہ پر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ فلسفہ و حکمت یا نفسیات و تصوف کی مصطلحات کا بے ضرورت بار بار اعادہ بھی شعر میں یہ کیفیتیں پیدا نہیں کر سکتا بلکہ کمال شاعری یہ ہے کہ حقائق و معارف کو گل و بلبل کی زبان اور بادہ و ساغر کے رنگ میں پیش کیا جائے۔"

آتش کے بعض اشعار میں جو درج ہو چکے اسرار کی پردہ کشائی اور معارف کی ترجمانی موجود ہے۔ یہاں کچھ اور اضافہ کئے جاتے ہیں۔ بعض حضرات شاید اسکے موید ہونگے کہ مسائل تصوف کا تذکرہ بھی اسی عنوان کے تحت ہونا چاہئے تھا۔ مینے ایک علیحدہ عنوان رکھا ہے۔ کیونکہ آتش کے کلام میں تصوف اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ لکھنؤ کے شعراء میں وہ تنہا اس رنگ میں کہنے والا تھا۔

عالم کسی مصور کامل کا بنایا ہوا مرقع ہے ؎

بے مثل ہے یکتا ہے جو تصویر ہے اسکی   کھینچا ہوا کس کا یہ مرقع ہے جہاں کا

اس محنت آباد میں جہاں میں کوئی دم کی راحت بھی غنیمت ہے ؎

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں   غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

انسان کی خاص شان امتیاز قوت نطق ہے ؎

آدمی کیا وہ نہ سمجھے جو سخن کی قدر کو   نطق نے حیواں سے مشت خاک کو انساں کیا

انسان کو اپنے معائب پر مشکل سے آگاہی ہوتی ہے ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا   کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

فطرتِ فیاض نے قارون کی کایا پلٹ دی ؎

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف   قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

جسکے پاس جاہ و دولت کا سامان نہو اُسکا دل غنی رہتا ہے ؎

عقل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ مال و زر   ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

بیاض فطرت کے مطالعہ سے عقل کی جلا ہوتی ہے ؎

نہ کرتی عقل اگر ہفت آسماں کی سیر   کوئی یہ سات ورق کا رسالہ کیا کرتا

انسان خاک ہے اور خاک میں مل جائیگا ؎

پیام مرگ سے ہوتی ہے غمگیں روح کس خاطر   ملیگا خاک میں وہ جو ہوا ہے خاک سے پیدا

نیاریوں سے سبق حاصل کرنا ؎

ہنر سے نیاریوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہمکو   مقدر میں جو دولت ہو تو زر ہو خاک سے پیدا

انسان باوجود اسقدر علم کے جاہل ہے ؎

خبر اوّل و آخر نہیں مطلق آتش   نہ تو انجام ہے معلوم نہ آغاز اپنا

دوستوں کی دشمنی کے بعد دشمن کی عداوت کا گلہ بیکار ہے ؎

دوستوں سے اسقدر صدمے ہوئے ہیں جان پر   دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

کسی بات کا خلاف توقع ثابت ہونا ؎

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا   جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

فلسفۂ نماز ؎

رتبۂ موسیٰ نماز پنجگانہ نے دیا   پانچ وقت اللہ سے موقع رہا تقریر کا

دنیا میں ایک کی خوشی دوسرے کا غم ہے لہذا خدا کی کریمی پر کوئی الزام نہیں آتا بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو جسکا مستحق تھا اُسکو وہی ملا ؎

کریمی میں تری شک ہو جسے وہ کافر ہے، مجھے ملول تو دشمن کو میرے شاد کیا،

خدا کی نعمتیں بے انتہا ہیں مگر سب سے بہتر درون صاف و اعتقاد پاک ہیں ؎

کروں میں شکر الٰہی کہاں تلک آتش درون صاف دیا پاک اعتقاد کیا

چشم بینا و دل آگاہ عطایائے الٰہی ہیں انکے ہوتے انسان کو اور کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی ؎

چشم بینا بھی عطا کی دل آگہ بھی دیا میرے اللہ نے مجھ پر کیئے احساں کیا کیا

جہاں رنگا رنگ ایک چمن ہے، جسم قفس ہے، آنکھیں چاک قفس، مگر اس طرح چمن کی سیر کا لطف کیا۔ اصلی سیر اُسوقت ہوگی جب روح آزاد اور فضائے قدس میں بال افشاں ہوگی ؎

دکھائی آنکھوں نے سیر جہان رنگا رنگ قفس کے چاکوں سے مجھکو چمن نظر آیا

طاعت پر مغرور رہنا چاہیئے ؎

اسقدر نازاں نہو اے شیخ اپنے زہد پر بندگی کرنے سے تو شاید خدا ہو جائے گا

تقلید عیب ہے ؎

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اُسکا دہن بگڑا

عالم کی زینت حسن سے ہے۔ اس شعر میں حسن وجمال کا فرق معنی دیکھنے کے قابل ہے کیونکر مانوں کہ آتش کم استعداد تھا۔ حسن کا درجہ جمال سے کم ہے۔ شعر میں صنعت لف ونشر مرتب ہے حسن کو شب ماہتاب کی خنک روشنی اور جمال کو آفتاب کے خیرہ کرنے والے نور کے لیے مخصوص کیا ہے ؎

حسن وجمال سے ہے زمانے میں روشنی شب ماہتاب کی ہے تو روز آفتاب کا

اہل دل کو اختلاف مذاہب کی پروا نہیں ہوتی ؎

رند مشرب ہوں مجھ کو کیا ہووے مذہبوں میں جو اختلاف ہوا،

عالم کون و فساد خود دلیل قیامت ہے ؎

بنیاد فساد ہے یہ آغاز سے اسکی، انجام قیامت ہے جہاں گزراں کا

تدبیر کا کمال یہ ہے کہ تقدیر کا منشا ٹوٹ جائے ؎

اے پیر عقل پھر نہیں آتش ترا مرید تقدیر کے خلاف جو تدبیر سے ہوا،

اعتدال عناصر میں اختلال اجزائے حیات کے منتشر ہونے کا پیش خیمہ ہے ؎

وہی ہے لوح شکست طلسم جسم آتش — جب اعتدال عناصر میں اختلال ہوا

انسان کو مصیبت میں بھی خوش رہنا چاہیئے ؎

شادمانی مینے کی غم جسقدر افزوں ہوا ، — بادۂ گلرنگ اُسے سمجھا اگر دل خوں ہوا

سارے جھگڑے انسان کی زندگی تک ہیں ؎

زندگی تک ہیں قیامت کے یہ دھڑکے سالے — مجھ کو کیا غم ہے اگر حشر ہوا میرے بعد

ہر انسان اپنی جگہ بادشاہ ہے ؎

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں — حواس خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں

الفقر فخری ؎

نقیر بنکے قدم اسمیں مار اے آتش، — طریق احمدؐ مرسل ہے شاہراہ نہیں،

آزادی ؎

بلند و پست سکندوش کو برابر ہے ، — نسیم بے سر و پا کا کہیں مقام نہیں

جبر و اختیار ؎

اختیاری حرکت جان نہ مجبوروں کی — لئے جاتی ہے جدھر ہمکو قضا جاتے ہیں

مشاہدۂ مناظر قدرت کی تلقین ؎

صبح نزدیک ہے بیدار ہو مل لے غافل، — زہرہ و مشتری و ماہ و سہا جاتے ہیں،

حصول مدعا بے ترک مدعا ممکن نہیں ؎

پاؤں کو منزل مقصود میں مضطر سمجھے — طاقت اُٹھنے کی اگر دست دعا رکھتے ہیں

انسان کی تعمیر میں خرابی مضمر ہے ؎

دوست ہی جب دشمن جاں ہو تو کیا معلوم ہو — آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو

خوشی و غم عارضی ہیں ؎

غم و شادی کی حالت دیکھا عالم کے مرقع میں — کوئی تصویر روتی ہے کوئی تصویر ہنستی ہے

انسان رفتہ رفتہ غلامی کا خوگر ہو جاتا ہے ؎

کیا مزہ کالبد خاک میں اے روح ملا ؛ — اب نکلتی ہی نہیں یا تو وہ بیزاری تھی ؛

احکام قضا و قدر نہ جاننے ہی میں سعادت ہے ؎

مطالب نہ سر نوشت کا سمجھا تو شکر کر — دیوانہ ہو جو حال قضا و قدر کھلے

سبحہ و زنار دونوں ڈھکوسلے ہیں ؎

قول اپنا ہے یہ سبحہ و زنار کے لئے
دو پھندے ہیں یہ کافر و دیندار کے لئے

انسان سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے ؎

نہ بوریا بھی میسر ہوا بچھانے کو
ہمیشہ خواب ہی دیکھا کئے چھپر کھٹ کا

آدمی کو سوچ سمجھکر بات کرنا چاہئے ؎

یہ صدا آتی ہے خوشی سے
منھ سے نکلی ہوئی پرائی بات

ہمت مرداں مدد خدا ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے،

نیکی و بدی دونوں انسان کے خمیر میں ہیں ؎

نفس شقی بھی روح کے ہمراہ تن میں ہے
یوسف کے ساتھ گرگ بھی اس پیرہن میں ہے

حسن عمل کا مدعا دنیا نہیں بلکہ عقبیٰ ہونا چاہئے ؎

چاہتا ہوں واسطے عقبیٰ کے میں حسن عمل
کسکو آتش دولت دنیائے دوں درکار ہے

فلسفۂ طہارت ؎

چاہے صفا تو ساتھ طہارت کے ذکر کر،
پرہیز کر تو تجھکو دوا کا اثر ملے

اہل ہنر بہت ہیں ہنر کے قدردان کم ہیں ؎

قابل گوش سیکڑوں گوہر
گوش بھی قابل گہر ہے شرط

ابر نیساں کے کرم سے در یکتا لاکھوں
گوش تو کوئی سزاوار گہر پیدا ہو

رت دنیا ناپائیداری دنیا

ان خیالات کو آتش نے سو طرح نظم کیا ہے اور ہر شعر کا انداز بیان جدید و پر لطف ہے۔ طرز معاشرت و نظام حکومت میں آتش کے وقت سے بہت تغیر ہو گیا ہے شخصی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا بردستوں کو زیردست آزاری کی اسقدر آزادی نہیں رہی تاہم ایسے شعر اب بھی سبق آموز ہیں اور انسان کو بتلائے عیش و عشرت ہونے اور مغرور و خود پسند بننے سے روکتے ہیں۔

دنیا عبرت سرا ہے ؎

کون سے دن نئی قبریں نہیں اس میں بنتیں
یہ خرابہ وہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

غربت وطن سے بہتر ہے ؎

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر،
مجھکو غربت وطن سے بہتر ہے،

انسان غم اُٹھانے کو خلق ہوا ہے ؎

روز مولود سے ساتھ اپنے ہوا غم پیدا   لالہ ساں داغ اُٹھانے کو ہوئے ہم پیدا

گردش قسمت کی ایک عجیب و غریب مثال ؎

ایک جا شل در غلطاں کہیں ٹھہرانہ پاؤں   اختر اقبال ہوں میں گردش ایام کا

بہار و خزاں دونوں قابل عبرت ہیں ؎

ناگفتنی ہے حال بہار و خزان باغ   اک زخم ہے کہ خشک ہوا اور نم ہوا

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَار ! ؎

مدفوں ہیں اس زمیں میں ہزاروں ہی شہریار   بجھتا ہے تخت شاہ سر بادشاہ پر

ہماری غفلت کا یہ عالم ہے ؎

یاد رکھنے کی جگہ ہے یہ طلسم حیرت   صبح کو بھول گئے دیکھتے ہی شام کو ہم

عیش دنیا دو روزہ ہے ؎

دو روزہ ہے یہ لطف عیش و نشاط دنیا   بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں

خاک دراصل پیراہن پر نہیں بلکہ پیراہن کے نیچے ہے ؎

ہمیشہ جھاڑتے ہیں گرد پیرہن غافل   نہیں سمجھتے کہ ہے زیر پیرہن مٹی،

معاذ اللہ ! ؎

عطر کیا ملتا ہے غافل آخر کار ایک دن   بوئے آب سدرہ و کافور پیراہن میں ہے،

اُف بیکسی و غریب الوطنی ! ؎

تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے   کون آشنا ہے حال ہے کس کو پکارئے

اب یہ عالم بیکسی ہے ؎

برق چمکی تو سر فراز کیا   ابر آیا تو مہربانی کی،

زندگی اسقدر بے ثبات ہے کہ ؎

تکیہ میاں آدمی کو لازم کفن سے ہے رکھنا   بیٹھا رہے مسافر رخت سفر سنبھالے

دنیا سے نفرت کا عجیب پیرایہ میں اظہار ؎

تِلوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں کہیں   دھبا مٹے زمیں کے نشیب و فراز کا،

عالم ہستی کی مثال بھول بھلیّوں سے ؎

عجیب بھول بھلیاں ہے عالم ہستی — جسے کہ راہ ہوئی اس سے خوب ہی بھٹکا

دنیا کی طلب ہمت مردانہ کے خلاف ہے ؎

طلب دنیا کی کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی — خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

بے ثباتیٔ دنیا ؎

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا — مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

سرکشوں کا انجام ؎

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے — زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے نہ تھے

درموعظ | **صبر و رضا ؎**

شکستہ دل ہو انساں عوض ہر شئے کا ملتا ہے — ہوا فرزند اگر تو داغ دل نعم البدل پایا

انسان کو آرام طلب ہونا چاہئے ؎

غضب ہے منزل ہستی میں آسائش طلب ہونا — ہجوم خواب سے رہرو نے ہے آخر خلل پایا

دشمن کی طرف سے بھی دل میں غبار نہ رکھنا چاہئے ؎

ناقص ہے دوستداری میں کامل نہیں ہے تو — دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا

ہر دلعزیز بننے کی تعلیم ؎

شاہراہ ہستیٔ موہوم میں وہ راہ چل — اپنی آنکھوں کو بچھا دیں دوست دشمن زیرپا

استغنا ؎

سند شاہی کی حسرت ہم فقیروں کو نہیں — فرش ہے گھر میں ہمارے چادر مہتاب کا

سختیٔ ایام ہے میرے لئے سامان عیش — خشت بالیں کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

بسر ہو جائیگی کمل کے سائے میں فقیروں کی — مبارک اہل دولت کو ہو نگیرہ تمامی کا

نہ خوف دزد نہ ہے بیم حاکم ظالم — ہزار شکر کہ ہم سیم و زر نہیں رکھتے

قناعت

جو قناعت کے مزے سے آشنا ہو جائیگا — بھیک کا کاسہ اُسے دست دعا ہو جائیگا

دنیا سے بے نیاز قناعت نے کر دیا — اکسیر کا جو کام تھا اکسیر سے ہوا

جو کہ شاکر ہوا مقدر پر — خط پیشانی کا پڑھا مطلب

کنج عزلت میں قناعت کی دو نان خشک پر — نعمتیں دنیا کی جو کچھ تھیں مہیا ہو گئیں

باغ جہاں میں گُل کی قناعت ہے جائے رشک عمر دو روزہ ایک قبا میں تمام کی،

توکل سے

تباہی میں ہے لازم یاد حق اہل توکل کو، خدا پر چھوڑتا ہے ناخدا کشتی کو طوفاں میں
آتش جو چاہے پائے توکل کو محکمی، جو صبح کو ملے نہ رہے شام کے لئے
کرم حق سے ہے گلزار توکل سرسبز کٹ کے دریا سے مرے باغ میں جو آتی ہے

عظمت فقر سے

گلدستہ بنکے رونق بزم شہاں ہوا کوڑا جو اس فقیر کے تکیے سے جھڑ گیا
ہے سزاوار اہل دولت سے فقیروں کا غرور ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پاؤں کو پھیلائیگا
مرد فقیر ایذا دیتے نہیں کسی کو ؁ میں ذکر ارہ زیر شاخ شجر نہ کرتا
داغ دل کی روشنی ہے بوریائے فقر پر شیر کی چربی سے جلتا ہے نیستاں میں چراغ
پیدا ہوا ہے اپنے لئے بوریائے فقر یہ نیستان ہی شیر ہیں اس نیستاں میں ہم
مرد فقیر حق حق کرتے ہیں بوریئے پر شیر اپنے نیستاں میں آتش ڈکارتے ہیں
روندتا ہوں سبزۂ رہ کی طرح وہ بوٹیاں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جنکو کیمیا گر سیکڑوں
فقیری کا ترے کوچے کی جنکے سر کو سودا ہے پروں کا تکیہ وہ سمجھے ہوئے ہیں خشت بالیں کو
نعمت فقر ہے موجود جسے رغبت ہو، آب شیریں میں ہے نان نمکیں تھوڑی سی
نعمت فقر سے محظوظ ہوا ہوں ایسا خشک کرکے اُنھیں کھاؤں جو ملیں تر ٹکڑے
کسی کو ملک دیا ہے کسی کو مال دیا ؁ فقیر ہوں مجھے اللہ نے ہے حال دیا

غیرت سے

اے آفتاب محشر آنکھوں سے گر گیا تو منھ پھیرتا جدھر سے پھر منھ اُدھر نہ کرتا

قول مرداں جان دارد سے

وعدہ جھوٹا نہ کرو مرد نہیں ؁ قول سے فعل جب خلاف ہوا ؁

انکسار سے

وہ دہن ہوں نہ نکلا حرف غرور، وہ زباں ہوں نہ جس سے لاف ہوا

خاکساری سے

نہ رکھی دولت دنیا کی خواہش خاکساری نے خدا نے کر دیا حاکم مجھے اکسیر اعظم کا،

سرکشی نے پائی آتش خاکساری سے شکست
نفل سے اللہ کے توڑا بہت پندار کو،

محبت سے بنالیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

کہاں ہوئی ابھی معراج خاکساری کی ؎
ہنوز کاسۂ سر اپنا پائمال نہیں

تعلیم حق پرستی ؎

خیال تن پرستی چھوڑ فکر حق پرستی کر ؎
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

ترک لذت ؎

لذت کو ترک کر تو ہو دنیا کا رنج دور،
پرہیز بھی دوا ہے جو بیمار نے کیا

کسی کا انفعال گوارا نہیں ؎

گر کسی نے کیا تھر تھرایا دل اپنا
عرق عرق ہوئے ہم جسکو انفعال ہوا

طنز انگیز گفتگو سے احتراز چاہیئے ؎

میں کنایہ کی کسی سے گفتگو کرتا نہیں
ناگوار آتش ہے سُننا حرف طنز انگیز کا

ترک سوال ؎

التجا ہے یہی زباں سے مجھے ؎ ؎
گوش سے ہو نہ آشنا مطلب کو

تواضع ؎

دشمن بھی ہو تو دوستی سے پیش آئیں ہم
بیگانگی سے اپنا نہیں آشنا مزاج

عزلت گزینی ؎

اس قلزم ہستی میں ہیں وہ گوشہ نشیں ہم،
دن رات رہا مثل حباب اپنا مکاں بند

دروازہ بند رکھتے ہیں مثل حباب بحر،
قفل دروں خانہ ہیں اپنے مکاں میں ہم

زر، زمین، زن، فساد کی جڑ ہیں ؎

اپنے فعلوں سے تعجب ہے نہ دے جو فساد،
زن سے مطلب ہے زمیں سے مدعا زر سے غرض

مغرور خدا سے بیگانہ رہتا ہے ؎

در کریم نہیں سیر گاہ مغروراں
نہ آئے یاں وہ نہ جو سوال سے واقف

تعلیم ہمت ؎

ہمت پس از فنا سبب ذکر خیر ہے،
مردوں کا نام سنتے ہیں ہر داستاں میں ہم

یکرنگی ؎

نیرنگ روزگار سے ایمن ہیں مثل سرو — رکھتے ہیں ایک حال بہار و خزاں میں ہم
موج نسیم ہوں چمن روزگار میں — گل سے بناؤ ہے نہ مجھے خار سے بگاڑ

ہر قدم راہ خدا میں اُٹھنا چاہیئے ؎
حیف ہے راہ خدا میں نہ ہو ان سے کوشش — دست قدرت نے بنائے نہیں بیکار قدم

تم کسی کو ایذا نہ دو کوئی تمھیں بھی ایذا نہ دیگا ؎
جو نہ دے ایذا کوئی ایذا نہیں دیتا اسے — سایۂ دیوار کو اندیشۂ عامل کہاں

دلِ اہل صفا میں فریب کو دخل نہیں ؎
فریب کو دل اہل صفا میں راہ نہیں — وہ دشت ہے یہ جہاں آب زیرکاہ نہیں

صفائے دل اور چیز ہے ؎
اک قلندر کی پسند آئی مجھے کتنی یہ بات — چار ابرو کی صفا سے دل صفا ہوتا نہیں

کدورت نفاق کی جڑ ہے ؎
دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں — سارے نفاق گبر و مسلماں سے دور ہوں

بے تعلقی ؎
نہ تو دشمن کوئی میرا نہ کوئی میرا دوست — بار خاطر نہ کسی کا نہ غبار دامن

ہمت مردانہ ؎
ہمت مردانہ نے آتشؔ کیا ہے بے نیاز — جانتا ہوں میں گدا سلطان ہفت اقلیم کو

کسی کا دل رنجیدہ نہ کرنا چاہیئے ؎
حرمت کعبہ طریق صاحب اسلام ہے — چاہیئے رنجیدہ کافر کا بھی تجھ سے دل نہ ہو

صبر و تحمل ؎
کوہ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی — ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

غیبت اپنا شیوہ نہیں ؎
اہل اسلام ہوں غیبت نہیں شیوا میرا — میرے دشمن کو مرے عیب عیاں کرنے دو

اہل ہنر کی قدر ؎
دوست رکھتے ہیں جواں مرد اہل جوہر یار کو — تول کر زر سے سپاہی لیتے ہیں تلوار کو

مردانگی ؎

قدم مردانگی کے ساتھ مارا دستداری میں کیا ہشیار غافل پا کے اکثر ہم نے دشمن کو

حسینوں اور تاجداروں کو ایک ساتھ نصیحت ؎

دو روزہ نوجوانی ہے دو روزہ تاجداری ہے مروّت حسن کو اللہ دے انصاف سلطاں کو

مصیبت کے بعد راحت ہے ؎

ناگوارا جو کرتا ہے گوارا انساں، زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے،

جوانی میں خدا کی یاد ؎

خدا کی یاد جوانی میں غافلو کر لو وگرنہ وقت فضیلت تمام ہوتا ہے

خود مصیبت اٹھائے مگر کسی کا دل نہ دکھائے ؎

تیرہ و تار جہاں ہو دل روشن ٹوٹے، خاطر دوست نہ یاں خاطر دشمن ٹوٹے

پاس وضع ؎

خلاف وضع ہے انسان کے واسطے معیوب بدن کی زیب نہ ہووے کبھی قبا اُلٹی

اب ملاقات ہوئی ہے تو ملاقات رہے نہ ملاقات تھی جبتک کہ ملاقات نہ تھی

صفائے قلب ؎

حالت آئینہ رکھتا ہے صفا سے دل مرا آشنا سے آشنا بیگانہ سے بیگانہ ہے،

تصوف | تصوف کا اصلی مایہ خمیر عشق حقیقی ہے جو سرتاپا جذبہ اور جوش ہے اور وحدت وجود کا مسئلہ بادۂ تصوف کا نشہ ہے۔ آتش نے اس مسئلہ کو مختلف ودلکش پہلوؤں سے نظم کیا ہے ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا

انسان حباب کی طرح بحر بیکران حقیقت کا ایک قطرہ ہے جسے ہوائے نمود نے بحر سے علیٰحدہ کردیا ہے یہ جدائی عارضی و ظاہری ہے جہاں یہ طلسم ہستی حباب کی طرح ٹوٹا قطرہ دریا سے مل گیا۔ عارف جانتا ہے کہ یہ ہستی جو باعث جدائی ہے فانی و ناپائیدار ہے اور بہت جلد ختم ہو جائیگی مگر مبدء حقیقی سے یہ چند روزہ مفارقت بھی ناگوار ہے۔

موجودات عالم میں ہر شئے ایک آئینہ اور عالم بحیثیت مجموعی آئینہ خانہ ہے جسمیں ہر طرف صورتیں ہی صورتیں نظر آتی ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صورتگری کیوں ہے وحدت میں کثرت کیسی، آتش کہتے ہیں کہ یہ حسن سرمدی کی خود نمائیاں ہیں۔ دہر کو اس لئے آئینہ خانہ بنایا ہے کہ اپنے جلوے دیکھے۔ بقول صوفیہ کثرت تکرار وحدت ہے۔ عالم میں ہزاروں لاکھوں مختلف چیزیں جو نظر آتی ہیں وحدت محض ہے جو مکرر ہونیکی وجہ سے

متعدد معلوم ہوتی ہیں جس طرح دس۔ سو۔ ہزار۔ لاکھ۔ کروڑ دیکھنے میں کثیر ہیں لیکن حقیقت میں وہی ایک کا عدد ہے جو ہزار لاکھ کروڑ بنجاتا ہے حالانکہ اکائیوں کے سوا اسمیں اور کوئی چیز شامل نہیں ؎

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو		کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

ان آئینوں میں سب سے زیادہ متجلی دل ہے جسے عشق نے صیقل کیا ہے اور چونکہ حسن نے خود اپنے جلوے دیکھنے کو شمع ظہور روشن کی ہے اور اس شوق خود بینی میں عشق مضمر ہے لہذا صرف دل کا آئینہ وہ آئینہ ہے جسمیں حسن مطلق کو اپنی خود نمائیوں کے تمام کرشمے منعکس نظر آتے ہیں۔ خود بینی و خود نمائی کا نازک فرق غور کے قابل ہے۔ خود بینی میں محض نظارہ ہے اور خود نمائی میں خود بینی کے تاثرات مشاہدہ کا انعکاس و انتقال بھی شامل ہے چونکہ دل ایک بے حس آئینہ نہیں ہے بلکہ اسمیں جذب و اضطراب موجود ہے۔ لہذا حسن کے جلوؤں کا انعکاس جن رعنائیوں کے ساتھ دل میں ہوتا ہے اور کسی شئے میں نہیں ہو سکتا لفظ پاک بھی خاص اہمیت رکھتا ہے، اس نے دل سے لوث و خودی و آلودگی کو خارج کر دیا۔ اب شعر ملاحظہ ہو ؎

دل اپنا آئینے سے صاف عشق پاک رکھتا ہو		تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا

اسی خیال کو دوسری جگہ اس طرح نظم کیا ہے ؎

آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا		چہرۂ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جو تھا،

جب انسان میں ملکۂ جذب و تصوّر قوی ہو جاتا ہے تو حجابات تعین اُٹھ جاتے ہیں اور ہر شئے میں حقیقت رونما ہوتی ہے اُسی کے ساتھ عارف پر وجد طاری ہوتا ہے اور اسرار و معارف کے سرچشمے اُبلنے لگتے ہیں۔ اشعار ذیل کا محض انداز بیان اس کیفیت کا آئینہ ہے اور بعض میں مسئلہ وحدت وجود کے مختلف رخ نمایاں کئے ہیں ؎

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا		ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُسکا،
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش		بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُسکا
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی		جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُسکا ؎

؎ فرید الدین عطار علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

تاب در زلف و وسمہ بر ابرو		سرمہ در چشم و غازہ بر رخسار
رنگ در آب و آب در یاقوت		بوئے در مشک و مشک در تاتار

دل قصر شہنشہ ہے وہ شوخ اسمیں شہنشاہ | عرصہ یہ دو عالم کا جلوہ خانہ ہے اُسکا
وہ یاد ہے اُسکی کہ بھلا دے دو جہاں کو | حالت جو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُسکا
یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے | قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُسکا
آوارگی نکہت گل ہے یہ اشارہ | جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اُسکا
یہ حال ہوا اُسکے فقیروں سے ہویدا | آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اُسکا
شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش | لبریزئ شوق سے پیمانہ ہے اُسکا

جب تک انسان قید ہستی میں ہے کامل قرب روحانی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ خود ہستی ایک حجاب ہے

نکل لے جان تن سے تا وصال یار حاصل ہو | چمن کی سیر ہے انجام بلبل کی رہائی کا

قرب خدا ایک سخت منزل ہے انسان جبتک اپنے آپ کو فنا نہ کر دے مقصود تک رسائی ناممکن ہے۔ فنا سے مُراد فنائے جسم نہیں ہے بلکہ ترک خواہشات و لذات و نفیٔ خودی ؎

برنگ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں | تو اُس نے منزل مقصود کو زیر قدم پایا

معرفت سے مراد دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے، معرفت خدا کو بے دلیل کے پہچاننا ہے حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے کہ خدا کو میں نے خدا ہی سے پہچانا اور ماسوائے خدا کو اُسکے نور سے ؎

آتش۔ نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں | صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم پایا

ہر شئے کا وہی مرکز اور ہر شئے کو اُسی یوسف کی تلاش ہے جسکو ہمارے خواب ہستی نے گم کر دیا ہے ؎

یوسف کی جستجو میں روانہ ہیں قافلے | نالاں جرس سے ہے شور ہر کوس رحیل کا

اصطلاح صوفیہ میں عرفان کا ایک درجہ اُنس و ہیبت ہے اسی کو بالفاظ دیگر قہر و لطف کہتے ہیں۔ اُنس میں تجلی کا تقاضا جمال کے ساتھ ہوتا ہے، اور ہیبت میں جلال کے ساتھ۔ اس منزل میں عارف نہ صرف طرح طرح کے مصائب خوشی خوشی برداشت کرتا ہے بلکہ ہجوم آفات و بلا کا متمنی و متقاضی رہتا ہے ؎

تیر باران بلا سے ہو گئی کشت اپنی سبز | رہ گیا دہقاں دعائے ابر رحمت مانگتا

اسی باغ عرفاں کی اسطرح مصوری کی ہے ؎

پھول جو ہے اپنے گلشن کا سپر کا پھول ہے | ہر شجر اس باغ میں لاتا ہے پھل تلوار کا

معرفت کا ایک درجہ صحو و سکر ہے جب طالب کو تصور محبوب میں اپنی ذات اور کل کائنات سے بیخبری ہو جاتی ہے ؎

کچھ نظر آتا نہیں اُسکے تصور کے سوا | حسرت دیدار نے آنکھوں کو اندھا کر دیا

یہ تصور رفتہ رفتہ ماسوا کو فنا کر دیتا ہے ؎

تصور ہر نفس ہے پیش چشم اُس رخ روشن کا — نگہباں برق کو میں نے کیا ہے اپنے خرمن کا،

اسکے بعد تصور کے نقوش بھی محو ہو جاتے ہیں ؎

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے — جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے

راہ سلوک کی بے نظیر مصوّری ؎

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی، — ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی،

طریق سلوک میں منزل سکوت کو تکلم پر فضیلت ہے۔اس خیال کو استعارہ کے پردے میں یوں ادا کیا ہے ؎

آشنا گوش سے اُس گل کے سخن ہے کسکا — کچھ زباں سے کہے کوئی یہ دہن ہے کسکا

اصطلاح صوفیہ میں خرابات مقام فنا کو کہتے ہیں ؎

آتش مست جو مل جائے تو اُس سے پوچھوں — تو نے کیفیت اُٹھائی ہے خرابات میں کیا

مل جائے کی بلاغت پر غور کیجئے۔ فنا ترک تعلقات دنیوی اور غلبۂ جلال خداوندی سے دین و دنیا کو فراموش کر دیتا ہے۔ یہ فنا عین عرفان ہے اور حضوری کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ اپنے سے غیبت حق سے حضوری اور حق سے حضوری اپنے سے غیبت ہے۔

دل عارف ایسی تجلیات کا مظہر ہوتا ہے کہ اُسکا مقابلہ تو ایک طرف خورشید قیامت اُسکے ایک داغ کی ہمسری نہیں کر سکتا حالانکہ ازل سے یہ اہتمام ہے کہ خورشید کو روز ایک خلعت نور ملتا ہے (استعارہ غروب کے بعد طلوع ہونے سے ہے) تاکہ حشر تک فراوانیٔ نور درجۂ کمال کو پہنچ جائے۔ مزید احتیاط یہ برتی گئی ہے کہ حشر کے دن آفتاب کا رُخ بھی اہل محشر کی طرف پھیر دیا جائیگا اور سوا نیزہ پر قائم ہوگا تاہم داغ دل عاشق کے مقابل بے نور نظر آئیگا۔ شاید ہی اس سے بہتر طریقہ عظمت عشق بیان کرنیکا ہو سکے یہ مبالغہ نہیں سراسر حقیقت ہے اور پہلے مصرع کے استفہام نے شعر کو غزل کا شعر اور راز و نیاز کا مرقع بنا دیا ہے ؎

کس کے داغ دل سے محشر میں ملایا جائیگا — روز اک خورشید کو ملتا ہے خلعت نور کا

تصوف میں مسئلہ رویت مختلف فیہ ہے ایک جماعت کا عقیدہ ہے کہ حشر کے دن دیدار خدا نصیب ہوگا۔ دوسری جماعت اسکی منکر ہے۔ آتش کا خیال بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو کہ اُسکا دیدار دراصل اُسکی معرفت ہے دل سے، آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں ؎

بوئے گل آتش کہیں ہوتی ہے محسوس نظر	افزا ہے روز محشر یار کے دیدار کا،

پہلے مصرع کی نزاکت و بلاغت یادگار ہے۔ بوئے گل محسوس تو ہوتی ہے مجسوس نظر نہیں ہوتی، دیدار اس لئے بھی محال ہے کہ ؎

کرے گی برق جمال اُسکی بند آنکھوں کو	وہ خلوتی اگر اے انجمن نظر آیا

لفظ اگر نے نظر آنے کو مشروط و مشتبہ کر دیا اور یہ انتہائے بلاغت ہے۔

رویت کا محال ہونا اس شعر میں بھی دکھایا ہے۔ ندرت ادا تعریف سے مستغنی ہے ؎

اُٹھ چکا روز قیامت روئے قاتل سے نقاب	عرصۂ محشر نگہ کے تیر کی منزل نہ ہو

مشہود کے لئے شاہد کی ضرورت ہے اور یہ انسان ہے مگر خود انسان مظہر صفات خداوندی ہے گویا انسان میں شاہد و مشہود مجتمع ہوگئے ہیں اس دقیق مسئلہ کو اور عبد و معبود و جز و کل کے ربط کو عجب نادر طریقہ سے دکھایا ہے ؎

لے موج بے لحاظ سمجھکر مٹا ئیو	دریا بھی ہے اسیر طلسم حباب کا،

یہ مسلمہ امر ہے کہ دریا کی جنبش اور موجوں کے ہچکولے حبابوں کی ساخت کا باعث ہوتے ہیں مگر یہی حباب کو فنا بھی کر دیتے ہیں حباب ایک قطرۂ آب ہے اور اس لحاظ سے جزو دریا۔ حبابوں کی نمود سے دریا کی روانی و جوش و خروش کا اندازہ ہوتا ہے ورنہ جمود کا دھوکا ہوتا ہے انسان کی ہستی ایک طرف تو حباب کی طرح حقیر و بے ثبات ہے اور ایک طرف اسقدر عظیم ہے کہ اسرار فطرت کا گنجینہ نہیں بلکہ موجب تخلیق عالم ہے۔ "موج بے لحاظ" کے ٹکڑے کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

اسی سلسلہ میں برگسن کا فلسفہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حیات یا وجود و نمود ہستی ایک سیل رواں ہے اور اس بحر میں جو اشکال و صور اسکی روانی سے ظہور میں آتے ہیں وہی اسکے اجسام و متعلقات ہیں۔ اس بحر ہستی میں ایک جوشش ہے جو بیرونی اثرات سے آزاد ہے۔ سائنس ان اشکال و صور کے مطالعہ سے مسئلہ ارتقا کا موجد ہوا مگر خود اس جوشش کی ماہیت سے عاجز ہے۔ برگسن ایک جلیل القدر فلسفی مانا جاتا ہے اور اسی سال (۱۹۲۸ء) نوبل پرائز پایا ہے مگر آتش کی شاعرانہ تخیل نے برگسن سے تقریباً ایک صدی پیشتر اس دو جزر حیات کو محسوس کر کے جوش مستی سے تعبیر کیا جسکو محض سیل رواں پر جو تفوق ہے ظاہر ہے۔ آتش اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو پوجا جاتا مگر ہم نے اُسکی کیا قدر کی۔ توبہ! میں کہاں سے کہاں بہک گیا۔ شعر سُنئے ؎

اثر رکھتی ہے گلگلوں کی کیفیت کا ہستی ہے	اُبھرنے میں حباب بحر کے اک جوش مستی ہے

سماع و وجد کی تصویر ؎

ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو ، مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا
صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

یہی حقیقت سماع ہے۔

آتش کے کلام میں تصوفانہ لطائف کا ایک چمن آراستہ ہے۔ تبصرہ کو طول ہو گیا اور مجھے ابھی کچھ اور باتیں لکھنا ہیں، ایسے اشعار کی خوبیاں مجملاً بھی بیان کیجائیں تو ایک دفتر ہو جائیگا اور حقیقت یہ ہے کہ میں تصوف کا مرد میدان نہیں نہ اس راہ کا سالک البتہ مبدءِ فیاض سے ایسا دل عطا ہوا ہے جسے تلاش حقیقت ہے۔ تحقیق کی ابتدا فلسفہ سے ہوئی اور انتہا وجدان پر۔ پہلے دماغ رہبر تھا اب دل ہے اور جس طرح فضا کی لطافت بعض وقت ریگستان یا کوہستان میں ایسے مناظر کو جو منزلوں دور ہیں پیش نظر کر دیتی ہے کبھی کبھی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اُٹھ جاتا ہے اور شاہد معنی کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے، مگر آہ اُسکے بعد وہی تاریکی وہی آلودگی علائق! یہ نہ تو خودستائی ہے نہ بیجا انکسار بلکہ امر واقع کا اظہار ہے۔ سمجھنے والے جو چاہیں سمجھیں اور جو خوشی ہو کہیں۔ اسی حالت کو (البتہ مبالغہ آمیز الفاظ میں) مینے کبھی نظم کیا تھا ؎

میرے احساسات کو بیدار تونے کر دیا عقل ہرزہ کار کو وجدان ساز ہبر دیا
عرش پیما فکر دی اور نطق کا جوہر دیا روح جس سے چھک گئی لبریز وہ ساغر دیا

عشق کی سرمستیاں ہیں حسن کا افسانہ ہے
دل مئے توحید کا چھلکا ہوا پیمانہ ہے

آتش کے تصوفانہ اشعار کا ایک انتخاب پیش کئے دیتا ہوں صاحبان ذوق لطف اندوز ہوں،

تکوین ؎

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھکو، گل تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا
نہیں اسرار سے آتش یہ تپلا خاک کا خالی یہی وہ گرد ہے جس سے سوار آخر عیاں ہوگا

عشق و ہوس ؎

خلعت شاہی نہیں لے بوالہوس تشریف عشق جس نے پہنا اُسکو یہ جامہ کفن ہو جائیگا

مقام حیرت ؎

اُلٹا اُدھر نقاب تو پردے پڑے اِدھر آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا

قلب المومن ؎

پوچھا ہے عارفوں سے جو ہم نے مکان یار آنکھوں کو بند کرکے ہے دل کا پتا دیا

تعلق حقیقت و مجاز سے

ہو جائے حسن معنی بے صورت آشکار　　روئے حقیقت اُلٹے جو پردہ مجاز کا

کل یوم ہو فی شان سے

جلوہ فرمائی نئی صورت سے کی ہر رنگ میں　　تو نے جس جامے کو پہنا تجھکو زیبا ہو گیا

مشاہدہ بالواسطہ سے

مرید کرکے مجھے پیر عشق نے اپنا،　　مشاہدہ کو اک آئینہ جمال دیا

عالم تنزیہہ سے

اُس باغ کے ناظر نگہ پاک سے ہم ہیں　　گل جسمیں کہ آلودۂ شبنم نہیں ہوتا

قرب حضوری سے

شوق دل میں ہے تو آنکھوں میں تصور اُسکا　　منزلیں جلوۂ محبوب کی آباد ہیں سب

رابطہ سے

تو جو لیلیٰ ہے تو مجنوں ہیں ترے دیوانے　　تو جو شیریں ہو تو عاشق ترے فرہاد ہیں سب

وصل و قربت سے

تار تار پیرہن میں بس گئی ہے بوئے دوست　　مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست

صحو و سکر سے

مست تیری مئے محبت کا ۔۔۔　　دین و دنیا سے بے خبر ہے شرط

جمال و جلال سے

طور سے کیا کیا تجلی نے　　حُسن بے پردہ سے حذر ہے شرط

محاضرہ سے

ہے تمھارا خیال مد نظر　　جس طرف جائیں سد راہ ہو تم،

ذوق باطنی سے

آشنا معنی سے صورت آشنا ہوتا نہیں　　آئینہ دل کی طرح سے حق نما ہوتا نہیں

فنائے ہستی سے

عجب اسکا کیا نہ سماؤں میں جو خیال دشمن و دوست میں　　وہ مقام ہوں کہ گزر نہیں و مکاں ہوں کہ پتا نہیں

مراقبہ

تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں　　رہی ہے ایک تصویر خیالی رو برو برسوں

فنا فی الذات ؎

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں   لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیراہن میں،

ذوقِ فنا ؎

بحرِ ہستی میں وہ کشتی ہوں کہ جسنے بیشتر   شوق میں گرداب کے توڑے ہیں لنگر سیکڑوں

حجابِ تعین ؎

راہ رَی بے بصری راہ رَی نابینائی   صورت آباد سے مشتاق لقا جاتے ہیں

عالمِ مثال ؎

جسمِ خاکی کے تلے جسمِ مثالی بھی ہے   اک قبا اور بھی ہم زیرِ قبا رکھتے ہیں

اَنا الدہر ؎

آتشِ پرشش جہت ہے مگر کوچہ یار کا   چاروں طرف سے ہوتی ہیں ہم پر اشارتیں

تہذیبِ عشق ؎

عاشق جو حسنِ پاک میں کچھ گفتگو کریں   دامن کا پیچھے علم لیں پہلے وضو کریں

شوقِ لقا ؎

دیدار عام کیجئے جلوہ دکھائیے   تا چند بندگانِ خدا آرزو کریں؛

اثبات و نفی ؎

موجود گو کہ تو ہے مگر چاہتا ہے شوق ؛   آوارہ ہوں تلاش تری چارسو کریں،

انس و ہیبت ؎

آتی ہے کوہ سوختۂ طور سے صدا   نظارۂ جمال غضب ہے جلال میں

لاتعین ؎

دیر و حرم میں شیخ و برہمن رہیں خراب   ملتا ہے وہ کہاں کہیں جس کا مکاں نہو،

عرفانِ قلبی ؎

مشتاق جو ہوتا ہوں کعبے کی زیارت کا   آنکھیں پھری جاتی ہیں طوفِ حرمِ دل کو

راہِ سلوک ؎

نظارۂ صورت سے معنی کا خیال آیا   لیلیٰ کے ہوئے مجنوں ہم دیکھ کے محمل کو

جذبِ عاشقانہ ؎

یادِ الٰہی میں جو نعرۂ یا ہو کیا،   بھول گئے وحش و طیر نغمۂ داؤد کو،

رازِ محبوب سے

دار پر بھی مجھے کھینچیں تو انا الحق نہ کہوں　　　　شُغل ہر چند ہو میری مےِ منصور سے آنکھ

ذوقِ طلب سے

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری　　　　خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

نحن اقرب سے

یقین ہے اٹکے گی جان آکے اپنی گردن میں　　　　سُنا ہے جا ہے قریب رگِ گلو تیری

ذات وصفات سے

وہ گُل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے　　　　وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جسکے بو تیری

کلامِ الست سے

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآن تم ہو قرآں کی　　　　جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

سلوکِ مجذوب سے

سودائے راہِ یار کا اللہ رے اثر　　　　جادہ بنی جو ہم نے زمیں پر لکیر کی

کمالِ نسبت سے

مرغِ ترانہ سنج ہوں اُس بوستاں کا میں　　　　خونِ بہار ٹپکے اگر خار توڑیئے

معاملہ ومشاہدہ سے

کبھی جو جذبِ محبت سے کام ہوتا ہے　　　　نقاب اُٹھتا ہے دیدارِ عام ہوتا ہے

مقامِ معراج سے

فرشتے سنتے ہیں آوازِ دورباش کا شور　　　　کبھی ہمارا جو واں اہتمام ہوتا ہے

جلال وجمال سے

طور جس برقِ تجلی نے کیا خاک سیاہ　　　　تیرے آتشکدۂ حسن کی چنگاری تھی

نسبتِ حیرت سے

پشت بر دیوارِ حیرت ہیں ہزاروں صورتیں　　　　صاحب آئینہ خانہ آج تک روپوش ہے

سیرِ منازل سے

کیا کیا نہ رنگ تیرے طلبگار لا چکے　　　　مستوں کو جوش صوفیوں کو حال آ چکے

فنائے خودی سے

ہستی کو مثلِ نقشِ کفِ پا مٹا چکے　　　　عاشق نقابِ شاہدِ مقصود اُٹھا چکے

حجاب تعین ؎

کعبے سے دیر دیر سے کعبے کو جا چکے   کیا کیا نہ اس دوراہے میں ہم پھیر کھا چکے

قربت منزل ؎

ہوتی ہے تن میں روح پیام اجل سے شاد   دن وعدۂ وصال کے نزدیک آ چکے

شہود و مشاہدہ ؎

دکھلا رہی ہے دل کی صفا دو جہاں کی سیر   کیا آئینہ لگا ہوا اپنے مکاں میں ہے

روحانیت اجسام ؎

تو وہ گل ہے باغ عالم میں کہ جسکے واسطے   گل بھی آوارہ برنگ بو نظر آیا مجھے

کیف دوام ؎

عالم وجد ترے مستوں کو   بے دف و چنگ رہا کرتا ہے

محیط شہود ؎

مست الست قلزم ہستی میں آئے ہیں   مثل حباب اپنا پیالہ بھرے ہوئے

مقصود حقیقی ؎

بجز سواد دنیا و ما فیہا سے کچھ مطلب نہیں   تو ہمیں اے کائنات کاف و نوں درکار ہے

سرور و مستی جوش و خروش

آتش کو اُردو کا حافظ کہنا بجا ہوگا۔ انتخاب میں آپکو بیشتر اشعار ایسے ملیں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سرشار محبت نشاط کی ترنگ میں اپنے جذبات و محسوسات کو عالم وجد و محویت میں بیان کر رہا ہے جو اشعار لکھے جا چکے اُنمیں ایسی مثالیں اکثر ملیں گی۔ اپنے دعوے کی تائید میں ایک خاص انتخاب اس جگہ شامل کئے دیتا ہوں تکرار اشعار ناگزیر ہے۔ نافہم جبکو سرور و مستی کہتے ہیں دراصل جوش و خروش یا سوز و گداز ہے اور انبساطی مضامین تک محدود نہیں بلکہ درد انگیز اشعار میں بھی ہوتا ہے صرف یہ شرط ہے کہ تخیل کی بنیاد حقیقت پر ہو اور شاعر کی انفعالی کیفیت کا پورا عکس الفاظ میں اُتر آئے۔ ایسے شعر میں جوش و خروش ضرور ہوگا، اگر طبیعت نے انبساطی اثر قبول کیا ہے تو سامع پر بھی انبساط طاری ہوگا اور اگر شاعر جذبۂ حزن سے متاثر ہوا ہے تو سامع بھی ویسا ہی اثر لے گا۔ حافظ کا کلام اس کا شاہد ہے، جہاں ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

میں جوش و خروش ہے وہاں ؎

شب تاریک و بیم موج و گرد ابے چنیں حائل   کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

...می ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کو سنکر دل سے واہ نکلتی ہے اور دوسرے کو سنکر آہ - جوش ...ون میں اثر مختلف مترتب ہوتا ہے - صرف ایسے اشعار پر اکتفا کرتا ہوں جن میں خوشی کی لہر ہے۔ ہاں سرور مستی کی شناخت بیہودہ لفاظی اور فارسی کی غلط ترکیبوں کی بھرمار اور زبان و محاورہ کی گردن توڑنا ...نوش کا کلام ان سے معرا اور اس معنی میں سرور و مستی سے خالی ہے۔

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش   لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا
آئینۂ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا   چہرۂ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جو تھا
چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر   دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا
...ماں شوق سے تلواروں کا منھ بر سائے   مہ نو نے ترے ابرو کا کیا خم پیدا
نگاہ دل میں شبنم میگوں یہ رنگ محفل کرے گرگوں   وہ حال ہووے جو وقت آخر شراب خوار کی انجمن کا
...تش مست جو مل جائے تو اُس سے پوچھوں   تو نے کیفیت اُٹھائی ہے خرابات میں کیا
کیسے داغ دل سے محشر میں ملایا جائیگا   روز اک خورشید کو ملتا ہے خلعت نور کا
بھر گیا دامن نظارہ گل نرگس سے   آنکھ بھر کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا
اے موج بے لحاظ سمجھ کر مٹائیو   دریا بھی ہے اسیر طلسم حباب کا،
برے سے رکھتی ہے اس میکدے میں کیفیت   محتسب توڑ کے شیشے کو پشیماں ہوگا
مصور کو تری تصویر کا سودا مبارک ہو   مقام گیسوئے مشکیں و خال عنبریں آیا
خدا مرد سے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا   جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو لے سنبلستاں کا
ساقیا تعریف تیرے میکدے کی کیا کروں   ساتھ کیفیت کے تھا لبریز جو پیمانہ تھا،
اُلٹا اُدھر نقاب تو پردے پڑے اِدھر   آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا،
صوفی ہیں دور جام ہے جوش بہار ہے   خرقے ہیں اور داغ مئے لالہ رنگ کا،
ساقی نہ قطع سلسلۂ دور جام ہو   مطرب نہ تار توڑ لے اب آواز چنگ کا
تری مستانہ آنکھوں کی نہ گردش کا اثر دیکھا   مئے گلرنگ سے سو سو طرح پیمانہ بھر دیکھا
صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا   شبہہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا
مانگ جاہے جسے دولت دو جہاں کی اے دوست   چاہتا تیرے سوا کچھ نہیں خواہاں تیرا
مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے   کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

نمازی کو شراب اُسنے پلائی جاکے مسجد میں، کلیسا میں گیا تو بت کو دے پٹکا برہمن پر
نقاب اُسنے اُٹھا جو تو رخسار آتش رنگ سے اپنے پر پروانہ سے آرے چلیں شمعوں کی گردن پر
ادب آموز ہے ایک ایک ذرہ اپنے وادی کا نہیں ممکن کہ گرد اُڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر
عشق صورت سے خیال آیا ہے معنی کی طرف جب صدف سے مدعا تھا اب ہے گوہر سے غرض
داغ دل کی روشنی ہے بوریئے فقیر پر شیر کی چربی سے جلتا ہے نیستاں میں چراغ
یہ دل ہے جب سے تمہارے خیال سے واقف کہ چار خلط نہ تھے اعتدال سے واقف
در کریم نہیں سیرگاہ مغروراں نہ آئے یاں وہ نہ جو سوال سے واقف
ہے تمہارا خیال مد نظر جس طرف جائیں سد راہ ہو تم
دروازہ بند رکھتے ہیں مثل حباب بحر قفل درون خانہ ہیں اپنے مکاں میں ہم
ملے مراد دل تیرے کوچے میں رکھتے ہی قدم حسرتیں جو کچھ کہ تھیں گرد پریشاں ہو گئیں
بلند و پست میکدہ شخص کو برابر ہے، نسیم ہے سرو پا کا کوئی مقام نہیں
آتش افروزی گردوں ہے تماشا مجھکو مجرہ جز سایۂ دیوار مرے گھر میں نہیں
آئینے میں عکس چشم یار کا عالم نہ پوچھ دیکھ لے آتش کنول پھولے ہوئے تالاب میں
مرے دلکو شوق فغاں نہیں مرے لب تک آتی دعا نہیں وہ دہن ہوں جسمیں زباں نہیں وہ جرس ہوں جسمیں صدا نہیں
عجب اسکا کیا جو سماؤں میں نہ خیال دشمن و دوست میں وہ مقام ہوں کہ گزر نہیں وہ مکان ہوں کہ پتا نہیں
تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں رہی ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں
ملی ہے ہمکو بھی نمخانۂ افلاک میں راحت سرہانے ہاتھ رکھکر سوئے ہیں زیر سبو برسوں
دیا ہے حکم تب پیر مغاں نے سجدۂ خم کا کیا ہے جب شراب ناب سے ہمنے وضو برسوں
اگر میں خاک بھی ہونگا تو آتش گرد باد آسا رکھیگی مجھ کو سرگشتہ کسی کی جستجو برسوں
شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں لیلی پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں
بازار مصر میں چل یوسف کا سامنا کر، کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں
کوئی ذرہ تو اسکا تا بدامن اُڑکے جائیگا یہ مشت خاک تیری راہ میں برباد کرتا ہوں
روندتا ہوں سبزۂ رہ کی طرح وہ بوٹیاں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جنکو کیمیاگر سیکڑوں
بحر ہستی میں میں وہ کشتی ہوں جسنے بیشتر شوق میں گرداب کے توڑے ہیں لنگر سیکڑوں
ساقی میکدہ نے مجھکو یہ خدمت دی ہے نشے میں مست جو گرتا ہے اُٹھاتا ہوں میں

روئے خورشید پر افشاں کا جو عالم دکھلائیں
یہ شرف ذرۂ خاک شہدار کھتے ہیں،

جسم خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے،
اک قبا اور بھی ہم زیر قبا رکھتے ہیں،

آتش یہ شش جہت ہے مگر کوچۂ یار کا
چاروں طرف سے ہوتی ہیں ہم پر اشارتیں

دیدار عام کیجئے پردہ اٹھا دیجئے،
تا چند بندگان خدا آرزو کریں،

موجود گو کہ تو ہے مگر چاہتا ہے شوق
آوارہ ہوں تلاش تری جا سو کریں،

خم فلک سے بھروں وہ شراب شیشے میں
گماں ہو ذروں کو ہے آفتاب شیشے میں

حسن یوسف کو ترے حسن سے نسبت کیا ہے،
پھونک دے گرمیٔ بازار خریداروں کو،

اٹھ چکا روز قیامت رخ قاتل سے نقاب
عرصۂ محشر تنگ کے تیر کی منزل ہو،

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

مشتاق جو ہوتا ہوں کعبے کی زیارت کا
آنکھیں پھری جاتی ہیں طوف حرم دل کو

نظارۂ صورت سے معنی کا خیال آیا
لیلیٰ کے ہوئے مجنوں ہم دیکھ کے محمل کو،

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

سودائے راہ یار کا اللہ رے اثر،
جادہ بنی جو ہم نے زمیں پر لکیر کی،

پھر خوشے اتریں پھر کھنچے انگور کی شراب
پھر شاخ تاک پیچ سر دار لست کھائے

کہنا بلیٰ وہ بھولے نہ اسے ساقیٔ ازل
لغزش نہ پائے آتش مست الست کھائے

مرغ ترانہ سنج ہوں اُس بوستاں کا میں
خون بہار ٹپکے اگر خار توڑ دیجیے،

اثر رکھتی مے گلگوں کی کیفیت کا ہستی ہے
اُبھرنے میں حباب بحر کے اک جوش مستی ہے

کبھی جو جذب محبت سے کام ہوتا ہے،
نقاب اٹھتا ہے دیدار عام ہوتا ہے،

فرشتے سنتے ہیں آوازہ دور باش کا شور
کبھی ہمارا جو واں اہتمام ہوتا ہے،

ہمارے حلقے میں کرتا ہے شیشہ دل خالی
ہمارے دور میں لبریز جام ہوتا ہے

طور جس برق تجلی نے کیا خاک سیاہ
تیرے آتشکدۂ حسن کی چنگاری تھی

کوچۂ یار میں چلئے تو غزلخواں چلئے
بلبل مست کی صورت سے گلستاں چلئے

گل سے انسوں مری آنکھوں میں ہیں جو کانٹے
پھول رکھتا ہے تری بو تو تری خو کانٹے

اثر سنگ کیا باد خزاں سنے پیدا
شیشۂ رنگ گل و لالہ و سوسن ٹوٹے

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید،
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

اشتیاق وصلت میں جان لب تک آئی ہے
عشق نے ستایا ہے حسن کی دہائی ہے

بہار آئی ہے پکا ساقی شراب رنگ پر ور سے
خزاں کا غم بھلادے بادۂ گلگوں کے ساغر سے

دکھلا رہی ہے دل کی صفا دو جہاں کی سیر
کیا آئینہ لگا ہوا اپنے مکاں میں ہے،

وہ گرم رو بادیۂ عشق و جنوں ہوں
جلتا ہے چراغ آج مرے نقش قدم سے

آستیں ہوں وہ کہ مربوط گریباں سے نہیں
وہ گریباں ہوں جسے قرب نہیں داماں سے

عشق کامل ہے سبب حسن سے یکرنگی کا،
شمع و پروانہ کا جل جانے میں اک مذہب ہے

اکی بہار میں تو مجھے پار اُتار دے
کشتیِ مے ورآبۂ امید و بیم سے

سبوئے غنچہ ہے معمور جام گل لبریز
ٹپک رہی ہے شراب برنو بہاری سے

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے
جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے

تو وہ گل ہے باغ عالم میں کہ جسکے واسطے
گل بھی آوارہ برنگ بو نظر آیا مجھے

کرم حق سے ہے گلزار توکل سرسبز
کٹ کے دریا سے مرے باغ میں جو آتی ہے

ساقی زلال دوُرد جو توفیق ہو وہ دے
مستوں کو تیرے ہوش کہاں امتیاز کا

مرید کرکے مجھے پیر عشق نے اپنا
مشاہدہ کو اک آئینۂ جمال دیا

تو روشنیِ عالم ایجاد ہو گیا،
ویرانہ تیرے جلوے سے آباد ہو گیا

ساقی کی نگاہوں نے مرے ہوش اُڑائے
آنکھوں سے دیا جام مئے بےخبری کا

اُس باغ کے ناظر نگہ پاک سے ہم ہیں
گل جس میں کہ آلودۂ شبنم نہیں ہوتا

کرتا ہے نغمہ صورت داؤد عندلیب
عالم ہوا ہے دفتر گل پر زبور کا،

بہار آئی ہے دیوانے وجد کرتے ہیں
سرود کی ہے صدا غلغلہ سلاسل کا

یاد الٰہی میں جو نعرۂ یا ہو کیا،
بھول گئے وحش و طیر نغمۂ داؤد کو

دار پر بھی مجھے کھینچیں تو انا الحق نہ کہوں
سُرخ ہر چند ہو میری مئے منصور سے آنکھ

عار سے عار ہے مجھ مجنوں کو،
ننگ سے ننگ رہا کرتا ہے،

عالم وجد ترے مستوں کو
بلے دف چنگ رہا کرتا ہے،

مست الست قلزم ہستی میں آئے ہیں
مثل حباب اپنا پیالہ بھرے ہوئے

گر اسکو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

طلب دنیا کی کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی — خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے
چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی — ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی
بجز سوا دنیا و مافیہا سے کچھ مطلب نہیں — تو ہمیں اے کائنات کاف نوں درکار ہے

فن شاعری اور آتش

معنوی حیثیت سے آتش کی شاعری پر بحث ہو چکی اب فن کے اصول سے اندازہ کیا جائیگا، اس موضوع پر بہترین کتاب مولانا شبلی مرحوم کی "شعر العجم" ہے میں اُسی کے بیانات لیکر آتش کے کلام سے مثالیں پیش کرونگا۔

بقول مولانا مرحوم شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل - باقی اوصاف یعنی سلاست صفائی حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض و مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف

محاکات کے معنی کسی چیز یا حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اُس شئے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے اور یہ مصوری مادی اشیا و جذبات دونوں کی ہوتی ہے دوسری قسم اول سے زیادہ مشکل ہے،

آتش کے کلام سے محاکات کی مثالیں

ناتوانی و اضطراب دو متضاد کیفیتیں ہیں انکے اجتماعی اثر کی مصوری ملاحظہ ہو

حال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

عاشق پر معشوق کی مستانہ آنکھوں کی گردش سے کیف طاری ہوتا ہے شوق کا تقاضا ہے کہ انھیں پیمانوں سے ہر وقت مئے بیخودی چڑھائی جائے مگر امکان نہیں، قریب تر چیز جو اُن آنکھوں سے مشابہ ہے پیمانۂ شراب ہے، اُدھر رجوع ہوتا ہے اور پیمانہ کو مئے گلرنگ سے ایک مرتبہ اور ایک طرح نہیں بلکہ سو سو طریقوں سے بھرتا ہے کبھی چھلکا کر کبھی نصف کبھی ایک تہائی کبھی کف دست پر رکھکر کبھی روشنی کے مقابل، مگر توبہ اُن مستانہ آنکھوں کی گردش کا اثر کہاں، آخر اعتراف شکست کرتا ہے ؎

تری مستانہ آنکھوں کی نہ گردش کا اثر دیکھا — مئے گلرنگ سے سو سو طرح پیمانہ بھر دیکھا

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جو کیفیت آتش کے مطلع میں ہے نہ مستانہ آنکھوں کی گردش میں ہے نہ مئے گلرنگ سے لبریز پیمانوں میں۔

عاشق نے اتنی جرأت کی کہ معشوق کی طرف دیکھ لیا، سرکار حسن کو یہ گستاخی ناگوار ہوئی اور اسطرح سزا دی گئی کہ لمبی لمبی پلکیں جو ابتک حیا و تمکین سے جھکی ہوئی تھیں اُبھریں اب ہر پلک ایک چھری تھی جو دل پر پھیری نہیں گئی بلکہ بیدردی سے شکار کو چھری سے اڑا دیا گیا یہ طرز ادا نہ صرف حقیقت سے مطابق ہے بلکہ اُسنے یہ لطف پیدا کیا کہ دل کہ جو محو نظارہ تھا اچانک چھری سے بھر جانے پر کاری زخم آ گئے اور اُس تکلیف یا لذت کا کیا ٹھکانا جسکا خلاف توقع ہنگام گلچینی جمال سامنا ہو جائے۔ ؎

روئے مژہ اُن آنکھوں نے دل کو دکھا دیا   صیّاد نے شکار چھُری سے لٹا دیا

حسین معشوق کو عمدہ لباس کا شوق ہے۔ طرح طرح کی پوشاک کشتیوں میں لگی ہوئی رکھی ہے مگر اللہ رے نازک مزاج کوئی لباس پسند نہیں آتا، یہ پوشاک پہنی گئی آئینہ میں جائزہ لیا گیا اور کوئی نہ کوئی (عیب) نکال کر اتاری گئی دوسری پہنی گئی، تیسری پہنی گئی، سب کا یہی حشر ہوا۔ بات یہ ہے کہ معشوق جامہ زیب ہے، ہر پوشاک اُس پر کھلتی اور حسن کی پھبن کو ایک نئے انداز سے نمایاں کرتی ہے۔ خود اُسکا شوق ترقی کرتا جاتا ہے اور آئینے کے سامنے سے ہٹنے کو دل نہیں چاہتا۔ بہانہ یہ ڈھونڈھا کہ پوشاک ٹھیک یا مرضی کے موافق نہیں ہے۔ اس طرح خود بیں کو آئینے میں دیر تک اپنے حسن کی نظارگی کا موقع ملا ہے

پوشاک ہر طرح کی حاضر ہے کشتیوں میں   اسکو پہنتے ہیں وہ اُس کو اُتارتے ہیں

عاشق مضطر نے قاصد کے ہاتھ معشوق کو خط بھیجا خدا خدا کرکے قاصد واپس آیا مگر خالی ہاتھ، قاصد بے نیل مرام واپس آنے سے نادم و خاموش ہے مگر ہائے وہ شخص جو اُمید کے خلاف اُمید کرتا ہے۔ شاید خط لکھنے کی فرصت نہ تھی یا اتنی زحمت گوارا نہوئی ممکن ہے کہ زبانی کوئی پیغام بھیجا ہو۔ محاکات کا سلیقہ دیکھیے کہ اس اُمید کے بعد مایوسی کا اظہار شعر میں نہیں ہے ایسا کرنا تاثیر کے طلسم کو توڑ دیتا تھا۔ سنئے اور سر دھنیے ؎

نکلتی منھ سے قاصد کے نہیں بات   مگر لایا ہے پیغام زبانی کیا

طائر گرفتار دام ہوکر آزادی کی بیہودہ کوشش میں پھڑکتے اور اس طرح پھڑکتے ہیں کہ صیّاد کو اندیشہ ہوتا ہے دام ٹکڑے ٹکڑے نہو جائے۔ شعر میں جو خاص بات علاوہ محاکات کے قابل لحاظ ہے صیّاد کی سنگدلی ہے کمبخت کو ان تڑپنے والوں پر ترس نہیں آتا بلکہ اپنے دام کی خیر مانگتا ہے۔ اسیران کے ساتھ لفظ تازہ نے شعر کو نہ صرف حقیقت سے ہمکنار کر دیا بلکہ یہ معنوی اضافہ کیا کہ تڑپنا پھڑکنا کچھ ہی دن کا ہے اُسکے بعد اسیر، قید قفس کے خوگر ہو جائینگے ؎

اللہ رے پھڑکنا اسیران تازہ کا   صیّاد خیر مانگتا ہے اپنے دام کی

معشوق نے آئینہ دیکھا اور خود اپنا عاشق ہوگیا۔ آتش نے اس امر کے اظہار کے لئے معشوق کی جو ادا انتخاب کی ہے اُسکا جواب نہیں ہے اور اُسکا لطف بیان کرنے کو الفاظ خلق نہیں ہوئے ؎

آئینے نے کیا ہے جو صورت سے آشنا   گردن میں اُنکی ہاتھ ہیں اُنکے پڑے ہوئے

مندرجہ بالا شعر کا اگر جواب ہو سکتا ہے تو آتش کا یہ شعر ہے۔ معشوق کو پہلے پہل پاؤں میں مہندی مل کر جو خوشی ہوئی ہے وہ پامالی خون عاشقاں کا پیش خیمہ ہے ؎

ملی ہے پاؤں میں مہندی انھوں نے پہلے پہل   زمیں تو کیا ہے قدم عرش پر نہیں رکھتے

محفل وجد و سماع کی مصوری ملاحظہ ہو ؎

ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو، مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا،

ایک رند کی تصویر ؎

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

محفل شراب کی تصویر۔ ایک ایک لفظ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اور "مگر" نے تو قیامت ڈھادی ؎

مگر اسکو فریب نرگس مستانہ آتا ہے اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

میں نے چند مثالیں پیش کر دیں محاکات کے بہترین نمونے کلام آتش میں بکثرت موجود ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تخئیل و محاکات کا امتیاز ہی بیکار ہے۔ تخئیل جہاں الفاظ میں منضبط ہوئی صورتگری یا محاکات سے خالی نہیں ہو سکتی۔ سوال صرف اسقدر رہ جاتا ہے کہ نقوش روشن ہیں یا دھندلے اسکا انحصار اسلوب بیان پر ہے یعنی شاعر کو اظہار خیال کے لئے مناسب الفاظ ملے یا نہیں ملے۔ بعض مرتبہ اُصول بلاغت کو مدنظر رکھتے ہوئے عمداً تصویر دھندلی رکھی جاتی ہے یا صرف چند اجزا لے لئے جاتے ہیں باقی چھوڑ دئے جاتے ہیں جنکو قوت متخیلہ پورا کر دیتی ہے۔ میری ناچیز رائے میں جیسا شروع میں کہیں عرض کیا شاعری کے اصلی اجزا تخئیل و اسلوب بیان ہیں۔ تخئیل ہی اپنے واسطے الفاظ ڈھونڈھ لیتی ہے اور الفاظ تخئیل میں ردّ و بدل کر دیتے ہیں چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ بسا اوقات ایک لفظ بدل دینے سے شعر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

تخئیل | تخئیل در اصل قوت اختراع کا نام ہے، اگرچہ (بقول مولانا شبلی مرحوم) محاکات اور تخئیل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری در اصل تخئیل کا نام ہے، محاکات میں جو جان آتی تخئیل ہی سے آتی ہے ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں۔ قوت محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سُنے اُسکو الفاظ کے ذریعہ سے بعینہٖ ادا کر دے لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا تناسب اور توافق کو کام میں لانا اُنپر آب و رنگ چڑھانا قوت تخئیل کا کام ہے۔ قوت تخئیل مختلف صورتوں میں عمل کرتی ہے۔

آتش کی شاعری میں تخئیل کا تنوع اُن اشعار سے ظاہر ہو گیا ہو گا جو مختلف عنوانات کے تحت درج کئے گئے۔ چند شعر جن سے تخئیل کی خوبی و بلندی کا اندازہ ہو یہاں لکھے جاتے ہیں۔

بیوفا معشوق سے عاشق ایک ایسا سوال کرتا ہے جو نہ تو اُسکے وقار حسن و شان معشوقی کے منافی ہے نہ ایسا ہے جس میں ایثار سے کام لینا ہوتا ہم دلشکن جواب غضب آلود لہجے میں ملتا ہے۔ شعر میں یہ کچھ نہیں کہا گیا مگر تخئیل اپنے جوہر دکھا رہی ہے اور چند الفاظ اپنے اندر ایک دنیائے معنی لئے ہوئے ہیں ؎

میرا سوال اُس بت بلے پیر کا جواب　　　اللہ جانتا ہے اُسے خوب، کیا کہوں

دُرّوں کے مستوجب دراصل وہ لوگ ہیں جو خطاوار ہیں مظلوم کی دادرسی کی جاتی ہے۔ مگر شہر بتاں کی رسم اُلٹی ہے یہاں دادخواہ پر بجائے شنوائی کے دُرّے پڑتے ہیں۔ ایک تازہ وارد شہر بتاں فریاد کرکے اُن کو اپنے حال سے آگاہ کرنا چاہتا ہے دوسرا شخص جو یہاں کی رسم و راہ سے واقف ہے اور شاید خود سزا بھگت چکا ہے اُسکو صلاح دیتا ہے کہ ؎

یاں رسم دُرّے پڑنے کی ہے دادخواہ پر　　　شہر بتاں میں حوصلہ فریاد کا نہ کر

شعر میں نہ معلوم کتنے لطائف ہیں۔ ضمناً یہ بات پیدا ہوئی کہ عاشق کے لئے فریاد ننگ ہے اور اسکی سزا دُرّے پڑنا ہے۔ دوسرے یہ کہ عاشق کو طرح طرح کے جا و بیجا مصائب آلام برداشت کرنیکو تیار رہنا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ معشوق کا ظلم عین کرم ہے یہ بنچا ہوا عاشق دیکھنا چاہتا ہے کہ میرے قول کا اس نو وارد پر کیا اثر ہوتا ہے آیا یہ عشق کی صلاحیت رکھتا ہے یا بوالہوس ہے اگر اس تنبیہ سے مرعوب ہوگیا اور فریاد سے باز رہا تو عشق میں خامی ہے اگر خوش ہوا اور بطور حسن طلب فریاد کی تاکہ معشوق کے ہاتھ سے ایذا اُٹھائے تو اپنی دُھن کا پکا ہے۔ بخوف طوالت زیادہ نہیں لکھتا۔

عشق مجازی بھی اگر آلودگی سے پاک ہے تو قابل قدر چیز ہے تاہم محدود لہذا ناقص ہے۔ عشق کامل جبھی ہوتا ہے جب حسن مطلق کا پرستار ہو۔ آتش نے عشق مجازی کو صدف اور عشق حقیقی کو گوہر سے تشبیہ دی ہے۔ اس تشبیہ نے شعر میں بلاغت کوٹ کوٹ کر بھر دی اور عشق مجازی و حقیقی کے تمام مدارج تمام امتیازی خصوصیات نمایاں کر دیئے۔ صدف کو چیر کر گوہر نکالا جاتا ہے، مجاز طے کرکے حقیقت تک رسائی ہوتی ہے۔ مجاز حقیقت کا پردہ ہے مگر اُسی کے ساتھ حقیقت کا شوق پیدا کرتا ہے جب صدف میں اسقدر دلکشی ہے تو گوہر کا عالم کیا ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ تکمیل عشق میں جو زحمتیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں اُنکی طرف بھی اشارہ ہوگیا گوہر صدف میں اور صدف دریا کی تہہ میں ہے آسانی سے ہاتھ نہیں آسکتا جانبازی کی ضرورت ہے اور ہر شخص تہہ سے آشنا بھی نہیں ہوتا بہت سے اسی آرزو میں ڈوب جاتے ہیں اور گوہر مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ جتنا غور کیجئے گا معنی پھیلتے جائیں گے ؎

جب صدف سے مدعا تھا اپنا گوہر سے غرض　　　حسن صورت سے خیال آیا ہے معنی کی طرف

ذرے پر تو خورشید سے چمک اُٹھتے ہیں مگر ذرہ ہائے خاک شہدا کا یہ شرف ہے کہ چہرۂ خورشید کی زینت میں جس طرح افشاں جبین معشوق کی ؎

یہ شرف ذرۂ خاک شہدا رکھتے ہیں　　　روئے خورشید پر افشاں کا جو عالم دکھلائیں

اس انداز بیان نے شہیدوں کی عظمت کو جو مسلم ہے کس قوت کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ مبالغہ کا یہی منشا تھا۔ لفظ شرف خورشید کی مناسبت سے خاص طور پر مزہ دے رہا ہے یعنی خورشید کے شرف (برج حمل میں ہونا) کی حالت میں بھی جب اُسکی تابندگی کمال کو پہنچ جاتی ہے، یہ ذرے چمکیں گے اور اُسکی روشنی کے مقابل ماند ہونگے۔

قید قفس میں یادگلشن کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک درخت ایک ایک نہال ہی نظر میں نہیں بلکہ اُنکی تعداد یاد ہے اس اسیر قفس کو چمن سے ایسی محبت تھی کہ آزادی کے زمانے میں ایک ایک درخت گنا تھا اور ہر درخت میں جتنے شگوفے جتنی کلیاں تھیں اُنکو شمار کیا تھا اور ابتک یاد ہے کہ فلاں نہال میں اتنے شگوفے تھے فلاں نہال میں اتنے۔ اب چمن کیسا چمن سے پیام لانے والا بجز صبا کے کوئی نہیں۔ اگر کبھی بھولے سے صبا کا سوئے قفس گزر ہوا تو یہ قیدی فرط اشتیاق سے پوچھتا ہے کہ اے صبا مجھے بتادے کس نہال میں کتنے شگوفے آئے ہیں اس اشتیاق چمن کا ٹھکانا ہے؛ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف شگوفوں کا استفسار کیوں کیا گیا پھولوں کو کیوں نہیں پوچھا۔ آہ پھول کھلنے کہاں پائے تھے کہ یہ بدنصیب گرفتار ہوکر سیر چمن سے محروم ہوگیا۔ مجھے اُن حضرات پر ہنسی آتی ہے جو گل وبلبل کی شاعری کو نام رکھتے ہیں۔ چمن کو وطن اور قفس کی اسیری کو وطن سے دوری نہالان چمن کو وہ ہونہار افراد جن سے اُمیدیں اور وطن کی نام ونمود وابستہ ہے تصور کرلیجئے اور پھر دیکھئے کہ کیا کیفیت طاری ہوتی ہے اور پہلو میں دل ٹکڑے ہوتا ہے کہ نہیں۔ خیر آمدم کو اس کا خیال نہ کیجئے شعر سنئے

آتی ہے باغ سے جو صبا پوچھتا ہوں میں
کتنے شگوفے آئے ہیں کس کس نہال میں

اس اسیر قفس کا دل دھڑکتا ہے کہ چمن کی شادابی اور نہالوں کی تعداد میں کمی تو نہیں ہوگئی شگوفے پہلے سے کم تو نہیں آئے۔ سب نہال برقرار ہیں کوئی خشک یا تیشۂ باغباں کی نذر تو نہیں ہوگیا۔ خدا کی پناہ! یہ شاعری کا معجزہ نہیں تو کیا ہے۔ الفاظ بالکل سادہ ہیں اور سوال بظاہر ایسا معمولی کہ ناواقف مہمل سمجھیگا تاہم شعر کسقدر گہرے اور گوناگوں جذبات کا ترجمان ہے۔

شب فرقت کے مصائب وتکالیف بیان کرنے میں ہر شاعر نے طبیعت کی جولانی اور تخیل کی بلندی دکھلائی ہے۔ عاشق کے لئے معشوق کی جدائی سے بڑھکر اور مصیبت کیا ہوسکتی ہے۔ رات کے وقت ہر تکلیف میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ الغرض عاشق کی شب ہجر کاٹے نہیں کٹتی انتظار سحر میں آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ آتش نے عجب پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جو کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ اُسنے تمام عالم حتیٰ کہ انجم افلاک کو اس ہجراں نصیب عاشق کا ہمدرد قرار دیا ہے سب کی تمنا ہے کہ اسکی شب ہجر سحر ہو جائے۔ تاروں کے چمکنے اور جھلملانے کو آتش نے آمین کہنے سے تعبیر کیا ہے استعارہ کی ندرت ولطافت کی تعریف ممکن نہیں۔ یہ شعر ایسا ہے کہ

انسان پر کیسی ہی مصیبت پڑی ہو اسکے پڑھنے سے دل کو سکون ہوگا اور یاس اُمید میں بدل جائیگی ؎

نہ گھبرا اسقدر شام شب فرقت سحر ہوگی　　دعا تو مانگ غافل مستعد اختر ہیں آمین کو

کمال شاعری کی آخری حد یہ ہیں کہ تخئیل و محاکات شیر و شکر ہوں اور یہ امتیاز مشکل ہوجائے کہ شعر میں تخئیل کا عنصر غالب ہے یا محاکات کا۔ چند شعر اس قسم کے بھی درج کئے دیتا ہوں۔

وعدہ خلاف یار سے کہتو بیا مبر　　آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا

حال دل ہوتا ہے حسرت کی نگاہوں سے عیاں　　میری اُسکی گفتگو میں اب زباں خاموش ہے

فرصت وقت ہے تدبیر کی خاطر لازم　　پھر سلجھتے نہیں جب آنسوؤں کے تار اُلجھے

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا　　کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

تشبیہ و استعارہ | اکثر موقعوں پر تشبیہ یا استعارہ سے کلام میں جو وسعت و زور پیدا ہوتا ہے وہ اور کسی طریقہ سے نہیں پیدا ہوسکتا۔ بعض موقعوں پر جب شاعر کوئی غیر معمولی دعویٰ کرتا ہے تو اسکے ممکن الوقوع ثابت کرنے کے لئے تشبیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب کسی نہایت نازک چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ و عبارت کام نہیں دیتی اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے انکو چھوا تو انکو صدمہ پہنچ جائیگا جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا ہے وہ اسی قسم کی نازک اور لطیف صورت کو ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے اور پیش نظر کردیتا ہے۔

تشبیہ ایک ایسی عام چیز ہے کہ ہر شخص اس سے کام لیتا ہے اس لئے جبتک تشبیہ میں کوئی ندرت اور خاص خوبی نہو وہ کوئی اثر پیدا نہیں کرسکتی، تشبیہ میں جن اسباب سے خوبیاں پیدا ہوتی ہیں اگرچہ اُنکا احصا نہیں ہوسکتا تاہم چند صورتیں مثال کے طور پر لکھی جاتی ہیں جن سے ایک عام خیال قائم ہوسکے۔

ہر تشبیہ ابتدا میں نادر اور پُر لطف ہوتی ہے لیکن بار بار کے استعمال سے اسکی تازگی اور ندرت جاتی رہتی اور بے اثر ہوجاتی ہے اس لئے شاعر کا فرض ہے کہ نادر اور جدید تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈھ کر پیدا کرے بڑے بڑے شعرا کا معیار کمال یہی ہے کہ انکے کلام میں اچھوتی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے پائے جاتے ہیں۔

تشبیہ مرکب عموماً زیادہ لطیف ہوتی ہے مرکب سے یہ مُراد ہے کہ کئی چیزوں کے ملنے سے جو مجموعی حالت پیدا ہوتی ہے وہ تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کیجائے۔

اب آتش کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

روئے روشن کے تصور کی تشبیہ برق سے ہے اس سے یہ بلاغت پیدا ہوئی کہ جب تصور میں برق کے اوصاف موجود ہیں تو خود روئے روشن کیسا ہوگا ؎

تصور ہر نفس ہے پیشِ چشم اُس روئے روشن کا — نگہباں برق کو بیٹھے کیا ہے اپنے خرمن کا

درویشوں کی جائے اقامت (تکیہ) کے کوڑے کی تشبیہ گلدستہ بزم شہاں سے۔ اس طرح عظمت فقر نمایاں ہوتی ہے

گلدستہ بنکے رونق بزم شہاں ہوا — کوڑا جو اس فقیر کے تکیہ سے جھڑ گیا

گردش ایام کی تشبیہ در غلطاں سے اُسکے بعد اپنے آپکو گردش ایام کے اختر سے استعارہ کیا ہے

ایک جا مثل دُرِ غلطاں کہیں ٹھہرا نہ پاؤں — اختر اقبال ہوں میں گردش ایام کا

خشت بالیں کی تشبیہ زانوئے حور سے

سختیٔ ایام ہے میرے لئے سامان عیش — خشت بالیں کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا

انسان کی تشبیہ چوب خشک صحرا سے جس سے بیکسی و غریب الوطنی کا اظہار نہایت قوت سے ہوا ہے

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

بہار کی تشبیہ زخم نم سے اور خزاں کی زخم خشک سے

ناگفتنی ہے حال بہار و خزان باغ — اک زخم ہے کہ خشک ہوا اور نم ہوا

بلبل خطیب ہے اور گلبن منبر

خطبہ بلبل نے پڑھا تیری بہار حسن کا — نام گلبن سنتے تھے جبکا وہ منبر ہو گیا

بدن کی تشبیہ شہر سے دل کی بادشاہ سے حواس خمسہ کی سپاہ سے

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں — حواس خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں

سطح آئینہ کی تشبیہ تالاب سے اور معشوق کے عکس چشم کی کنول کے پھول سے

آئینے میں عکس چشم یار کا عالم نہ پوچھ — دیکھ لے آکر کنول پھولا ہوا تالاب میں

صوت عندلیب نغمۂ داؤد ہے۔ دفتر گل زبور ہے

کرتا ہے نغمہ صورت داؤد عندلیب — عالم ہوا ہے دفتر گل پر زبور کا

جدت و لطف ادا — شاعری کے لئے یہ سب سے مقدم چیز ہے بلکہ بعض اہل فن کے نزدیک جدت ادا ہی کا نام شاعری ہے ایک بات سیدھی طرح سے کہی جائے معمولی بات ہے۔ اسی کو اگر جدید انداز اور نئے اسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے اسکی مثالیں آپ کو انتخاب میں ہر جگہ ملینگی۔ مثلاً۔

کہنا صرف اسقدر ہے کہ پاؤں کے آبلے خار صحرا نے توڑے۔ اُسکو اس طرح ادا کیا ہے کہ شعر میں بجد

مزہ پیدا ہو گیا ہے

آبلے پاؤں کے کیا تو نے ہمارے توڑے — خار صحرائے جنوں عرش کے تارے توڑے

یا کہنا صرف اسقدر ہے کہ حشر میں بھی دیدار غدار النصیب ہو گا اسکو اس طرح ادا کیا ہے

اٹھ چکا روز قیامت روئے قاتل سے نقاب — عرصۂ محشر نگہ کے تیر کی منزل ہو

حسن ادا | لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کمزور ہو گا تو یہ بھی کمزور ہو گی پس اگر معنی میں نقص ہو اور لفظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائیگا جسطرح لنگڑے یا لنجے میں روح موجود ہوتی ہے لیکن بدن میں عیب ہوتا ہے اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں لیکن مضمون اچھا ہو تب بھی شعر خراب ہو گا اور مضمون کی خرابی الفاظ پر بھی اثر کریگی اگر مضمون بالکل لغو ہو اور الفاظ اچھے ہوں تو الفاظ بھی بیکار ہونگے جس طرح مردہ کا جسم کہ یوں دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے لیکن در حقیقت کچھ بھی نہیں اسی طرح مضمون گو اچھا ہو لیکن الفاظ اگر برے ہیں تب بھی شعر بیکار ہو گا کیونکہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں جاتی۔

آتش اس گر کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھا اور اُسکے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں الفاظ و معانی میں توازن ہے۔ ناظرین اشعار نقل کردہ ملاحظہ فرمالیں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بعض جگہ اس خوبی کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اُسکے کلام میں غضب کی سلاست و روانی و موسیقی ہے۔ الفاظ کے برمحل صرف کا بادشاہ ہے محاورہ و روزمرہ کا برجستہ و بے ساختہ استعمال شعر میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

سادگی ادا | اسکے یہ معنی ہیں کہ جو مضمون شعر میں ادا کیا گیا ہے بے تکلف سمجھ میں آجائے آتش کے پورے کلام میں شاید ہی دو تین شعر ایسے ہوں جنکا مفہوم مغلق ہو ورنہ ہر شعر صاف اور آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔

واقعیت | یہ ضرور نہیں کہ شعر میں جو کچھ کہا جائے سرتاپا واقعیت ہو بلکہ غرض یہ ہے کہ اصلیت کے اثر سے خالی نہو۔ یہ صفت بھی آتش کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اُسکے کلام میں تاثیر کا راز یہی ہے کہ حقیقت پر مبنی ہے اور مبالغہ حد سے متجاوز نہیں ہے۔

کلام آتش کے امتیازی خصوصیات | ۱۔ تعلیم اخلاق ۲۔ بانکپن
۳۔ صائب کی طرح برجستہ مثال سے کسی دعوے کو ثابت کرنا۔
۴۔ کبیر کی طرح معنی خیز اُلٹی بات کہنا۔ ۵۔ پوری پوری غزلیں ایک ہی مضمون میں۔
۶۔ قافیہ و ردیف کا اسطرح دست و گریباں ہونا کہ یہ معلوم نہو شعر کسی قافیہ کو پیش نظر رکھکر کہا گیا ہے۔ یہ بات سہل و شگفتہ طرحوں ہی میں نہیں بلکہ سنگلاخ زمینوں میں بھی موجود ہے۔

بانکپن | آتش سپاہی تھا اور حد درجہ غیور۔ چند اشعار جن میں فن سپہگری یا اسکے متعلقات کا اشارہ ہے درج کئے جاتے ہیں

فوج کے افسر کو لڑائی کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ہوتا ہے قدرتی طور پر اُسمیں وہ جوش نہیں ہو سکتا جو معمولی سپاہی میں ہوتا ہے جسکا فرض بہادری سے لڑنا اور مارنا یا مرجانا ہے۔ ؎

حرارت ہوتی ہے سردار سے افزوں سپاہی میں زیادہ تر مزاجِ یار سے زلفوں میں بل پایا

جو مرد ہیں وہ لڑائی میں چہرے پر زخم کھاتے ہیں دشمن کو پیٹھ نہیں دکھاتے ؎

روک منہ پر وارِ قاتل کا سپر کی طرح سے مرد کے چہرے کا زیور زخم ہے شمشیر کا

معرکہ میں سر قلم ہو جائے مگر سپاہی کا قدم پیچھے نہیں ہٹتا ؎

پیچھے ہٹا نہ کوچۂ قاتل سے اپنا پاؤں سر سے تڑپ کے چار قدم آگے دھر گیا

سپاہی سنمکھ لڑکر مرتے ہیں اور یہی اُنکی معراج ہے ؎

غنیمت جان لے دل جنبشِ ابروئے قاتل کو بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

آتش پنوٹ بھی جانتے تھے۔ پنوٹیا جب نرغے میں گھر جاتا ہے اور جانتا ہے کہ اب تلوہ بچنا مشکل ہے تو یہ سوچتا ہے کہ کدھر کی چوٹ بچائے اور کدھر کی چوٹ کھائے ؎

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

میدانِ جنگ میں بہادر سپاہی کا چہرہ جوش اور خوشی سے تمتما اُٹھتا ہے بزدل کا چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا ہے ؎

کیفیت شراب ہے جو ہر شجاع کا ہوتا ہے چہرہ غازیوں کا وقتِ جنگ سرخ

جب رن پڑتا ہے اور ہر طرف لاشوں کے ڈھیر ہوتے ہیں تو میدان جنگ کا یہ نقشہ ہوتا ہے گویا "تلوار کا کھیت ہے" ؎

چاکِ پیراہن ہر اک گل کا بعینہ زخم ہے کھیت ہے تلوار کا یارب کہ میدانِ بہار

فوج میں بھرتی ہونے کو چہرہ لکھوانا کہتے ہیں ؎

کبھی کچھ کام بھی آئے تو تیری ہمتِ عالی مگر چہرہ ہی لکھوایا ہوئے آتش سواروں میں

فوج میں ہزاروں سپاہی ہوتے ہیں مگر جانباز کم ہوتے ہیں ؎

ہراساں ہوتے ہیں کب مرد یکہ تاز کثرت سے کوئی دو چار ہی جانباز ہوتے ہیں ہزاروں میں

سپاہی اچھی تلوار کو سونے میں تول کر خریدتے ہیں اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں ؎

دوست رکھتے ہیں جواں مرد اہلِ جوہر یار کو　　قول کر زر سے سپاہی لیتے ہیں تلوار کو

جواں مرد غافل دشمن پر حملہ نہیں کرتے بلکہ پہلے ٹوک دیتے ہیں ؎

قدم مردانگی کے ساتھ مارا دستداری میں　　کیا ہشیار غافل پاکے اگر دیکھے دشمن کو

بہادر سپاہی کسی بزدل سے جنگ کرنا اپنی ننگ سمجھتا ہے اس کے بدلے یہ گوارا ہے کہ سپر کو چیر ڈالے اور تلوار توڑ ڈالے کیونکہ سپاہی کی بے عزتی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ اُسکی تلوار و سپر دشمن کے قبضہ میں جائے ؎

نامرد آسماں سے گوارا ہے کسکو جنگ　　آتشؔ سپر کو چیریئے تلوار توڑیئے

برجستہ خیال | اس قبیل کے اکثر اشعار انتخاب میں ملیں گے۔ دو چار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

سعیٔ لاحاصل مداوائے مریضِ عشق ہے　　تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

جان غیریں ہو فراق یار سے کیونکر عزیز　　مرگ صاحب خانہ ہے قلقہ جو مہماں رہ گیا

خراب مٹی نہ ہو کسی کی نہ کوئی مردود دوستاں ہو　　جدا ہو اشاخ سے جو پتا غبار خاطر ہوا چمن کا

دل کو ابروئے صنم کا شیفتہ کرتی ہے آنکھ　　درس دیتا ہے معلم پہلے بسم اللہ کا

معنی خیز الٹی بات | آتشؔ خود کہتے ہیں ؎

بیہودہ گفتگو نہیں مرد فقیر کی　　سیدھی ہے سمجھے تو اگر اُلٹی کبیر کی

چند اشعار سنئے ؎

ایک دن فرصت جو میں برگشتہ قسمت مانگتا　　دیدۂ تر نوح کے طوفاں کی رخصت مانگتا

رہ گئی عزت خموشی کے سبب سے شکر ہے　　زہر دیتا آسماں مجھکو جو شربت مانگتا

کیا کہوں آتشؔ اثر اپنی زباں کمبخت کا　　تنگ ملتی گور تیرہ گر فراغت مانگتا

زندگانی نے مجھے مردہ بنا رکھا ہے　　ملک الموت سے سائل ہوں مسیحائی کا

پوری پوری غزلیں ایک مضمون میں | ایک دو کہیں اور درج ہوئیں دو اور سُن لیجئے۔

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا　　بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی　　سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

وہ شب تھی کہ تھی روشنی جسمیں دن کی　　زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

نکالے تھے دو چاند اُس نے مقابل　　وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل　　فرحناک تھی روح دل شادماں تھا

مشاہد جمال پری کی تھیں آنکھیں — مکان وصال اک طلسمی مکاں تھا،
حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی — کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا
حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی — نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے، — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

غیرت مہر رشک ماہ ہو تم — خوبصورت ہو بادشاہ ہو تم
جس نے دیکھا تمہیں وہ مر ہی گیا — حسن سے تیغ بے پناہ ہو تم
فوق ہے سارے خوش جمالوں پر — وہ ستارے جو ہیں تو ماہ ہو تم
کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے — ہم گنہگار بے گناہ ہو تم
ہے تمہارا خیال مد نظر — جس طرف جائیں سد راہ ہو تم
دونوں بندے اسی کے ہیں آتش — خواہ ہم اسمیں ہو دیں خواہ ہو تم

قافیہ و ردیف کا دست و گریباں ہونا یہ خوبی پورے کلام میں موجود ہے۔ صرف ایک غزل سُن لیجئے، جس سے اندازہ ہوجائیگا ؎

ہوا ہے عشق ہمکو اسکے حسن پاک سے پیدا، — کیا ہے نور سے گلگوں کو جسنے خاک سے پیدا،
کلام صاف کو اپنے جو دیکھے اسکو حیرت ہو — یہ آئینہ ہوا ہے جوہر ادراک سے پیدا
ترے تیر نگہ پر دم نہ کس نخچیر کا پھڑکا — نہ کی دلبستگی کس صید نے فتراک سے پیدا
غم اپنے قتل ہونیکا نہیں غم ہو تو یہ غم ہے — نہ ہوگا کشتنی مجھ سا مرے سفاک سے پیدا
دماغ حضرت یعقوب عاشق اسکو کہتے ہیں — ہوئی ہے بوئے یوسف یار کی پوشاک سے پیدا
صدا یہ صید گاہ عشق میں آتی ہے برسوں سے — نشانہ تیر کا ہو راہ کر فتراک سے پیدا
پیام مرگ سے ہوتی ہے غمگیں روح کس خاطر — ملے گا خاک میں وہ جو ہوا ہے خاک سے پیدا
قدم سے تیرے دیوانوں کے آبادی کا عالم ہے — ہوا ہے شہر اک صحرائے وحشتناک سے پیدا
ہنر سے نیاریوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہم کو — مقدر میں جو دولت ہو تو ہو خاک سے پیدا
دعا ہے آتش خستہ ہی ہے، روز محشر کو، — یہ مشت خاک ہو شہ کربلا کی خاک سے پیدا

آتش کا درجہ شعرائے اردو میں آزاد نے بہت درست کہا ہے کہ :-

" اس عہد تک شعرائے لکھنؤ اُن اُستادوں کے شاگرد تھے جن کا ادبیات کمال دلی کے سرچشمہ

سے ملا تھا اور فصحائے لکھنؤ بھی ہر محاورہ کے لئے دلی ہی کو فخر سمجھتے تھے کیونکہ وہ اکثر انھیں بزرگوں کے فرزند تھے جنھیں زمانہ کی گردش نے اڑا کر وہاں پھینک دیا تھا۔ پس شیخ صاحب و خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلی کی قید پابندی سے آزاد کرکے استقلال کی سند دی اور وہی مستند ہوئی۔ اب جو چاہیں سو کہیں ہم نہیں روک سکتے۔"

اس موقع پر قاضی محمد صادق خاں اختر کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ یہ ہوگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں سے تھے مگر وطن چھوڑ کر لکھنؤ آ رہے تھے۔ جامع الکمالات شخص اور لکھنؤ کے مشاہیر شعرائے وقت میں شمار کئے جاتے تھے مرزا قتیل کے شاگرد اور تحصیلداری کے عہدہ پر مامور تھے .... غازی الدین حیدر والی لکھنؤ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا چونکہ انکی عمر کا بہت بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا اسوجہ سے شعرائے لکھنؤ انھیں بکمال فخر اپنا ہم صفیر و ہموطن بیان کرتے ہیں اور درحقیقت وہ اپنی قیامگاہ کے واسطے مایۂ افتخار و نازش تھے انھیں اکثر فنون میں کمال حاصل تھا۔ تبحر علمی کے علاوہ فن سخن در قالب شعر میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے بندش مضمون، نازک خیالی، قادر الکلامی اور خوشگوئی میں لاجواب تھے۔ مصحفی، انشا اور جرأت کے مشاعروں میں شریک ہوئے، آتش، ناسخ وزیر اور صبا کے زمانہ تک زندہ رہے .... بعد غدر ۱۸۵۸ء میں وفات پائی .... انکا کلام عنقا کا حکم رکھتا ہے (منقول از تذکرہ خمخانہ جاوید)

خوش قسمتی سے مجھے انکے دیوان کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ اور ایک ایسی کڑی مہیا کرتا ہے جسکے بغیر اُردو شاعری کی تدریجی ترقی کا سلسلہ نامکمل تھا۔ کیونکہ ابتک ہمارے پاس کسی ایسے موقر شاعر کا کلام موجود نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ شعرائے دہلی کے علاوہ جو لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے آتش و ناسخ کے پہلے خود لکھنؤ والوں کی شاعری کا کیا رنگ تھا۔ اختر کا دیوان اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے یہ ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے جس میں کہیں تو درد و سوز و گداز ہے کہیں شکوہ الفاظ کہیں مبالغہ و بلند پروازی کہیں سادگی و حقیقت نگاری۔ المختصر ایک طرف اساتذۂ دہلی میر و سودا و درد کا تتبع ہے اور ایک طرف طبیعت کی آزادی اجتہادی شان دکھا رہی ہے۔ یہ ادعا حقیقت سے بہت دور نہ ہوگا کہ وہ اختر ہی کی شاعری کے نقوش اول ہیں جنکو ناسخ و آتش نے اپنی اپنی اُفتاد طبیعت کے موافق اُجاگر کرکے دوبارہ پیش کیا۔ ناسخ سے اسوقت بحث نہیں، آتش کے دیوان میں متعدد ایسی غزلیں ہیں جنکی ہم طرح غزلیں اختر کے دیوان میں موجود ہیں اور تذکرہ آبحیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر ہی وہ شخص تھے جنھوں نے آتش و ناسخ کی ہمت بڑھائی اور آپس کے معرکوں پر اُبھارا۔

اس جگہ اختر و آتش کی دو دو ہمطرح غزلیں بلا انتخاب درج کئے دیتا ہوں تاکہ دونوں کے رنگ طبیعت

کی مماثلت و اختلاف کا اندازہ اور یہ بات ثابت ہوجائے کہ لکھنؤ کی زبان دہلی کی متابعت سے رفتہ رفتہ آزاد ہورہی تھی اور مقامی اثرات اپنا رنگ دکھلانے لگے تھے۔ میری تحریر سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونا چاہیئے کہ ناسخ یا آتش نے اختر کی غلامانہ تقلید کی صرف یہ منشا ہے کہ ایک حد تک اختر کی شاعری سے متاثر ہوئے آتش نے اور اساتذہ کے کلام کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اُنکی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں ایسی صورت میں یہ امر ناگزیر ہے کہ اُنکے کلام نے کچھ نقوش اُسکے دل پر نہ چھوڑے ہوں اور وہ اُن سے مستفید نہوا ہو' اب ہم طرح غزلیں ملاحظہ ہوں ؎

اختر

گل زباں پر اپنی وصف طرۂ جانانہ تھا ۔۔۔ سبزۂ طرف چمن یکسر بشکل شانہ تھا
عقل کل جن روز دں محو بازیِ طفلانہ تھا ۔۔۔ مائل مشق جنوں میرا دل دیوانہ تھا
شب تصور میں جمال اُسکا جو شمع خانہ تھا ۔۔۔ اشک آتش بار کا ہر قطرہ یاں پروانہ تھا
امتیاز کفر و دیں سے میں سدا بیگانہ تھا ۔۔۔ شمع جس گھر میں ہوئی روشن یہ دل پروانہ تھا
بحر ہستی کو کف قدرت نے دیکھا چیر کر ۔۔۔ نہ صدف میں ایک دل ہی گوہر یکدانہ تھا
برسوں ہم شہر و بیاباں میں اُسے ڈھونڈا کئے ۔۔۔ وائے محرومی جو اپنا ہمدم و ہم خانہ تھا
شب جوانی کی بسر یوں ہوگئی غفلت میں آہ ۔۔۔ دیدہ صرف خواب تھا اور گوش بر افسانہ تھا
خاک کا ہر ذرہ اُسکی رشک خور کیونکر نہو ۔۔۔ دل مرا آئینہ دار صورت جانانہ تھا
کوہ تنگ آیا تھا طفلوں کی تلاش سنگ سے ۔۔۔ جن دنوں وحشت پہ میرا یہ دل دیوانہ تھا
بزم یکرنگی میں دور جام وحدت دیکھکر ۔۔۔ غنچہ و گل ساں یں آپ ہی شیشہ و پیمانہ تھا
تھا وہی عاقل بہ بزم عاشقان سرفروش ۔۔۔ عشق میں اُس شوخ کے جو عقل سے بیگانہ تھا
شمع عارض کا تری چرچا جو پھیلا باغ میں ۔۔۔ برگ برگ غنچہ شاداب واں پروانہ تھا
خانۂ دل تھا مرا مسکن اُسی دلدار کا ۔۔۔ گر مقیم کعبہ تھا یا ساکن بت خانہ تھا
خلق عالم کو کیا شیخ و برہمن نے اسیر ۔۔۔ فی الحقیقت سبحہ و زنار دام و دانہ تھا
بعد مُردن بھی جو دیکھا اختلاط کشتاں ۔۔۔ خم بنا کوئی سبو کوئی کوئی پیمانہ تھا
خاک پا تا اختر اسکے دور میں صہبائے عیش ۔۔۔ آسمان لاجوردی واژگوں پیمانہ تھا

آتش

گوش زد جسکے تمھاری چشم کا افسانہ تھا ۔۔۔ آہوئے مست اُسکی آنکھوں میں سگ دیوانہ تھا

شب جو آنکھوں کو خیال گیسوئے جانانہ تھا
پنجۂ مژگاں کو حکم دست خشک شانہ تھا

خواب میں مجھکو خیال نرگس مستانہ تھا
آنکھ کھولی تو لبالب عمر کا پیمانہ تھا

ملے پری پیکر نہ جب تک میں ترا دیوانہ تھا
یہ جو روشن ہے چراغ حسن بے پروانہ تھا

حسن عالمگیر چھپتا ہے چھپائے سے کہیں
پردہ میں تو کوچہ و بازار میں افسانہ تھا

اُٹھتے ہی تیرے دگرگوں ہوگیا رنگ نشاط
جام خالی میکدہ میں سنگ ماتم خانہ تھا

واہ رے انداز و ناز اللہ رے کبر و غرور
جان یاں جاتی رہی واں ناز معشوقانہ تھا

آج کل سے سلسلہ مہر و محبت کا نہیں
عالم ارواح میں میرے ترے یارانہ تھا

نیند اڑ جاتی جو سنتا یار میرا حال دل
خواب شیریں تلخ کر دیتا یہ وہ افسانہ تھا

بحث علم عشق کے قابل نہ تھا دونوں میں ایک
کوہکن بے مغز تھا مجنوں جو تھا دیوانہ تھا

پردہائے گوش تک سننے کو آجاتی ہے جان
کسقدر دلچسپ حسن یار کا افسانہ تھا

حال پر اپنے توجہ کی نظر تھی جن دنوں
آفتاب ذرہ پرور جلوۂ جانانہ تھا

جوہر جام جہاں بیں سنکے یہ روشن ہوا
بادۂ نیرنگ سے لبریز اک پیمانہ تھا

لعل لب دونوں تھے اے محبوب لعل شب چراغ
دانت تھا جو تیرے منہ میں گوہر یکدانہ تھا

مشق ناوک افگنی کرتا تھا جب وہ شمرد
سیکڑوں ہی تودۂ خاکستر پروانہ تھا

مصحف روئے حقیقت کی تلاوت سے کھلا
عشق معشوق مجازی ابجد طفلانہ تھا

ساقیا تعریف تیرے میکدہ کی کیا کروں
ساتھ کیفیت کے تھا لبریز جو پیمانہ تھا

بسکہ رکھتا تھا ہر اک الماس ہیرے کی چمک
جوہروں سے خنجر قاتل جواہرخانہ تھا

واہ ری نیرنگ سازی طلسم زندگی
محو بت آنکھیں تھیں دل اللہ کا دیوانہ تھا

سایۂ بال ہما سے سرفرازی تھی حصول
بادشاہ وقت زلفوں میں تمہاری شانہ تھا

بھول کر تجھکو گئے مشکل میں کرنے یاد ہم
آشنا تھا تو سوا تیرے جو تھا بیگانہ تھا

روشنی دل میں تصور سے تھی حسن یار کے
گنج کی دولت سے مالامال یہ ویرانہ تھا

حسن دیکر عاشق شیدا دیئے اللہ نے
ان بتوں کو لازم آتش سجدۂ شکرانہ تھا

Delhi

اختر

شوق گلشن ترے عاشق جو سدا رکھتے ہیں
سینہ داغوں سے چمن زار بنا رکھتے ہیں

عادت گرم روی اہل فنا رکھتے ہیں   برق ساں اس لئے آتش تہ پا رکھتے ہیں
کشورِ عشق میں بیکار ہے اعجاز مسیح   لوگ یاں مرگ سے اُمید شفا رکھتے ہیں
دل عشاق چرا لیویں نہ کیونکر سر دست   آپ مٹھی میں چھپا دزد حنا رکھتے ہیں
لینے والوں سے یہ کہدو عوض نقد جفا   جنس دل بیچتے ہیں مال وفا رکھتے ہیں
توڑ کیا پوچھے ہے تو تیر نگہ کا ظالم   دیکھ لے سینۂ غربال نما رکھتے ہیں
کب تلک جور و جفا خوف نہیں تمکو ذرا   اے ستم پیشہ بتاں ہم بھی خدا رکھتے ہیں
جان دی ہمنے ہوئی تب غم ہجراں سے نجات   عقلا اس لئے کچھ چیز لگا رکھتے ہیں
لوگ جب سنتے ہیں قصے ترے دیوانوں کے   قیس و فرہاد کے افسانے اُٹھا رکھتے ہیں
ہاتھ دامن تلک اُنکے جو نہ پہنچا میرا   بولے وہ آپ بھی کیا بخت رسا رکھتے ہیں
جان دے بیٹھیں تو دیکھے نہ کبھی آنکھ اُٹھا   ایسے بیدید سے ہم چشم وفا رکھتے ہیں
کوئی پتھر جو گلی کا تری ہاتھ آتا ہے   گل کی صورت اُسے ہم سر پہ اُٹھا رکھتے ہیں

قطعہ

ہمنشیں کیا کہوں تجھ سے یہ بتان مہوش   ستم و جور کا انداز نیا رکھتے ہیں
کرکے کاہیدہ غم ہجر سے مانند ہلال   اپنے عاشق کو یہ انگشت نما رکھتے ہیں
عرض بندے کی ہے اس بزم میں تقصیر معاف   گرچہ سامان سخن سب شعرا رکھتے ہیں
پر ذرا دیدۂ انصاف سے گر کیجے غور   شیوۂ شاعری ہم سب سے جدا رکھتے ہیں
عزم جانبازی ہے خضر رہ مقصد اختر   تیغ سے ہم طلب آب بقا رکھتے ہیں[1]

---

[1] اختر کو قطعات کہنے کا بہت شوق تھا۔ یہ مشہور قطعہ اُنھیں کا ہے ؎

کل بن کے شیخ مجتہد العصر آ گیا   دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا
کہنے لگا زراہ تبختر مجھے یہ طنز   معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
ہمنے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے   پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں   کیجئے جو آپ مجھکو مورد عتاب کا
تقویٰ ہمارے آگے ہو تب آپکا درست   اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
مے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش   اور واں محل نہو کوئی باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب   دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منھ سے منھ   یہ ریش جسپہ جلوہ ہو رنگ خضاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیجے   گر پی نہ جائیے جلد یہ پیالہ شراب کا
اسوقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو   گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا
اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام   قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

آتش

گیسوئے نگار ترے سودا شعرا رکھتے ہیں ۔ یہی باعث ہے جو یہ فکر رسا رکھتے ہیں
تاب دیدار نہیں رکھتے ہیں یا رکھتے ہیں ۔ چشم بینا ترے مشتاق لقا رکھتے ہیں
تیرے خونی کفنوں کی یہ ادا رکھتے ہیں ۔ پھول لالے کے لباس شہدا رکھتے ہیں
دست و پا میں جو حسیں رنگ حنا رکھتے ہیں ۔ خون ہفتاد و دو ملت کا روا رکھتے ہیں
سچ تو یہ ہے کہ نہیں دوسرا تجھ سا کوئی ۔ اے صنم جھوٹ نہ بولینگے خدا رکھتے ہیں
کون سے پارۂ دل پر نہیں اک عشق کا داغ ۔ یہ نگیں وہ ہیں کہ جو نقش وفا رکھتے ہیں
نرم کر دینگے دل سخت صنم کو دم سرد ۔ شرط الفت کی بھی اعمال جزا رکھتے ہیں
قلزم عشق میں تنکے کا سہارا بھی نہ ڈھونڈھ ۔ آسرا وہ نہیں لیتے جو خدا رکھتے ہیں
روئے خورشید پر افشاں کا جو عالم دکھلائیں ۔ یہ شرف ذرۂ خاک شہدا رکھتے ہیں
پاؤں کو منزل مقصود میں مضطر سمجھے ۔ طاقت اُٹھنے کی اگر دست دعا رکھتے ہیں
حال دل کہتا ہے یوسف نہیں سنتا کوئی ۔ گوش کر قافلے والوں کے درا رکھتے ہیں
محتسب عقل جو رکھتا ہے تو خمخانے نہ جا ۔ شیشہ و جام مے ہوش ربا رکھتے ہیں
لامکاں دیر و حرم میں نہیں ہے آنے کا ۔ پاؤں وہ توڑیں جو یہ سر میں ہوا رکھتے ہیں
جامہ زیبوں سے میں تشبیہ گلوں کو کیا دوں ۔ جسمیں اک بند نہیں وہ یہ قبا رکھتے ہیں
تیرے صدقے کا سمجھتے ہیں مگر چو را بلا ۔ چار ابرو کو یہ آزاد صفا رکھتے ہیں
بحر الفت میں تباہی کا ہے اندیشہ کسے ۔ ناخدا جو نہیں رکھتے وہ خدا رکھتے ہیں
دہن یار کو ہم تو نہ کہیں جوہر فرد ۔ منطقی اسمیں جو حجت کریں جا رکھتے ہیں
جسم خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے ۔ اک قبا اور بھی ہم زیر قبا رکھتے ہیں
خوں جگر ہوتا ہے جو سنتا ہے رو دیتا ہے ۔ درد آمیز فقیر اُسکے صدا رکھتے ہیں
اپنے ہر شعر میں ہیں معنیٔ تہ دار آتش ۔ وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

اختر کے علاوہ آتش نے دیگر شعرائے اُردو میں میر و سودا و درد کا کلام بغور مطالعہ کیا ہے اور اُنکی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں بعض مقطعوں میں اسکا حوالہ بھی ہے مثلاً ؎

پھروں ہی مصرع سودا ہے رُلاتا آتش ۔ مجھ سے اے دیدۂ گریاں ہوا تھا سو ہوا
آتش یہ وہ زمین ہے کہ جس میں شفیق من ۔ سودا ہوا ہے میر سے اُستاد کی طرف

آتش بقول مصرع سودا غرض نہیں — یکدست اگر زمانہ جہاں کے نٹائے گل

آتش یہ وہ زمیں ہے کہ جسمیں بقول درد — دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

فارسی کے کسی شاعر کا حوالہ سوا صائب کے نظر سے نہیں گزرا۔

آتش یہ وہ زمیں ہے کہ صائب نے ہی کہا — خوشتر ز گو شوارہ بود گوشمال دوست

ان سب کے رنگ کی جھلک اُسکے کلام میں موجود ہے۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ مضمون آفرینی و بلند پروازی اور آتش زبان کی صفائی اور محاورہ و روزمرہ کے بادشاہ مانے جاتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے رنگ میں کہنے اور سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی، دونوں کامیاب نہیں ہوئے۔ گو خود اُنکا خیال کچھ ہی ہو۔ یقیناً ادھر ناسخ نے بھی آتش کا رنگ اختیار کرنا چاہا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

خود غلط ناحق ہوں تقلید آتش سے ہلاک — جو رکب منصور بن سکتا ہے کھنچ کر دار پر

آتش و ناسخ کے شاگردوں اور متبعین کے دو گروہ لکھنؤ میں قائم ہو گئے اور اپنے اپنے اُستاد کا رنگ نباہنا چاہا۔ ناسخ کے شاگردوں میں خواجہ وزیر بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ آتش کے شاگردوں میں صبا و بندہ اُنکے قدم بقدم چلے، مگر حق یہ ہے کہ وہ بات پیدا نہ کر سکے۔ خیالات میں وہ تازگی و ندرت نہیں ہے اگرچہ زبان بعض موقعوں پر آتش سے بھی زیادہ صاف اور منجھی ہوئی ہے۔

غالب | شاعر کم ہوتے ہیں متشاعر زیادہ۔ آتش کی شاعری (بجز اُن صورتوں کے جب ناسخ کے رنگ میں اُسکو شکست دینے کی بیہودہ و بے سود کوشش کی) حقیقت پر مبنی ہے اُسکی پیروی بہت کم لوگ کر سکے مگر ناسخ کا بگڑا ہوا رنگ عام ہو گیا۔ ایک بعید از قیاس بات فرض کر لی اور تناسب لفظی کی ایک عمارت کھڑی کر دی۔ بعد کے شاعروں میں سید صاحب تعشق آتش کے رنگ میں کامیاب کہنے والے گزرے اگرچہ سلسلۂ تلمذ ناسخ تک پہنچتا ہے۔ اُنکے بعد محمد کاظم جاوید نے بھی اس رنگ کو خوب نباہا۔ ابتدائے دور جدید میں پھر آتش کی طرف رجحان ہوا۔ معیار کے مشاعرے زیادہ تر ان تین اُستادوں کی طرح پر ہوتے تھے۔ میر۔ غالب۔ آتش۔ آتش کا رنگ منشی مرزا شرر اور نوبت رائے نظر کے کلام میں بہت نمایاں ہوتا تھا۔ پنڈت برج نراین چکبست بھی آتش وانیس کے معتقد تھے۔

باغِ آرزو

(ابوالفاضل خاں از چاندپوری)

اک گلشن راحت فزا اک لالہ زار رنگ و بو
اک باغ باغ دلکشا گہوارۂ جوشِ نمو
دنیائے عبرت خیز میں
پیشِ نظر ہے چار سو

ہر نخل، نخلِ طور ہے ہر شاخ، شاخِ گلفشاں
ہر برگ، برگِ نور ہے ہر گل، گلِ باغِ جناں
آئینۂ حسنِ نمو
ہر برگِ گل ہے بے گماں

بادِ صبا ہے موج زن مثلِ نسیمِ جانفزا
خنداں ہے ہر گل پیرہن مہکی ہوئی ہے کل فضا
مرغانِ خوش خوانِ چمن
نغمہ سرا ہیں جا بجا

بادہ کشانِ آرزو حلقہ بگوشِ بیخودی
وارفتگانِ آرزو منت پذیرِ سرخوشی
ساغر بلب، راحت بجاں
ممنونِ لطفِ زندگی

بیٹھے ہوئے ہیں بیخبر پروائے ننگ و نام سے
واقف نہیں مطلق مگر وہ گردشِ ایام سے
صد حیف! کوئی دہر میں
غافل ہو یوں انجام سے

مدوجزر عرفان

(مشہور انگریزی مصنفہ مس ایمیلی برانٹیز کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

(از مسٹر رگھوپت سہائے فراق بی اے)

دن ڈوبنے کو ہوتا ہے جب چلتے ہیں جھونکے ہوا کے
جب تارے نکل آتے ہیں گردوں پہ دھندھلکا پا کے
ہوتا ہے گداز انجم میں رک رک کے ہوا چلتی ہے
کچھ جلوے نظر آتے ہیں اور جان پر آ بنتی ہے

پہلے اک سناٹا سا خلقت پر چھا جاتا ہے
بے صبری مٹ جاتی ہے اور چین سا آ جاتا ہے
بنتا ہے خموشی ترنم دیکھتے ہوئے دل کا مرہم
اک بار بدل جاتی ہے دنیا کی ہستیٔ برہم

اُس وقت حقیقت پنہاں ہوتی ہے نمایاں یکسر
ہو جاتے ہیں اعضا بےحس کھل جاتے ہیں روح کے جوہر
پر سے جیسے لگ جائیں اس وقت مری ہستی کے
سب مرحلے کٹ جاتے ہیں رفعت کے اور پستی کے

لیکن وہ مجبوری بھی ہے رک جاتی ہیں جب یہ راہیں
جب کان لگیں سننے لگتے جب دیکھنے لگتی ہیں آنکھیں

جب چلنے لگتی ہیں نبضیں ۔۔۔ جب روح کو ہوش آتا ہے
اُس جسم عنصری کا جو ۔۔۔ زنجیروں میں جکڑا ہے

ولہٗ

دل ناداں تجھے قرار نہیں ۔۔۔ عشق میں اپنا اختیار نہیں
یوں تو دل بھی دکھا نہیں کرتا ۔۔۔ یوں تو تم بھی جفا شعار نہیں
کھینچ دیتا جنوں کی اک تصویر ۔۔۔ ہاتھ میں دامن بہار نہیں
حسن سرشار کی قسم اے دوست ۔۔۔ نشۂ عشق میں خمار نہیں
اور ہوگا کوئی مرا قاتل ۔۔۔ آپ کا حسن شرمسار نہیں
وہ گریباں کوئی گریباں ہے ۔۔۔ جو ترے غم میں تار تار نہیں
ہاں یونہی اُٹھ کے جھک گئی ہوگی ۔۔۔ ہاں نگہ تیری شرمسار نہیں
حسن کا ادعا سمجھتا ہوں ۔۔۔ تم کہے جاؤ بار بار نہیں
یہ بھی کوئی ادا ہے کیا تیری ۔۔۔ دل کو اک حال پر قرار نہیں
لوگ جی مر کے کاٹ دیتے ہیں ۔۔۔ ایسی تو شام انتظار نہیں

ہم نے افواہ سی سُنی ہے فراقیؔ
تیرے دل کو بھی اب قرار نہیں

پنشن

(از لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی)

ایک دن مجھ سے کیا اک پنشنر نے یہ سوال ۔۔۔ آدمی پچپن برس کے بعد کیوں بیکار ہے
میں نے اُن سے عرض کی باعث ہی اسکا انحطاط ۔۔۔ اور بھی اک بات لیکن قابل اظہار ہے
غور کیجئے "آدمی" کے ہوتے ہیں پچپن عدد ۔۔۔ پنشن اسکے بعد گویا فطرتی معیار ہے

علمی خبریں اور نوٹ

ہندستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے زیر اہتمام جو علمی وادبی کانفرنس ۱۳ لغایتہ ۱۵ دسمبر ۲۹ سنہ ء ہونیوالی تھی وہ آیندہ جنوری کے لئے ملتوی کردی گئی ہے۔

صوبہ پنجاب میں مصنفین و مؤلفین کی حوصلہ افزائی اور دیسی زبانوں کی ترقی کے لئے گورنمنٹ کیطرف سے ہر سال انعام دیا جاتا ہے۔ جو کم از کم پانسو روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپیہ کا ہوتا ہے۔ یہ انعامات پنجابی مصنفین کے لئے محدود ہیں، اور صرف ایسی کتابوں کے صلے میں دیئے جاتے ہیں جو عوام الناس کے واسطے مفید ہوں اور عام فہم سائنس۔ تاریخ۔ سیر و سیاحت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہوں یا خاص طور پر لڑکیوں اور طالب علموں کے لئے دلچسپ و فائدہ بخش ہوں، سیاسی کتابیں اور مذہبی متنازعہ تصانیف پر کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے

پچھلے سال کی جن مطبوعات پر انعام دیا گیا ہے انکے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ پنجاب میں اُردو، مصنفہٗ حافظ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور	ایکہزار روپیہ
۲۔ شری رک رکھیا، مصنفہٗ ڈاکٹر سولکھن سنگھ۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میڈیکل آفسر خالصہ کالج، امرتسر	سات سو روپیہ
۳۔ البیرونی کا بھارت (حصہ سوم) مصنفہٗ لالہ سنت رام بی، اے، لاہور	پانچسو روپیہ
۴۔ جڑی بوٹی (حصہ اول و دوم) مصنفہٗ ڈاکٹر سکھارام میدی رتا، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ لاہور	پانچسو روپیہ

امسال کی جو پنجابی مطبوعات ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء تک پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کے پاس پہنچ جائینگی اُنپر انعامات دیئے جانے کے متعلق غور کیا جائیگا۔

دیسی زبانوں کی ترقی اور اہل قلم کی حوصلہ افزائی کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے؛ ہندوستانی اکیڈمی کے بدولت ہمارے صوبہ کے اہل قلم کی قدردانی کا بھی سلسلہ نکل آیا ہے ہماری رائے میں دوسرے صوبوں کی گورنمنٹوں کو بھی ان مثالوں کی تقلید کرنی چاہیے۔

آجکل ملک کی سیاسی آب وہوا کچھ ایسی بگڑی ہوئی ہے کہ بعض لوگوں کو معمولی باتوں میں بھی تعصب کی جھلک دکھائی دیتی ہے، قاعدہ ہیکہ انسان جو خیال اپنے دل میں جمالیتا ہے اسکی ظاہری صورت اُسے خواہ مخواہ ہر جگہ نظر آنے لگتی ہے۔ متعصب شخص کی بھی یہی کیفیت رہتی ہے کہ جہاں کہیں تعصب کا شائبہ بھی نہیں ہوتا وہاں بھی اس غریب کو تعصب ہی کا بھوت نظر آتا ہے۔ ہمکو افسوس ہے کہ ایک خاص مقام کے چند خاص حضرات کو ناچیز زمانہ کی ایک مطبوعہ تصویر ناپسند ہوئی ہے اور محض ناپسندہی نہیں بلکہ ان خوش فکروں نے اس تصویر کی اشاعت میں جو ایک پرانے مرقع کی نقل اور ایک مشہور یوروپین مصور کے کمال فن کا نمونہ ہے، خدانخواستہ اسلام جیسے عظیم الشان مذہب کی توہین فرض کرلی ہے اسلام ہی نہیں بلکہ ہر مقتدر مذہب کی شان اس قسم کی بدگمانی سے کہیں بلند ہے، ہمارے معترضین اپنے مضحکہ انگیز کارروائیوں سے مذہب کی خدمت کرنے کے بجائے خود مذہب کے نام کو بدنام کررہے ہیں

ہمکو معزز ناظرین زمانہ سے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گزشتہ چھبیس سال کے اندر جب سے زمانہ جاری ہے اسکے کارکنان دانستہ طور پر کبھی کسی قسم کے تعصب کے شکار نہیں ہوئے ہیں اور زمانہ مذہبی اختلافات سے ہمیشہ بالا رہا ہے۔ اسکے کارپردازوں کی جماعت میں ہمیشہ مختلف خیالات وعقائد کے لوگوں نے بلالحاظ تفریق برادرانہ حیثیت سے کام کیا ہے، مجموعی حیثیت سے ہم دنیا کے سبھی بڑے بڑے مذہبی رہناؤں پیغمبروں اور اوتاروں کے روحانی عظمت کے قائل ومعتقد رہے ہیں۔

جن اصحاب نے رسالہ اگست کی تصویر کو اپنی غلط فہمی یا کسی مصلحت خاص سے اسلام پر ایک کھلا یا چھپا ہوا حملہ بیان کرکے ہمارے خلاف بدظنی پھیلانے کی ناپاک کوشش کی ہے اُنکو زمانہ بابت ستمبر ۱۹۲۹ء کا وہ مضمون پڑھ لینا چاہیئے جو ہماری درخواست پر ہمارے دوست مولانا سعید انصاری صاحب نے پیغمبر اسلام کے حسن اخلاق پر لکھا ہے، اس قسم کے مضامین کی موجودگی میں زمانہ پر تعصب کا الزام عائد نہیں ہوسکتا ہے۔ علاوہ بریں پچھلی فائلیں دیکھی جائیں تو بیسوں مضامین ایسے ملیں گے جنکا مطالعہ اس غلط الزام کو قطعی جھوٹا ثابت کردیگا۔ باایں ہمہ اگر کسی صاحب کو اس تصویر کی اشاعت سے واقعی کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا کوئی صدمہ پہونچا ہے تو ہم کو اسکا دلی افسوس ہے اور ہم انکو خلوص دل سے یقین دلاتے ہیں کہ بزرگان دین کی توہین کا خیال خواب میں بھی ہمارے دل میں کبھی نہیں آیا اور نہ آسکتا ہے۔

زمانہ

ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم بی اے

جلد ۵۳ — دسمبر ۱۹۲۹ء — نمبر ۶

فہرست مضامین

تصاویر:- حضرت مسیح اور گنگا کی عورت - پنڈت جواہر لال نہرو - ڈاکٹر کچلو - مہاراجہ سر چندر شمشیر جنگ بہادر - اور موسیو کلیمنشو

۱- دور لامذہبی میں مذہبی تعلیم
از پنڈت اقبال کشن کول شرغہ ... ۲۹۰

۲- اقلیم حیوانات کے عجائبات
از مسٹر جے - آر - رائے جرنلسٹ ... ۳۰۵

۳- لارڈ میو کا قاتل
از چودھری محمد علی وکیل ایبٹ آباد ... ۳۱۶

۴- وائسرائے کا اعلان
از بابو اننت پرشاد نگم بی - اے - ایل - ایل - بی ... ۳۲۵

۵- پنڈت جواہر لال نہرو
از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی ... ۳۳۰

۶- یاد رفتگان
(۱) مہاراجہ چندر شمشیر جنگ بہادر وزیر اعظم نیپال
(۲) کلیمنشو سابق وزیر اعظم فرانس ... ۳۳۵

۷- تنقید کتب
چمنستان شعراء - اردوئے معلی خطوط غالب - آل انڈیا مشاعرہ
ظہور رحمت - ہند کے جاں نثار وغیرہ ... ۳۳۹

۸- آزادی
از مسٹر شیام موہن لال جگر بریلوی بی - اے ... ۳۴۵

۹- آرزوئے صادق
از منشی بشیشر پرشاد منور لکھنوی ... ۳۴۸

۱۰- ہمارا شاعر
از جناب انیس احمد شرقی ... ۳۴۹

۱۱- لطف سخن
از حضرات ناشاد - فرخ - آہ - ساغر وغیرہ ... ۳۵۰

۱۲- لارڈ ارون کا اعلان ... ۳۵۳

۱۳- علمی خبریں اور نوٹ ... ۳۵۷

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت ممالک غیر سے سالانہ عہ ششماہی صہ ہندوستان کے لئے ششماہی ے

زمانہ

جلد ۵۳ — دسمبر ۱۹۲۹ء — نمبر ۶

دورِ لامذہبی میں مذہبی تعلیم

(از پنڈت اقبال کشن کول شر عاً)

تعلیم و کاشت تعلیم ایک قسم کی کاشت ہے۔ کاشتکار اپنی زمین میں طرح طرح کے بیج بوتا ہے۔ کبھی کبھی گرد و نواح کے کھیتوں سے بھی کچھ بیج منتشر ہوکر چلے آتے ہیں۔ یہ سب بیج جم سکتے ہیں۔ اُنمیں سے طرح طرح کے پودے نکل سکتے ہیں اور مختلف قسم کی پیداوار ہوسکتی ہے مگر محض تخم ریزی کافی نہیں بلکہ کامیابی کا انحصار بہت کچھ زمین کی زرخیزی پر ہے۔ علاوہ ازیں یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ کس موسم میں کون بیج بویا جائے۔ اگر موسم کا لحاظ نہ رکھا جائے تو کوشش بے سود ہوگی۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔ انسان کی طبیعت ایک قسم کی زمین ہے۔ زمانۂ طفولیت ایک نو توڑ زمین ہے معلم اور والدین اور گرد و نواح کے اشخاص صریحاً یا ضمناً، دانستہ یا نادانستہ اس انسانی زمین میں طرح طرح کے خیالات کی تخم ریزی کرتے ہیں مگر نتائج مختلف ہوتے ہیں یا بہ ظاہر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اسکی وجہ صاف ظاہر ہے کہ محض تخم ریزیٔ خیالات کافی نہیں بلکہ نتیجۂ مطلوب کا ظہور بہت کچھ زمین یا خلقی مادّہ پر موقوف ہے اور نیز اس امر پر کہ تخم ریزیٔ خیالات یعنی تعلیم و فہمایش کسوقت اور کس موقعہ پر کیجاتی ہے۔ زمین اور طبیعت انسانی دونوں کی کاشت کے کم از کم تین بڑے اجزا ہیں یعنی تخم۔ زمین اور موسم۔ ان اجزا کے مناسبت پر معلم یا کاشتکار کی لیاقت کی آزمائش ہوسکتی ہے۔

مذہب اور رفتار زمانہ اُمور بالا پر نظر رکھ کر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آجکل دنیا کا حال کیا ہے اور مذہبی تعلیم یا کاشت کے واسطے یہ وقت کیسا ہے؟ اس سوال کا کیا جواب دیا جائے؟ دنیا کا حال زار دیکھ کر ہر دور اندیش کو سخت فکر و انتشار ہے۔

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر مے بینم ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر مے بینم

نہیں معلوم کہ جسوقت یہ شعر تصنیف ہوا۔ اُسوقت زمانہ کی کیا کیفیت تھی مگر آجکل اور کچھ عرصہ سے دنیا کا بلا مبالغہ اور ہو بہو یہی حال ہے۔ نوکر مالک کا ہم پایہ ہونا چاہتا ہے۔ اولادیں والدین کی اطاعت

اور اطاعت کم ہوگئی ہے۔ جماعت اناث کو ذکور کے جبر ناروا کا شکوہ وگلہ ہے۔ ایک طرف کلوں اور مختلف کارخانوں کے مالک اور مہتم حصول دولت اور ازدیاد منفعت پر تُلے ہوئے ہیں دوسری جانب بیشمار کاریگر اور مزدور اضافۂ اجرت کے لیے لڑنے اور جان دینے کو تیار ہیں۔ یورپ کے مختلف ممالک اور خاصکر روس میں ایک بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ہے جو یہ کوشش او رتدبیر کر رہے ہیں کہ تعلقاتِ انسانی میں تفریق مدارج باقی نہ رہے اور سب کو ملک کی مجموعی دولت کا مساوی حصہ دیا جائے۔ نہ حاکم بلند ہو نہ محکوم بست، نہ کوئی دولتمند ہو نہ کوئی مفلس۔ سُنا جاتا ہے کہ اس قسم کے کچھ لوگ ہندوستان میں بھی پیدا ہوگئے ہیں جنکو دیگر ممالک کے ہم خیال اشخاص گمراہ اور خراب وخوار کر رہے ہیں۔ مگر یہ عالمگیر ہوائے مخالف بھی ایک ظہور قدرت اور قوانین عالم کا نتیجہ ہے۔ اس پر زیادہ تعجب یا افسوس کی ضرورت نہیں، اسمیں آثار نیک اور آثار بد دونوں موجود ہیں۔ معمولی نگاہ سے بھی صاف نظر آتا ہے کہ رسوم و انتظامات قدیم میں بہت سے نقائص پیدا ہوگئے ہیں اور بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ کن اُمور میں تبدیلی ہونی چاہیے اور تبدیلی کس طور سے ہو کہ عوام کو نقصان نہ پہونچے۔

زمانہ کی ہوائے تند کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان خواب گراں سے بیدار ہوا اور مدت مدید کی غلامی کے بعد اپنی عاجزی وافلاس وکسرشان کو محسوس کرنے لگا۔ اب وہ ملکی آزادی کیواسطے مضطرب وبیقرار ہے اور حاکمانِ وقت سے اپنے حقوق حاصل کرنے کیواسطے تندو مد سے کوشش کر رہا ہے۔ یہ بہت مناسب اور معقول ہے۔ لیکن جہاں کہیں کوئی خوبی ہوتی ہے وہاں کسی نہ کسی قسم کا نقص بھی پایا جاتا ہے، جہاں گل ہے وہاں خار بھی ہے۔ ملکی حقوق کے حصول کی کوشش میں مختلف مذاہب کی جماعتوں اور فرقوں کو یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ کہیں دیگر اشخاص ہم سے سبقت نہ لیجائیں اور بعد ازاں ہم پر جبر وتعدی کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی بے اعتباری اور بے لطفی زیادہ ہوگئی اور بارہا زدوکوب اور کشت وخون کی نوبت آئی۔

ایسے حالات میں خواہ مخواہ یہ فکر ہوتی ہے کہ اس بدنظمی اور باہمی حسد ومخاصمت کی وجہ کیا ہے؟ بعض نام برآوردہ اور بہت سے معمولی اشخاص کی رائے ہے کہ اس شور وشر کا باعث اختلاف مذہب و قید خورد ونوش ہے بلکہ مذہب بذاتِ خود مُضر ومخرب انسان ہے۔ یہی ہر جگہ ترقی میں سدِراہ ہے۔ یہی ہر جگہ تفرقہ انداز اور بانیٔ فساد ہے۔ لہذا مذہب کو نیست ونابود کر دینا چاہیے۔

برخلاف اسکے بہت سے فہمیدہ اشخاص کو یقین کامل ہے کہ ساری خرابیاں جو اس ملک میں ہیں انکی اصلی وجہ لامذہبی ہے۔ عام طور پر یہ کہنا بیجا نہوگا کہ مذہب کی روح پرواز کر گئی اور جسم مردہ پر

ہزار تازیانے ہیں سہ

بُت کا رہا نہ عشق نہ خوف خدا رہا ۔۔۔ باقی فسادِ گبر و مسلماں میں رہ گیا

اگر یہ خیال صحیح ہے تو ایسے وقت میں مذہبی تعلیم ایک امر دشوار ہے لیکن اسیوقت مذہبی ہدایت کی سخت ضرورت بھی ہے۔ خشک سالی میں زراعت مشکل ہے۔ مگر خشک سالی میں اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ جہانتک ممکن ہو زمین کی آبپاشی اور کاشت کی تدبیر کیجائے کہ خلق خدا کی جان بچے اور اُنکی تکالیف کم ہوں۔ آجکل مذہبی خشک سالی نظر آتی ہے۔ جن لوگوں کے خیال میں مذہب انسان کے واسطے نہایت مفید اور ضروری ہے اُنکو چاہئے کہ حتی الامکان مذہب کی کمی کو پورا کریں۔ مذہبی تعلیم اور ہدایت کیا ہونی چاہئے؟ یہ زیادہ تر ہر فرقہ بلکہ ہر خاندان میں علیٰحدہ علیٰحدہ طے ہوگا۔ لیکن زمانہ حال کی یہ ضرورت ہے کہ ہر خاندان اور ہر فرقہ کے باہر کل مذاہب کے رہنما اور معزز اشخاص اُن اجزائے ایمان اور احکام مذاہب پر زور دیں جن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خدا کی اُلفت کے ساتھ اُسکے بچوں کی اُلفت بھی ضروری ہے۔ اگر اُسکے بچوں سے بغض و عداوت ہے اور اُنکو گزند پہونچایا جاتا ہے تو اُسکی خوشنودی کسطرح حاصل ہوسکتی ہے۔ ابنائے جنس کی الفت اور خدمت ہر بندۂ خدا کا فرض ہے۔ اُنکو اذیت دینا گناہ ہے۔ یہ ہر معزز مذہب کی ہدایت ہے یہی بھگتی اور اہنسا کا مارگ ہے۔

اختلاف و اتحاد مذہب

ہر شخص کی نگاہ میں اُسکا مذہب صحیح ہے اور اُسکو اپنا مذہب دل سے عزیز ہے۔ اُسکی فطرتی خواہش ہوتی ہے کہ اسکے مذہب کو اور لوگ بھی اختیار کریں۔ اس خواہش میں اکثر خودغرضی شامل ہوتی ہے جس پر تعجب کرنا فضول ہے۔ لیکن خودغرض اشخاص کو علیٰحدہ رکھکر اگر نظر انصاف سے کل حالات کو دیکھا جائے تو اسمیں کوئی شبہہ نہیں کہ بعض حامیان مذاہب صدق دل و خلوص نیت اور محض مفاد خلایق کی غرض سے یہ چاہتے ہیں کہ اُنکا مذہب جسکو وہ بلاشبہہ صحیح سمجھتے ہیں ساری دنیا میں پھیل جائے اور اُمید کرتے ہیں کہ اسطرح کل انسان باہمی الفت و ہمدردی سے دنیا میں اپنی زندگی بسر کرینگے اور عقبیٰ میں راحت ابدی سے ہمکنار ہوں گے۔ یہ خواہش قابل تحسین و تعظیم ہے مگر اسکی کامیابی کی کوئی اُمید نہیں ہوسکتی۔ قوانین قدرت کی راہ یہ نظر آتی ہے کہ اختلاف و اتحاد ہر جگہ شریک رہیں۔ اگر قدرت کو محض یکسانی منظور ہوتی تو کل نباتات و حیوانات بالکل یکساں ہوتے۔ مگر دنیا میں طرح طرح کے پھول ہیں طرح طرح کے حیوان اور انسان ہیں۔ یہ سب مختلف ہیں لیکن باہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ اعضائے جسم کی صورت مختلف ہے مگر ان میں قریب ترین تعلق اور شرکت بھی ہے۔ دنیا میں سراسر یکسانی کہیں نہیں ہے اور اگر ایسی یکسانی ہو تو دنیا کی خوبی اور خوبصورتی غائب ہوجائے بلکہ دنیا کا وجود ہی باقی نہ رہے۔

علیٰ ہذا القیاس دنیا بھر کا مذہب کل اُمور میں یکساں ہونا ممکن ہے نہ مرغوب - ہر شخص کی حتی الامکان یہ کوشش ہونی چاہیے کہ پیروان مختلف مذاہب میں باوجود اختلاف ارتباط و اتحاد بھی رہے - اتحاد دنیا میں کوئی دشوار امر نہیں بشرطیکہ ہر شخص اپنے مذہب کی بنیاد پر نظر رکھے - شور و فساد کی نوبت اسوجہ سے آتی ہے کہ جاہل اور کوتاہ بین لوگ اُصول مذہب کو جو مشترک ہیں بھول جاتے ہیں یا اُن اُصول کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے اور فروع مذہب بلکہ محض الفاظ پر حجت و تکرار کرتے ہیں - جہاں طبع سلیم اور عقل رسا ہے اور مزاج تعصب سے مبرا ہے وہاں باوجود اختلاف ظاہری ہر مذہب و ملت میں ایک ہی نور حق کی شعائیں نظر آتی ہیں - ؎

کیا مسجد میں کیا مندر میں ــــــ سب کے اندر رام برا ہیں
درونِ ہر بتے جانیست پنہاں ــــــ بہ زیرِ کفر ایمانیست پنہاں
برہمن یا صنم کہتا ہے زاہد یا صمد یا رب ــــــ ہے جسکی جو زبان اُسمیں وہ تجکو یاد کرتا ہے

اُصول مذہب کی تعلیم کی ضرورت

غالباً ہر دور اندیش بہی خواہ ملک اُصول مذہب کی تعلیم کو نہایت ضروری اور مفید خیال کریگا - اسکے کئی وجوہ صاف ظاہر ہیں -

(۱) زمانۂ حال میں اور بہت عرصہ سے عوام کا میلان طبیعت یہ ہے کہ ہر قول کا ثبوت دیا جائے ہر قسم کی ہدایت کے ساتھ معقول وجوہ بیان کیے جائیں - یہ کافی خیال نہیں کیا جاتا ہے کہ فلاں قابل و معظم شخص کی ہدایت یہ ہے - اس پر عمل کرنا ضروری ہے - ہر کہ شک آرد کافر گردد - ایسا پہلے ہوتا تھا مگر وہ وقت گیا اب زمانہ سرکش ہے - اس صورت میں یا تو مذہب کو خیرباد کہا جائے یا اُصول مذہب کی حقیقت بیان کیجائے، نیز یہ ظاہر کیا جائے کہ ان اُصول اور فروغ انسان میں قریب ترین تعلق ہے -

(۲) ہر طرف توسیع علم کی کوشش ہو رہی ہے - حامیان تعلیم پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی نگاہ کو بھی وسیع کرنا چاہیے - اگر یہ مطلوب ہے، تو بچوں اور نوجوانوں میں خیالات مذہب کی اشاعت و توسیع سب سے زیادہ مفید اور ضروری ہے - مذہبی اُمور کو بچے خوب سمجھ سکتے ہیں اور اوائل عمر ہی میں مذہبی ہدایت کا زیادہ اور دیرپا اثر ہوتا ہے -

(۳) اُصول مذہب کی تعلیم سے مختلف مذہبی جماعتوں کے تعلقات میں بہتری کی اُمید ہے اسکی وجہ سے باہمی اتحاد زیادہ اور اتفاق دیرپا ہوگا -

(۴) دنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ انقلاب جاری رہا ہے - آجکل انقلاب بہت تیزی سے ہو رہا ہے - مذہب کے اُصول مستقل ہیں - فروع میں نئے شگوفے نکلتے ہیں اور کبھی کبھی شاخ خشک و مضر رساں

کی قطع و برید کرنی ہوتی ہے۔اگر اُصول و فروع مخلوط ہیں اور اُنہیں تیز نہیں کی جاتی تو خوف ہے کہ مصلحان پُرجوش و عاقبت نااندیش مذہب کو بیخ و بُن سے کھود کر پھینک نہ دیں۔

(۵) اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب کیواسطے ہوائے مخالف مختلف اطراف سے اور خاصکر ممالک مغربی کی جانب سے چل رہی ہے اور سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ کم از کم بیخ مذہب کو محفوظ رکھا جائے، اگر فروع مذہب کو نقصان پہونچے تو چنداں مضائقہ نہیں۔

مذہب اور مغربی تہذیب

بعض اشخاص کی رائے ہے کہ ہوائے مغرب نے ہندوستان میں لامذہبی پھیلائی ہے۔ ایک طرح سے یہ خیال غلط ہے۔نیک و بد یا مذہبی لامذہب اشخاص ہر خطۂ زمین پر موجود ہیں انگلستان یورپ اور امریکہ میں نیک اور خدا پرست اصحاب کی کثیر تعداد ہے۔تاہم اسمیں بھی شک نہیں کہ اقوام مغرب میں بہ حیثیت مجموعی مذہب کو بڑا زوال ہوا ہے۔زیادہ تر دولت، کھیل تماشہ، تیز رفتاری وغیرہ کی قدر ہے اور انکی زیادتی کا شوق اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ محض دنیاوی نگاہ سے بھی صاف خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔

بعض لوگ کہیں گے کہ موجودہ ترقیٔ دولت کی تحقیر کرنا محض بناوٹ ہے کھیل تماشہ سے کنارہ کشی یبوست دماغ کی علامت ہے اور تیز رفتاری سے خائف ہونا پست ہمتی ہے۔دیکھئے آجکل سامان آسایش وآرایش کس خوبی و افراط سے امیر و غریب کو میسّر ہیں۔خاصکر ممالک مغربی میں کیسی رونق ہے۔یہ سچ ہے دولت اور سامان راحت بہت مفید اور ضروری ہیں مگر اس سے بڑھکر سوال یہ ہے کہ انسان جسکے واسطے یہ سب سامان مہیا کیا گیا ہے وہ خود کیسا ہے اور اُسکے دل و دماغ کا کیا حال ہے؟ اگر اُسمیں جوہر انسانی زنگ آلود ہوگئے ہیں۔اگر صدق و صفا انسانی ہمدردی اور خوف خدا دل سے دور ہوگئے ہیں تو اہل ملک کو دولت اور وسائل و لبستگی سے کوئی حظ حاصل ہوگا اور اس بے بنیاد شان و تزک کی ظاہری چمک بھی چند روز میں غائب ہو جائیگی ؂

شمع پروانہ سے کہتی تھی یہی رو رو کر، رات بھر کی یہ تجلّی ہے سحر کچھ بھی نہیں

آلات حرکت اور خاصکر ہوائی جہازونکی تیز رفتاری کے فوائد بھی ظاہر ہیں، حال ہی میں بہت سے لوگ ان جہازوں پر سوار ہوکر کابل سے ہندوستان میں بخیریت آگئے۔اب انگلستان سے مسافر و خطوط اور پارسل بسطرح بالا بالا آنے لگے۔موٹر سائیکل اور موٹر کار کے کارنمایاں سے کون واقف نہیں اور ریل تو رفیق قدیم ہے۔ان سبکے فوائد میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ مگر جس بیقراری سے دنیا کو شوق تیز رفتاری ہے وہ سخت تعجب انگیز ہے۔اخباروں میں پے در پے نعرۂ تحسین بہ جوش و خروش بلند ہوتا ہے

کہ فلاں صاحب موٹر کار یا ہوائی جہاز کو فی گھنٹہ ۲۵۰ یا ۳۰۰ میل سے زیادہ تیزی کے ساتھ لیگئے (میلوں کی تعداد بخیال کمال صحت معہ کسور اعشاریہ دیجاتی ہے)۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور صاحب کو مرحبا کہا جاتا ہے کہ وہ آخر الذکر سے چند میل آگے بڑھ گئے۔ چند روز بعد یہ صاحب بھی پسپا ہوئے اور کوئی تیسرے شخص ان سے بھی سبقت لے گئے۔ اکثر نقصانات عظیم کی خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ دو جہاز یہاں لڑگئے۔ چار وہاں ٹکرائے۔ کچھ آدمی ایک سفر میں مفقود۔ کچھ دوسرے سفر میں مجروح اور کچھ طبقات ہوا سے گر کر راہی ملک بقا ہوئے۔ مگر باوجود ان حوادث کے شوق تیز رفتاری میں کمی نہیں۔ ایک معنی میں اسکا چنداں مضائقہ نہیں ہے کیونکہ جب کوئی بڑا کام عوام کے فائدہ کیواسطے جاری کیا جاتا ہے تو ابتدا میں مشکلات پیش آتی ہیں مگر فی منٹ پانچ یا چھ میل کی رفتار کیا درحقیقت مفید عام ہے؟ ہمیں بہت شک ہے۔ بہ ظاہر تیز روی کا یہ بیحد شوق ایک علامت اُس غیر معمولی اور خلاف طبیعت تیزی کی ہے جو فی زمانہ عوام کے مزاج و خیالات اور زندگی کی کل روش میں بطور ایک مرض کے پیدا ہوگئی ہے۔ شانتی اور سکون قلب مذہبی اعتقاد پر مبنی ہیں اور اگر روحانی گمراہی سے سکون و آرام باقی نہ رہا تو ہر قسم کی ترقی کی جڑ بھی کٹ جائیگی۔ حرکت اور سکون دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ ایک ادنی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دن بھر دوڑتا اور رات بھر بیچینی سے کروٹیں بدلتا رہے تو دوسرے دن اسکا بُرا حال ہوگا۔ اسیطرح جس شخص یا قوم کے طرز معاشرت میں خلاف فطرت تیزی پیدا ہوگئی ہے اُسکو کسی امر میں زیادہ کامیابی یا دیرپا عظمت کیا حاصل ہوگی؟ اُسکو راحت کیا ملے گی اور اُسکی زندگی کتنے دن باقی رہیگی؟

اہل ہند میں مذہب کا مادّہ

ہوائے مغرب کا اثر ہندوستان اور خاصکر اس ملک کے بڑے شہروں پر ضرور ہوا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان مقامات میں بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص لامذہب معلوم ہوتے ہیں مگر غالباً دلوں میں سرچشمۂ مذہب خشک نہیں ہوا ہے۔ ایک وجہ اس ظاہری لامذہبی کی یہ ہے کہ حسب رواج قدیم روحانی حالات و تعلقات کا اظہار ان صورتوں میں ہوتا ہے جو تعلیم یافتہ اور لطیف مزاج اشخاص کو بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ شاید زمانہ رفتہ رفتہ اسکی اصلاح کردیگا۔ مگر یہ جملہ معترضہ ہے، باوجودیکہ اقوام مغربی کا خراب اثر ہندوستان پر کم و بیش ہوا ہے تاہم شہروں میں بھی بہ حیثیت مجموعی مذہبی خیالات و عقائد ضعیف نہیں ہوئے ہیں۔ علاوہ بریں کروڑوں مرد اور عورتیں دیہات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے اشغال روزانہ و دیگر رسوم کا صریح تعلق مذہب سے ہے۔ مانا کہ اُن کے مذہبی خیالات تاریک اور محدود ہیں اور اُنکا دار و مدار زیادہ تر چند نمودار اشیای مادّی پر ہے، تاہم ان سادہ مزاج لوگوں کو اس امر کا احساس ہے کہ کسی مادّی شے یا کسی مقام کے پردہ میں کوئی

وحانی قوت نہاں ہے اور وہ قوت اُنکے اعمال کی نگراں اور اُنکے جان و مال کی محافظ ہے جسکی خوشنودی سے نفع کی اُمید اور ناخوشی سے نقصان کا احتمال ہے۔ یہ مذہب کی جڑ ہے جو کروڑوں ہندوستانیوں کے لوں میں تہ نشین ہے۔ یہ جڑ مستحکم معلوم ہوتی ہے اور اسکی وجہ سے شائد ہندوستان میں کبھی لامذہبی ا زیادہ غلبہ نہو گا۔ مگر شہروں اور دیہات کے باشندوں میں فرق کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ اہل ہند کی ایک ثیر تعداد کے واسطے۔ خاصکر بچوں اور نوجوانوں کے واسطے خواہ وہ شہروں یا دیہات میں رہتے ہوں، س امر کی ضرورت ہے کہ اُنکو مذہب کے بنیادی اُصول سمجھائے جائیں۔ اسمیں کامیابی کی اُمید ہے کیونکہ ہندوستان میں مذہب کا مادہ بخوبی موجود ہے۔

مارت قوم کی بنیاد تعلیم و ترقی انسان کو اکثر تعمیر مکان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ تشبیہ مناسب اور موزوں ہے۔ انسان اینٹ پتھر لکڑی وغیرہ سے اپنے لئے ایک مکان بناتا ہے۔ مکان کی خوبی یہ ہے کہ اُسکے ذریعہ سے لیس کے کل اغراض کی بہ آسانی و خوش اسلوبی تکمیل ہو۔ اسواسطے مختلف کمرے بنائے جاتے ہیں اور لازمی ضروری سامان فراہم کیا جاتا ہے مگر ان کمروں کی تعداد و ساخت اور سامان آسائش و آرایش کی خوبصورتی و افراط ایک طرف ہے۔ سب سے زیادہ ضروری لحاظ اس امر کا واجب ہے کہ بنیاد کیسی ہے۔ ایسا نہو کہ خفیف زلزلہ آنے پر کل مکان سرنگوں اور پاش پاش ہو جائے۔

مکان انسان کی ایک صنعت ہے۔ اسیطرح اور بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں انسان فرداً فرداً یا بحیثیت مجموعی بناتا ہے اور یہ خواہش اور کوشش رہتی ہے کہ یہ سب چیزیں مفید مطلب اور دیرپا ہوں۔ مجموعی صنعت سب سے زیادہ ظہور عمارت قوم کی تعمیر اور اُسکے اجزا کی ترتیب میں نظر آتا ہے۔ اغراض مجموعی کے حصول کے لیے مختلف انتظامات کئے جاتے ہیں۔ غلہ فراہم کرنے اور کپڑے بننے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ دھوبی، درزی، لوہار، موچی وغیرہ آسایش قوم کے واسطے مختلف کام کرتے ہیں۔ پولیس اور فوج کے ذریعہ سے حفاظت کا انتظام ہوتا ہے۔ مصوری، علم موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ سے زندگی کے لطف اور راحت کو زیادہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی تدابیر کیجاتی ہیں۔ مگر ان اجزائے قوم کی ترکیب کسی بڑے مقصد کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ وہ مقصد کیا ہے اور کسطرح پورا ہوگا؟ اس سوال کا جواب ہر معقول پسند شخص عام الفاظ میں یہی دیگا کہ اگر دنیا اور انسان کی حقیقت اور دونوں کے مرکز حیات اور دائرہ ممکنات پر نظر رکھ کر عمارت قوم کی بنیاد ڈالی جائے تو وہ عمارت عرصہ دراز تک قائم رہیگی، اور عوام کیواسطے مفید و راحت بخش ہوگی۔ اگر اس عمارت کی بنیاد پیشتر سے موجود ہے اور از سر نو رکھی نہیں ہے تو بھی اُس بنیاد کا استحکام اسی اصول کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

مذہب اور فروغ انسان

مرکز حیات و مدار کائنات کیا ہے؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔ لامذہبی کا ایک جواب ہے اور مذہب کا دوسرا۔ ایک خیال یہ ہے کہ دنیا تودۂ خاک ہے اسی خاک سے انسان پیدا ہوتا ہے اور عمر کوتاہ یا دراز کے بعد اسی خاک میں ملجاتا ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ وسیع و عجیب و غریب دنیا ایک روح اعظم کا ظہور ہے۔ اسی روح اعظم میں ارواح انسانی کا آغاز ہے اور اسی میں اُنکا انجام ہے۔ یہی روح اعظم مبدٔ قوت جسم و جان ہے۔ یہی بحر علم و کمال، یہی کان حسن و جمال۔ یہی چشمۂ سرور لازوال ہے۔ اسی کو بقا ہے اور سب کو فنا ہے۔ ان دونوں عقائد پر ہر شخص خود غور کرسکتا ہے۔ اگر انسان کو محض ریگستان مادہ میں سراب ہوا و ہوس کی تلاش کرنی ہے اور آخرکار اسی ریگستان میں دب کر معدوم ہوتا ہے تو اسکے واسطے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں، البتہ اگر دنیا مثل ایک جہاز کے کسی دریائے علم و قوت و الفت پر رواں ہے تو اس دریائے عظیم کی روش پر نظر رکھنا واجب ہے۔ اس طرح دریا سے مدد ملیگی اور منزل مقصود تک بہ آسانی رسائی ہوگی، ورنہ غرق ہوجانے کا خوف ہے۔ بہ الفاظ دیگر مالک حقیقی کی راہ اور اُسکے قوانین کو پہچاننا اور اُنکے مطابق مقاصد نیک میں کوشش کرنا اور باوجود مشکلات اپنے عقیدہ کو ضعیف ہونے نہ دینا انسان کا فرض ہے۔ یہی مذہب ہے یہی ست مارگ ہے، یہی راہ عقل و سعادت ہے۔ اسی پر ہر شخص اور ہر قوم کی اصلی اور دیرپا عظمت کی اُمید ہوسکتی ہے۔ خدا کشتیٔ اہل ہند کو طوفان جہل و فساد و بغض و عناد سے محفوظ رکھے اور ساحل اُمید تک بخیریت پہنچائے۔



اقلیم حیوانات کے عجائبات

(سائنس کی تازہ تحقیقات کی روشنی میں)

(از مسٹر جے۔آر۔ رائے جرنلسٹ)

(۱) عالم حیوانات کی ہمہ گیر وسعت

عالم حیوانات میں ہر قسم کے جاندار شامل ہیں جو کرۂ ہوا میں اُڑتے، سطح زمین پر دوڑتے اور سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں۔ قطبین کے برف بستہ خطے سرسبز وادیاں۔ لق ودق میدان، جھلستے ہوئے ریگستان۔ غرض روئے زمین کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی قسم کے جانور نہ پائے جاتے ہوں۔ متعدد اونچے پہاڑوں کی دس دس بارہ بارہ ہزار فٹ بلند ڈھلوانوں پر بھی کئی قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ امریکہ کا عالی حوصلہ محقق۔ کپتان پیری، ناروے کا مستقل مزاج سیاح، اموں سن اور ڈنمارک کا من چلا سائنس داں، نان سن جن کی عمر کا بیتی حصہ منطقۂ باردہ شمالی کی تحقیقات میں صرف ہوا ہے، بیان کرتے ہیں کہ دائمی برف کی سرزمین میں بیسوں قسم کے چھوٹے بڑے جاندار دیکھنے میں آتے ہیں۔ قطب جنوبی کے انتہائی برفانی علاقہ میں سر ارنسٹ شیکلٹن۔ کپتان اسکاٹ اور دیگر انگریز محققوں نے بہت قسم کے انوکھے پرندے مچھلیاں۔ چار پائے اور دیگر چھوٹے جان دار دیکھے اور انکے حالات اور فوٹو شائع کئے ہیں۔ ارباب تحقیقات نے سمندر کی بتیس ہزار فٹ گہرائی میں بیسوں قسم کے جاندار دائمی تاریکی اور دوامی خنکی میں زندگی بسر کرتے ہوئے پائے ہیں۔

اُڑنے۔ دوڑنے اور تیرنے والے حیوانات سے قطع نظر اقلیم حیوانات میں جانداروں کی ایک اور قسم بھی شامل ہے جو حشرات الارض کے نام سے مشہور ہے۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے دیمک اور چیونٹیاں شکم زمین کے اندر رہنے والے۔ روئیدگی پر پرورش پانے والے۔ بیسوں قسم کے جان دار دنیا کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں جراثیم بھی ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو نہ صرف ہوا ہی میں اُڑتے پھرتے ہیں بلکہ نباتات اور حیوانات کے اندر بھی رہتے ہیں۔ یہ ایسے چھوٹے اور لطیف ہوتے ہیں کہ سوائے اعلے

خوردبین کے نظر ہی نہیں آتے۔ پانی کی ایک بوند خوردبین سے ملاحظہ کرو تو اس کے اندر بکثرت ننھے ننھے جان دار ایک دوسرے سے دست بگریباں نظر آئیں گے۔ یہ بھی ساکنین اقلیم حیوانات میں شمار ہوتے ہیں خشکی کے جانوروں میں ہاتھی اور زرافہ، اور تری کے جانوروں میں وہل اپنے ڈیل ڈول کے لحاظ سے بہت ممتاز ہیں مگر ہزاروں برس پہلے اسی کرۂ ارض پر ہاتھی کی قسم کے ایسے بڑے بڑے جانور تھے جنکے سامنے ہمارا ہاتھی ایسا تھا جیسے گدھا اونٹ کے سامنے معلوم ہوتا ہے۔ یہ میمتھ کہلاتے تھے۔ رینگنے والے جاندار جواب پانچ ہزار قسم کے پائے جاتے ہیں، اگلے وقتوں میں پچاس سے لیکر اسی فٹ تک لمبائی میں اور پندرہ پندرہ بیس بیس فٹ اونچے تھے۔ اسی طرح اُڑنے والے جانوروں میں عقاب سے بیسوں گنا بڑے بڑے پرندے تھے۔ اب یہ سب معدوم ہو چکے ہیں۔ ان کی صرف ہڈیاں اور پنجر دنیا کے مختلف حصوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ قصّہ کوتاہ عالم حیوانات میں ہر قسم کے چرند اور پرند۔ پانی کے جانور۔ حشرات الارض اور جراثیم وغیرہ سب قسم کے جاندار شمار ہوتے ہیں۔

انواع نباتی اور حیوانی کا شمار

پروفیسر ڈبلیو۔ جے۔ جڈ اپنی تصنیف "کیمنگ آف ایویلوشن" میں لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں آکسفورڈ کے پروفیسر ایس۔ ایچ وائنز نے یہ تخمینہ لگایا تھا کہ روئے زمین پر دو لاکھ قسم کے پودے پائے جاتے ہیں۔ اگر ان میں ننھے پودے بھی شامل کئے جائیں تو انکا شمار تین لاکھ ہو جائیگا سنہ ۱۹۰۹ء میں پروفیسر شپلے نے جرمن ماہر گونتر کے تخمینہ کی ترمیم کرکے انواع حیوانی کی مجموعی تعداد تین لاکھ بیان کی تھی۔ پروفیسر جڈ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خشکی اور تری کے کئی ایسے حصے محققوں کی مساعیٔ حسنہ سے محفوظ بیگانہ ہیں جہاں بڑے چھوٹے اور دیگر قسم کے بیسوں نئے جاندار اور پودے پائے جائینگے اگر انھیں بھی شمار کیا جائے تو انواع نباتی اور حیوانی دس[1] لاکھ سے کم نہ ہونگے۔

سائنس کے مشہور ماہر اور مسائل سائنس کو دلفریب پیرائے میں بیان کرنے کی شہرت رکھنے والے پروفیسر جے۔ آرتھر ٹامسن لکھتے ہیں کہ روئے زمین پر پچیس ہزار جانور ریڑھ کی ہڈی والے اور ڈھائی[2] لاکھ جانور بغیر ریڑھ کے پائے جاتے ہیں لیکن ننھے جان داروں کا شمار ان سے بیسوں گنا ہے۔ سمندر کے پانی کی ایک بالٹی میں جتنے جان دار پائے جاتے ہیں انکا شمار صاف اندھیری رات میں دکھائی دینے والے تاروں[3] سے بھی زیادہ ہے۔ ستارہ ماہی سال بھر میں دو کروڑ انڈے دیتی ہے۔ ٹڈ دسہ مچھلی تیس[۳۰] فٹ لمبی ہوتی ہے۔ مگر ہیٹل ۱/۲ انچ ہوتی ہے۔ گریٹ سالٹ لیک کے تلخ بدذائقہ پانی میں دو تین قسم کے جانور پائے جاتے ہیں، کھولتے پانی کے چشموں میں بھی جان دار دیکھے گئے ہیں۔ تاریک بھیانک

[1] کمنگ آف ریویوشن صفہ۱ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۰ء [2] ماخوذ از "سائنس اینڈ ریلیجن" صفہ۱ مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۲۵ء [3] ماہران فلکیات کا یہ بیان ہے کہ اگست اور دسمبر کی صاف اندھیری راتوں میں دوربین کی مدد کے بغیر آٹھ ہزار تارے نظر آتے ہیں ۔

غاروں[۱] کے اندر کئی قسم کے جانور اپنی زندگی کے مقررہ ایام بسر کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اگر سمندر کی تہ سے کوئی پتھر نکالو تو اس پر پندرہ قسم کے جاندار نظر آئیں گے۔ کھیتوں کی مینڈوں پر جو بڑے بڑے درخت ہوتے ہیں اگر انکی شاخوں کو بغور مشاہدہ کرو تو پچاس مختلف قسم کے جاندار ہر ایک درخت پر بسیرا کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

منطقہ باردہ شمالی کے سرد خطہ میں دائمی برف کے نیچے پندرہ فٹ کی گہرائی پر ایک قسم کے ننھے ننھے جاندار مشاہدہ کئے گئے ہیں۔ اس مختصر تذکرہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ کیسے بھانت بھانت کے جاندار خشکی اور تری پر پائے جاتے ہیں۔ کرۂ ہوا بھی ان کی ہستی سے خالی نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقلیم حیوانات کتنی وسیع ہے۔ اور مملکتِ حیات کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔

زندگی کے انوکھے کرشمے

اب بعض جانداروں کے انوکھے اور حیرت انگیز خواص ملاحظہ ہوں۔ ایک قسم کے تاگے جیسے باریک ننھے کیڑے ہوتے ہیں۔ انھیں چودہ سال تک ایک ڈبہ میں بند رکھا گیا۔ ان میں زندگی کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا مگر جب انھیں چودھویں سال کے اخیر میں پانی میں ڈالا تو وہ فوراً حرکت کرنے لگے۔ تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے۔ کہ اگر چودہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی انھیں ڈبیہ سے نکال کر پانی میں ڈالو تو وہ از سر نو زندہ ہو جاتے ہیں لیکن اگر چودہ سال گذر جانیکے بعد انھیں نکالو تو زندگی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کیونکہ مدت معینہ کے بعد ان کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ یہ بات واقعی تعجب انگیز ہے کہ مخدرات کا اثر جیسا انسان پر ہوتا ہے ویسا جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سکتہ۔ غشی۔ بیہوشی۔ نیند۔ حال۔ اور گہری بیہوشی جو عرصہ تک رہتی ہے اور تعطل حیات کی علامات انسان اور حیوانات میں ہو بہو ایک جیسی نمایاں ہوتی ہیں۔ زندگی جس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ جانداروں کے جسم میں مضمر رہتی ہے۔ مصنوعی موت کا تعجب انگیز اثر جانوروں میں بھی دیکھا جاتا ہے گول مچھلی کو مار کر اس کا دل نکال لو تو وہ کئی دن تک حرکت کرتا رہتا ہے۔ اگر اس مچھلی کا سر کاٹ کر جدا کر دو تو وہ چند منٹ تک ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی رہتی ہے۔ جیسے بکرا یا تیتر اور مرغ سر قلم ہونے کے بعد بے تحاشا بھاگتا پھرتا ہے اگر ٹڈی کیڑے کو کاٹ کر بارہ حصے کر دو تو کچھ دیر کے بعد اس سے بارہ جداگانہ کیڑے پیدا ہو جائیں گے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسکا ہر ایک عضو بجائے خود زندگی کے خواص[۲] جبلی سے آراستہ ہے اور یہ امر بھی مسلمہ ہے۔ کہ تمام جاندار ایک نہایت چھوٹے لطیف کرم سے پیدا

۱؎ صوبہ کنٹکی (امریکہ) میں سب سے بڑا غار ہے جسکا طول دس میل اور چوڑائی چالیس سے لیکر تین سو فٹ ہے۔ سطح بلندی مختلف جگہ مختلف ہے اسکے اندر بھول بھلیاں ہیں۔ (جہر) ۲؎ ماخوذ از "بائبل آف نیچر" (صحیفہ قدرت) صفحہ ۹۶ مصنفہ پروفیسر جے۔ آرتھر ٹامسن مطبوعہ سنہ ۱۹۰۸ء۔

ہوتے ہیں۔

(۲) جانداروں کا مبدء - مبدء حیات کا مسئلہ لاینحل ہے

جانداروں کی ہمہ گیری اور ان کی انواع و بعض خواص کے ذکر اجمالی کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدا کے اہم مسئلہ پر مختصر بحث کی جائے۔ سب سے زیادہ دلچسپ اور نازک سوال یہ ہے کہ جان دار کیسے پیدا ہوئے ؛ یا یوں کہنا مناسب ہے کہ انکا منبع حیات کیا ہے؟ یہ سوال بیالوجی (علم الحیات) کا سب سے بڑا اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ ارتقا اقلیم سائنس کا سب سے بڑا مسلّمہ عقیدہ ہے ہر ایک مسئلہ پر اسی کی رو سے بحث کیجاتی ہے، زمین جس پر ہم بود و باش رکھتے اور مختلف مشاغل انجام دیتے ہیں، شروع میں ایسی ٹھوس مستحکم اور جانداروں کے رہنے کے موزوں نہ تھی' جیسی کہ اب ہے' ابتدا میں اس کا ہیولا گیس جیسا تھا' یہ انگارے کی طرح دہکتی تھی۔ عمل ارتقا سے بتدریج ٹھوس اور خنک ہوتی چلی گئی۔ کروڑوں برسوں کے بعد اس قابل ہوئی کہ اس پر روئیدگی پرورش پائے۔ پھر کچھ عرصہ بعد جاندار نمودار ہوئے۔ بیجان ہیولا سے جان دار کس طرح پیدا ہو گئے ؛ اس کا جواب اہل مذہب یہ دیتے ہیں کہ "قادر مطلق نے اپنی قدرت و حکمت سے ہر قسم کے جان دار پیدا کئے۔" مگر سائنس کا جواب پروفیسر آرتھر ٹامسن[۱] کی زبان میں یہ ہے کہ "ہم اس سوال کا جواب وثوق سے نہیں دے سکتے۔ کہ شروع میں جانور کس طرح پیدا ہوئے تھے۔" اسی قسم کی لاعلمی زندگی[۲] کے آغاز کے بارہ میں ظاہر کی جاتی ہے۔ ارتقا جن پیچیدہ اور نازک سوالات کا کماحقہ جواب ہم نہیں پہونچا سکتا انہیں جان اور جانداروں کی ابتدا کا مسئلہ بھی ہے، تاہم اس کے متعلق ماہران سائنس نے جو قیاس آرائیاں کی ہیں۔ انکا خلاصہ خالی از لطف نہیں ہے۔

زندگی کی ابتدا کی نسبت مختلف نظریات

(۱) بعض ماہروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس طریقہ سے جاندار معرض ہستی میں آئے ہیں اسکی نسبت ہم کسی قسم کا محققانہ تصور قائم نہیں کر سکتے۔ زندگی کی ابتدا کا مسئلہ[۳] لاینحل ہے۔

(۲) پرائر اور دیگر ماہروں کا خیال ہے کہ جراثیم حیات جو موجودہ جراثیم سے بالکل مختلف تھے ابتدا ہی سے کرۂ ارض کے ہیولا کے اندر موجود تھے، اس کی نسبت پروفیسر آرتھر[۴] ٹامسن کی رائے ہے کہ جب آتشی سحاب سے ہماری دنیا کی تدوین ہوئی تھی اس میں پروٹوپلازم نہ تھا بلکہ متحرک ذرے

---

[۱] ملاحظہ ہو "سائنس اینڈ ریلیجن" صفحہ ۸۹ مصنفہ پروفیسر جے۔ آرتھر ٹامسن + [۲] ملاحظہ ہو "بائبل آف نیچر" صفحہ ۱۱۲ + [۳] "بائبل آف نیچر" صفحہ ۱۱۲ +

ضرور اس میں موجود تھے۔ ذی روح جانداروں کی بابت ہمارا جو خیال ہے وہ انواع و اقسام کے موجودات و جانوروں کے خواص طبعی کے مشاہدہ اور تحقیقات سے مستخرج ہوا ہے۔ پر آئر اس خیال کا حامی نہ تھا کہ بے جان مادوں سے ہر قسم کے جاندار خود بخود وجود میں آ گئے۔

(۳) ۱۸۶۵ء میں پروفیسر ایچ۔ ای۔ اکرٹ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جراثیم زندگی آئے دن اجرام فلکی سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ ان ہی میں کے چند جرم کرۂ ارض پر آ کر جاگزیں ہو گئے۔ جرمن ماہر طبیعیات ہلم ہلٹس برطانیہ کے مشہور ماہر لارڈ تمیل دن اور ناروے کے ماہر آرنیئس کی یہ رائے ہے کہ شہاب ثاقب کے اندر زندگی کے جراثیم تھے جو اس دنیا میں آ کر پیوست زمین ہو گئے۔ ہلم ہولٹس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "یا تو ذی اعضا جاندار کسی وقت معرض ہستی میں آئے تھے یا قدیم سے ویسے کے ویسے چلے آئے ہیں"۔ مگر پروفیسر ٹامسن کی رائے میں ہلم ہولٹس کا خیال مسئلہ ارتقا کے خلاف ہے کیونکہ خلا کی سخت سردی اور شہاب ثاقب کی قیامت خیز رفتار سے جو بے انتہا حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اسکے باعث جراثیم زندگی کس طرح زندہ رہ سکتے تھے؟

(۴) آپ سے آپ زندگی معرض ہستی میں آئی۔ اسکی نسبت دو خیالات ہیں (ا) زندگی کا طبعی مبنیٰ اسقدر کہن سال ہے جسقدر عالم ہے۔ (ب) زندگی کے جراثیم کسی اور دنیا سے ہماری دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ (ج) قدرت کے کیمیا خانہ میں بیجان سے جاندار ہیولا پیدا ہوا تھا۔ مسئلہ ارتقا کے رو سے یہی خیال مسلم ٹھہرتا ہے۔ آپ سے آپ زندہ جانداروں کے پیدا ہو جانے کے خیال کے حامی ارسطاطالیس۔ آگسٹین۔ لکریشس۔ لوتھر۔ فرانسس۔ بیکن۔ دوران خون کا مخترع ہاروے۔ وغیرہ تھے مگر ان کے زمانہ میں نادیدہ جراثیم کی کسی عالم کو خبر نہ تھی۔ اگلے وقتوں میں یہ معلوم نہ تھا کہ حشرات الارض کے وسیلہ سے ننھے ننھے جراثیم دوسرے مقامات پر پہونچ سکتے ہیں۔ (ج) کی بابت یہ مشہور ہے کہ بیالوجی کے مشہور ماہر ہکسلے اور ہربرٹ اسپنسر (برطانیہ میں) ناگلی اور ہیکل (جرمن میں) اس نظریہ کے حامی تھے کہ بیجان مادہ سے جاندار ہیولا پیدا ہوا تھا + مگر چند سال سے پروفیسر بالی اور ان کے ہم خیال محقق اس کوشش میں ہیں کہ عمل کیمیاوی سے وہ اجزاء پیدا کریں جو جانداروں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے کاربن مرکب بنایا گیا جیسا کہ ہرے پتے کے اندر قدرتی طریقہ سے بنتا ہے پھر مرکری لیمپ سے نائٹروجنی کاربن مرکب تیار کئے جو اُن پروٹین کے مشابہ ہوتے ہیں جو جاندار ہیولا کا جزو ضروری ہیں۔ پروفیسر بالی نے اسی مواد سے جاندار مادہ کے اجزائے ترکیبی بنانے کی کوشش کی ہے جو قدرتی طریقہ سے بآسانی ہم

پہونچ سکتا ہے۔ آپ نے روشنی کے وسیلہ سے کاربن ڈی اکسائڈ۔ پانی اور نائٹرائٹ سے نائٹروجنی کاربن مرکبات بنالئے ہیں جو پروٹوپلازم[1] (ذرۂ ذی جان) کے طبعی اجزا ہیں یعنی اس مادۂ ذی حیات کے اندر پروٹین کاربوہیڈریٹ۔ روغنی اجزا۔ کھار اور نشتر فیصدی پانی ہوتا ہے۔ پروفیسر آرتھر ٹامسن کی یہ رائے ہے کہ کائنات کے اندر جہاں پروٹوپلازم ملتا ہے وہ صرف زندگی کے حصول طبعی کی صورت میں ملتا ہے۔ مادۂ ذی حیات ان کیمیاوی عملوں کا مصدر ہے جو عمل انجذاب کے تحت میں شمار ہوتے ہیں۔ پروفیسر موصوف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر کسی فطری عمل سے بیجان مادہ سے جاندار مادہ پیدا ہوا تھا جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر۔ ہکسلے۔ اور ہیکل کا خیال ہے تو اب کائنات[2] کے اندر وہی عمل کیوں نظر نہیں آتا؟

(۵) جرمن ماہر فزیالوجی (علم منافع الاعضا) فلوگر نے یہ رائے دی تھی کہ سیانوجن طبعی پروٹیڈ کے ذرے میں بننے اور بگڑنے کے خواص پیدا ہوتے ہیں۔ سیانوجن اور اس کے مرکبات انتہا درجہ کی حرارت سے بنتے ہیں بشرطیکہ نائٹروجنی مرکبات پہلے سے موجود ہوں اور یہ اُسوقت معرض وجود میں آئے تھے، جب کرۂ ارض کرۂ نار بنا ہوا تھا۔ ورورن نے اس خیال کی اپنی مشہور تصنیف فزیالوجی میں یوں تشریح کی ہے کہ جب زمین آتشی گولہ تھی تو سیانوجن کے مرکبات ترکیب پذیر ہوئے کیونکہ وہ فوراً ان مادوں کے ساتھ گھل مل گئے جو انتہائی حرارت سے پیدا ہوئے تھے۔ اور جب پانی مادی صورت میں نمایاں ہوا تو یہ مرکبات کیمیائی عمل سے پانی اور اسکے گھلے ہوئے کھاروں اور گیسوں سے شیر و شکر ہوگئے جس سے ابتدائی مادہ ذی حیات معرض وجود میں آیا تھا

(۶) پروفیسر سرا ے رنکاسٹر نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکہ میں ایک مضمون بے مقدار جانداروں پر لکھا تھا جس میں آپ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جن قدرتی عملوں سے ابتدائی پروٹوپلازم پیدا ہوا تھا ان سے البومنی اور دیگر مرکبات پیدا ہوئے تھے۔ ظن غالب یہ ہے کہ مادۂ حیات ابتدا میں اسی قسم کے مواد سے پرورش پاکر بڑھا تھا۔ ڈاکٹر چارلٹن بیسٹن کا یہ قیاس ہے کہ نائٹریٹ آف امونیا کے اثر سے جو طوفان باد و باراں سے ہوا میں پیدا ہوتا ہے، ان اجزائے ترکیبی کو تحریک ولی ہوچکی تھی جن سے مادۂ حیات بنا تھا۔ پروفیسر جے بٹلر برک نے بطور نظریہ یہ خیال پیش کیا ہے کہ مفردات حیاتی

---

[1] پروٹوپلازم۔ یعنی مادۂ ذی حیات جانداروں کا ہیولا ہے جس سے وہ وجود حاصل کرتے ہیں۔ اسکے اجزائے ترکیبیہ پروٹینز (Proteins) یعنی مواد غاذیہ۔ کاربوہیڈریٹس (carbohydrates) یعنی مواد شکریہ و نشائیہ فیٹس (FATS) یعنی مواد شحمیہ و دہنیہ۔ اور نمکیات (salts) اور پانی ہیں + [2] ملاحظہ ہو "سائنس اینڈ ریلیجن" صفحہ ۹۴ +

جو عالم کے ہر حصے میں غیر معین زمانہ تک پائے جاتے تھے، کاربن کے کیمیادی خواص سے آراستہ تھے۔ نیز ان میں عارضی عناصر کے ریڈیم کی فعلیت کے بھی اوصاف تھے۔ جب انکا اثر مرکبات کاربن پر پڑا تو مادۂ حیات ترکیب پذیر ہوا۔ اس ماہر نے برسوں کے تجربات سے ایسا مادہ تیار کیا جو بے جان اور جاندار کے بین بین تھا۔

مادۂ حیات پیدا کرنیکے احتمالات کا حشر

فزیالوجی کے مشہور زمانہ ماہر پروفیسر سر ایڈورڈ شیفر نے برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ستمبر ۱۹۱۲ء میں صدارتی ایڈریس پڑھتے ہوئے بڑے وثوق سے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ماہران کیمیات کی مساعیٔ حسنہ سے بہت جلد مادۂ حیات کیمیا خانہ ہی کے اندر پیدا ہو جائیگا مگر سولہ سال کی کوششوں سے اس میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی، چنانچہ لندن یونیورسٹی کے ممتاز ماہر پروفیسر ڈونین نے برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ستمبر ۱۹۲۸ء میں "سرحیات" پر ایک محققانہ مضمون پڑھا تھا جسکے متعلق ایک نمایندۂ اخبار سے دوران مکالمہ میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "مادۂ حیات کے مظاہر کی تحقیقات سے زندگی کی ماہیت پر ایسی مفید روشنی پڑنے کی توقع ہے جس سے کیمیا خانہ کے اندر جاندار مادہ پیدا کرنے کی اُمید بندھ سکتی ہے۔ لیکن زندگی کے اصلی ذرہ کے استحالہ اور ارتقا کے واسطے جس سے بالآخر وہ زندہ روح میں نمایاں ہوگا، اتنا بڑا عرصہ درکار ہوگا کہ کیمیائی طریقہ سے جاندار پیدا کرنے کے احتمالات بعید القیاس معلوم ہوتے ہیں"[1]

شہرۂ آفاق ماہر طبعیات سر الیور لاج[2] نے لندن کے اخبار ڈیلی میل میں اسی مسئلہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "سردست مادۂ ذی حیات پیدا کرنا انسان کی عقل وہمت سے بعید ہے زندگی فقط جاندار ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔"

عملی ارتقا سے مادۂ حیات کی تردید

پروفیسر آرتھر ٹامسن کا خیال بہت معقول ہے۔ اس وجہ سے اسکو نقل کرنا خالی از لطف نہیں ہے۔

"عام میلان تصور ارتقا کی طرف ہے۔ ابتدا میں سحاب تھا جو لنبے طور پر بے قیاس تیزی سے چکر کھاتا تھا، اس سے ارکین نظام شمسی وغیرہ بنے۔ شروع میں ہمارا کرۂ ارض انگارے کی طرح دہکتا تھا۔ پھر عمل ارتقا سے آہستہ آہستہ ٹھوس اور ٹھنڈا ہوتا گیا پھر عرصۂ دراز کے بعد ایسے جاندار پیدا ہوئے جن کے اجسام بالکل سیدھے سادے تھے۔ پھر انکا استحالہ ہوتے ہوتے انسان پیدا ہو گیا جسکی میرل

---

[1] برٹش بے تار برقی موصولہ ۱۱ ستمبر ۱۹۲۸ء [2] ماخوذ از اسٹیٹسمین کلکتہ اکتوبر ۱۹۲۸ء

قسمیں ہیں۔ سائنس کے نقطۂ نگاہ سے اس مسلسل عمل سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عالم حیوانات میں متن تانا اور پروٹوپلازم بانا ہے جس سے زندگی کا تھان تیار ہوتا رہتا ہے۔ شروع سے لیکر اخیر تک متن اور مادہ کے باہمی عمل سے مختلف ہستیاں پیدا ہوتی چلی آتی ہیں۔ مذہب کی رو سے ظہور الطبعی اور تغیرات عالم کے پس پشت ارادت الٰہی ہے جو انکی محرک اعلیٰ ہے۔[۱] پروفیسر موصوف کا یہ مطلب ہے کہ خدا کی حکمت سے جاندار اور بیجان ہستیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۳) زندگی کے خواص

زندہ جانداروں کی امتیازی خصوصیات پر ذیل میں مجملاً روشنی ڈالی جاتی ہے۔ (۱) جاندار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عمل انجذاب کا ثبوت بہم پہونچاتا ہے یعنی وہ مواد غاذیہ کو باریک کرکے ہضم کرتا اور اپنی ہستی کی نشو ونما کو قائم رکھتا ہے (۲) مواد غاذیہ کی صورت جسم کے اندر جو تبدیلیاں اختیار کرتی ہے وہ مختلف جانوروں میں مختلف ہوتی ہے، مواد غاذیہ بھی کئی قسم کا ہوتا ہے۔ بعض قوت معروف سے آراستہ اور بعض مجہول ہے، اسی وجہ سے کتے کے خون کے ذرے لومڑی کے خون کے ذرّوں سے مختلف ہوتے ہیں حالانکہ دونوں کی اصل ایک ہے، (۳) گو عمل انجذاب یا قوت مغیرّہ ہر وقت اپنے طبعی افعال انجام دینے میں مصروف ہے، مگر عرصہ تک جاندار کی صورت میں کوئی معتدبہ فرق ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض بے مقدار جاندار ایک ہی دن میں جوانی حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض درخت[۲] دو دو ہزار برس تک ہرے بھرے رہتے ہیں، جانداروں کے اندر عمل مغیرّہ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ مگر ان کی ہیئت ظاہری بدستور سابق قائم رہتی ہے۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ بچپن میں صورت بدل جاتی ہے۔ مگر جب جسمانی نمو بند ہو جاتی ہے تو برسوں تک خط و خال میں کوئی نمایاں تغیر واقع نہیں ہوتا تاوقتیکہ بڑھاپا شروع نہ ہو جائے۔ البتہ بعض امراض سے صورت میں ضرور تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، (۴) جانوروں کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ جسم کے اندر سرعت کے ساتھ قوت مہیا کر لیتے ہیں گویا وہ قوت کا سرمایہ یا ذخیرہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ اس سے عضوی نمو کو تحریک پہونچتی ہے۔ اور مادۂ ذی جان ترقی پکڑتا ہے۔ (۵) لیکن نمو سے پھلنے پھولنے کی طاقت کا کوئی جزو اس سے خارج ہوتا ہے تو وہ نئے وجود میں بڑھنا شروع ہو جاتا ہے، خواہ کسی پودے کا غنچہ ہو یا کرم۔ جو ایک جاندار سے نکلتا ہے لیکن رفتہ رفتہ نشو ونما پا کر اپنے منبع حیات کے جملہ خواص نمایاں کرتا ہے۔ کرم ذی جان تو محض ناچیز ذرہ ہوتا ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ بعینہ اپنے باپ کی

---

[۱] ملاحظہ ہو "سائنس اینڈ ریلیجن" صفحہ ۱۹۵+

[۲] کیلیفورنیا کے جنگل میں ایک عظیم الجثہ درخت ہے۔ جسکی بلندی ۳۲۲ فٹ اور گھیر نوّے فٹ ہے۔ اسکی عمر تین اور چار ہزار کے درمیان سمجھی جاتی ہے۔ یہ عالم نباتات کا سب سے بڑا اور شاندار عجوبہ ہے+

مانند بن جاتا ہے۔ (۷) جاندار اپنی ہستی قائم رکھنے کی طاقت سے بہرہ ور رہتے ہیں جب کوئی اور جانور
حملہ کرتا ہے یا بلا نازل ہوتی ہے تو وہ طبعاً اس سے حفاظت کی تجاویز اختیار کرتے ہیں یعنی جیسا موقع
ہوتا ہے، جانور اس کے مطابق کردار اختیار کرتے ہیں۔ اپنی اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے خوراک تلاش
کرتے ہیں اپنے مسکنوں سے دور دور نکل جاتے ہیں۔ اور اپنے دشمنوں سے بچنے کی فوراً سبیل نکال لیتے
ہیں یا تو ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ یا چشم زدن میں بھاگ کر جان بچاتے اور پناہ کی جگہ چھپ جاتے ہیں
(۸) جن واقعات اور حالات سے جانور رونما ہوتے ہیں وہ انکی ہستی پر نقش ہو جاتے ہیں اور ہدایت
زیست کا کام دیتے ہیں۔ (۹) جانور پشت در پشت تغیر و تبدل کا ثبوت بہم پہونچاتے رہتے ہیں
وہ عمل تغیر کے محکوم رہتے ہیں۔ بیٹا باپ کا مثنیٰ نہیں ہوتا۔ دونوں کی صورتوں میں مشابہت کم ہوتی
ہے۔ پوتا دادا سے مختلف ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ، جاندار عمل تغیر میں۔ عمل ارتقا سے نئی صورتیں
پیدا ہوتی رہتی ہیں جو اس کا ایک بڑا امتیاز ہے۔

ماحول کا باہمدگر اثر

جانوروں کے بڑی بڑی خصوصیات ایک حد تک بے جان چیزوں میں بھی پائی جاتی ہیں
مگر عمل انجذاب کردار اور نسل کشی جانوروں ہی کی دنیا میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ زندگی
میں ایک قسم کی فعلیت اور حرکت پائی جاتی ہے۔ جاندار کا اپنے ماحول سے رات دن معرکہ رہتا ہے
کبھی وہ ماحول پر قابو پالیتا ہے اور کبھی ماحول اسپر غالب ہو کر اسکی ہیئت ظاہری میں ترمیم کر دیتا ہے
پروفیسر پیٹرک گیڈز کی رائے میں جانور کے افعال طبعی ماحول کے اثر سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی سے
وہ تحریک حاصل کرتا ہے، یہ کلیہ انسان پر بھی عائد ہوتا ہے، جیسا کہ جانداروں پر اسکا اطلاق ہوتا ہے
حضرت انسان کی عقلی اور اخلاقی خواہش بیشتر ارد گرد کے طبعی اور تمدنی تحرکات کا اثر قبول کرتی ہیں
جانداروں کو انجن سے تشبیہہ دی جاتی ہے مگر یہ مشابہت نامناسب ہے۔ مشین انسان کی عقل اور
ہنر مندی سے مبنی ہے مگر جانور کا مبدء اس سے مختلف ہوتا ہے وہ وجود قدرتی ہے۔ البتہ دونوں میں
یہ مشترکہ وصف پایا جاتا ہے کہ قوت کی تبدیلی صورت ہوتی ہے انجن کے اندر کوئلہ اور پانی آدمی ڈالتا ہے
اور اس کے پرزے بھی اسی کی کوشش سے حرکت کرتے ہیں۔ اگر کوئی پرزہ بگڑ جائے تو انجن چلانیوالا
ہی اسے درست کرتا ہے۔ برخلاف اسکے جاندار کی جسمانی مشین آپسے آپ خوراک حاصل کرتی ہے۔
خود بخود راہ مستقیم پر چلتی ہے۔ شکست وخستگی کی آپ سے آپ مرمت ہوتی رہتی ہے۔ اعضائے جسم
خود بخود بڑھتے ہیں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جانداروں کی نسل بڑھتی اور تعداد ترقی کرتی رہتی ہے
مگر جسم انسانی دیگر جانوروں سے کئی باتوں میں ممتاز ہے وہ مختار فعل ہے اور نیک و بد کے امتیاز او

قوتِ مدرکہ سے بہرہ ور۔ پس اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جاندار اور بے جان کا مابہ الامتیاز جو قدرت نے شروع سے معین کر رکھا ہے اسے دنیا ان کی حکمت مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(۴) اجسام کی حیرت انگیز پیچیدگی۔

جسم انسانی کے عجائبات

پرانے زمانہ کے فلاسفر انسان کو عالم صغیر کہتے تھے اور انکا یہ خیال حقیقت سے نا آشنا نہ تھا۔ سائنس کی تحقیقات سے اس قدیم خیال کی بخوبی تائید ہوتی ہے انسان واقعی عجائبات روزگار سے ہے' اسکا جسم کیسا عجیب و غریب ہے اسکے خون ہی کو دیکھو جو سفید اور سرخ ذروں سے مرکب ہے۔ اول الذکر کا اندازہ چار ارب بتایا جاتا ہے اور آخر الذکر کا شمار پچیس پدم بیان کیا جاتا ہے۔ اور ہر ایک ذرہ بجائے خود نہایت پیچیدہ ہے، جو بیسیوں نہایت لطیف ذروں سے بنا ہوا ہے' اسکے اندر کئی مختلف چیزیں پائی جاتی ہیں۔ شریانوں کے سروں کو رگوں کے منہ سے ملانے والی' بال ایسے باریک رگوں کو اگر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آراستہ کیا جائے تو وہ تیس ہزار میل لمبی ہونگی۔ اگر ذرا دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خون کی بوند کی جداگانہ ہستی قائم رہتی ہے تو اسے دوران خون کے عمل کے سبب سے بدن کے ہر ایک شریان اور رگ سے گزر کر پھر بطن دل میں دن بھر کی جسم پیمائی کے بعد آنا پڑتا ہے۔ اسطرح اسے روزانہ ایک میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ دماغ محل حواس و قوائے عقلیہ ہے۔ ذہنی قوتیں اسمیں ہوتی ہیں جنکی وجہ سے وہ کائنات میں افضل و برتر سمجھا جاتا ہے دماغ کے چار حصے ہوتے ہیں اور اس کے جوف میں سفید مادہ ہوتا ہے جسکے بالائی حصہ کی عصبی خلیات کا وزن سوا تولہ سے زیادہ نہیں ہوتا مگر انکی تعداد نو ارب بیس کروڑ بیان کی جاتی ہے۔ گویا کرۂ ارض کی آبادی سے پانچ چھ گنا زیادہ ہیں' پھر ہر ایک خلیہ بجائے خویش صدر دفتر ٹیلیفون کے مشابہ ہے جسکی بدولت جسم کے ایک حصہ کا سلسلہ دوسرے حصے سے قائم ہوتا ہے۔

خلیہ کا اعجوبہ

خلیہ یا سیل بطور خود ایک ننھی سی دنیا ہے۔ اسکی ساخت پیچیدہ ہے۔ اسکے ہیولا کے اندر ذرّے (جراثیم) ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے ہر دم برسر پرخاش رہتے ہیں۔ کیونکہ کیمیائی عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ مادۂ خلیہ کے اندر کئی قسم کے اجرام بھی ہوتے ہیں جو تین اقسام میں تقسیم کئے گئے ہیں اور یہ نہایت لطیف ہوتے ہیں۔ صرف بڑی طاقتور خوردبین ہی سے نظر آتے ہیں بعض جانوروں کے خلیات میں صرف دو قلبی ذرّے ہوتے ہیں جو اسکی نمو کے ابتدائی مرحلہ میں بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں مگر مادۂ خلیہ کے قلب میں ایک ذرّہ ہوتا ہے وہ بھی عالم صغیر ہے۔ اسکی جھلی کے اندر اور باہر مواد گزرتا رہتا ہے۔ اور اسکے اندر کسر دو قسم ہوتے ہیں جنکی تعداد ہر نوع حیوانی میں مقرر ہوتی ہے۔ مثلاً انسان کے خلیہ میں اڑتالیس ۴۸ کرم حیات ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کرم نہایت

لطیف ذرّوں کا مرکب ہے۔ جب ہم اس سلسلۂ غیر متناہی کی پیچیدگیوں پر غور کرتے ہیں تو ہماری عقل حیران رہ جاتی ہے اور سر چکر انے لگتا ہے۔ ایک جاندار ہے اسکا ایک جسم ہے اور پھر اسکے کئی اعضا ہیں۔ پھر اسکے اندر ریشے پائے جاتے ہیں اور بیسیوں خلیات ہوتی ہیں۔ پھر ہر ایک خلیہ کے اندر قلب ہوتا ہے۔ جو کرم حیات سے بھرا ہوتا ہے پھر ہر ایک کرم خوردبینی جراثیم سے مرکب ہوتا ہے۔ اور یہ نہایت لطیف جرم اور لطیف تر جراثیم سے بنا ہوا ہی جسطرح پیاز کے پرت کے پرت ہوتے ہیں، یا سالمات کی پیچیدہ ساخت ہوتی ہے، بعینہٖ جانداروں کا وجود بھی ہے جنکی ہستی پیاز کے عین مشابہ ہے۔ خلیات ہی سے جملہ اجسام ترکیب پاتے ہیں۔ جیسے اینٹوں سے مکان تعمیر ہوتے ہیں بالکل اسیطرح اجسام حیوانی اور نباتی خلیات کی ترکیب اور اجتماع سے بنتے ہیں۔ ہر ایک خلیہ کے اندر کیمیائی مواد کا ردو بدل اسی طرح ہوتا رہتا ہے جسطرح کسی کارخانہ کے اندر مختلف کام ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ایک خلیہ میں موادّ غاذیہ۔ موادّ شکریہ۔ موادّ روغنی وغیرہ پائے جاتے ہیں جن میں مسلسل تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ کسی قسم کی بے قاعدگی نظر نہیں آتی بننے اور بگڑنے، تقسیم و تفریق، اجتماع و انتشار کے مختلف عمل رات دن ہوتے رہتے ہیں۔ گویا خلیہ کے اندر کیمیا خانہ کی مانند ردو بدل ہوتے ہیں۔ اس مختصر بحث سے واضح ہوگیا ہوگا کہ ہمارا بدن کیسا پیچیدہ ہے اور اس کے عجائبات کیسے محیر العقل ہیں؟ اس کے اندر جو کیمیائی تغیرات عمل پذیر ہیں وہ بڑے حیرت انگیز ہیں یہ سلسلہ غیر متناہی ہے عمل تغیر ہر وقت ہوتا رہتا ہے مگر ہمارے اعضا اور ہماری ظاہری صورت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سات سال کے اندر جملہ خلیات قطعاً بدلجاتے اور ان کی بجائے نئے وجود میں آجاتے ہیں۔ مگر بظاہر اس انقلاب کا ہمارے بدن اور بشرہ پر کوئی نمایاں تغیر دکھائی نہیں دیتا۔

رسید کتب

شاہنامۂ اسلام ۔ از حضرت حفیظ جالندھری ایڈیٹر مخزن۔ لاہور

داستان عجم ۔ از مولوی سید حامد علی
تحفۂ جاپان ۔ از جناب اصغر گونڈوی
تحفۂ مصر و حبش " " "
} مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد

لارڈ میو کا قاتلؔ[1]

(از چودھری محمد علی وکیل ایبٹ آباد)

۱۹۱۰ء میں سید نور سے میرا تعارف اس زمانہ میں ہوا جبکہ دمدار ستارہ نمودار ہوا تھا۔ وہ اب بھی
انگریزوں کو سخت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا گو بہت ضعیف ہو چکا تھا لیکن اسکے سینے میں ابتک تیراہ
کی لڑائی کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں جب برطانوی فوجوں نے تیراہ پر چڑھائی کی تھی تو
اس نے شیر کی طرح انکا مقابلہ کیا تھا اور کئی انگریزوں کو اُسنے اپنی بندوق کا نشانہ بنایا تھا۔ جنکی یادگار اُسنے
لکیروں کی صورت میں اپنی بندوق پر بنالی تھی۔ اس زمانہ میں اس نے ایسی داد شجاعت دی کہ خیبر کی رزمیہ
نظموں میں اسکا نام بار بار لیا جانے لگا وہ مجھے اپنی جوانی کے قصےّ سنایا کرتا اور میں انھیں سُنکر حیران
ہو جایا کرتا تھا مگر اب بڑھاپے نے اسکی طبیعت کو نرم کر دیا تھا۔

۱۹۱۰ء کے موسم بہار میں سرحد کی سیاسی فضا کچھ گرد آلود ہو گئی تھی کیونکہ میرے پولیٹکل اسسٹنٹ
نے (جو ایک ہندوستانی تھا) مجھے اطلاع دی تھی کہ آجکل ملا اکاخیل کی زیارت پر قبائل کی آمد و رفت ہے۔
جس سے ہمیں شبہ گزرتا تھا کہ کہیں وہ کچھ شرارت نہ کریں۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ صاحب! بادل اکٹھے
ہوتے ہیں مگر منتشر ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعات ہمارے لئے کچھ نئے نہ تھے اس لئے ہم قبائل کی نقل و حرکت
کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے تاہم میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا اس دفعہ بھی بادل منتشر
ہو جائینگے تو اُس نے جواب دیا کہ اگر خدا نے چاہا تو یہ سیاسی مسائل موسم گرما سے پہلے فیصلہ ہو جائیں گے
اور آپ بڑے اطمینان سے رخصت پر جا سکیں گے۔ اس روز لنڈی کوتل کی سرائے میں سرحدی قبائل
کا ایک جرگہ اُترا ہوا تھا جو اپنا سالانہ وظیفہ لینے آیا تھا۔ ہم انکے وظائف کی رقم سے انکے جرائم
(جو گزشتہ سال کے عرصے میں انکے لوگوں نے انگریزی علاقہ میں کئے تھے) کا ہرجانہ وضع کرنا چاہتے تھے

---

[1] سر جان میفی نے جو ۱۹۱۰ء میں خیبر کے پولیٹکل ایجنٹ تھے اور آجکل سوڈان کے گورنر جنرل ہیں۔ چند سال
ہوئے کہ یہ مضمون لکھا تھا چونکہ اس سے کئی دلچسپ تاریخی واقعات کا انکشاف ہوتا ہے اسلئے "ناظرین زمانہ" کی واقفیت
کے واسطے اسکا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ (محمد علی)

لیکن وہ بڑے زور شور سے اپنی بیگناہی ثابت کر رہے تھے بہرحال اس بحث نے طول پکڑا حتیٰ کہ شام ہوگئی۔ اس اثنا میں باہر سے شور سنائی دیا تو کئی آدمی وہاں سے اُٹھکر باہر چلے گئے، تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کے چہروں پر کسی نامعلوم جذبہ کے آثار نظر آنے لگے۔ آخرکار کسی نے باآواز بلند کہا۔ "واگورہ۔ یہ آسمان خربیا تلوار راغے (وہ دیکھو آسمان پر تلوار پھر آگئی ہے) میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھا۔ تو آسمان پر مغرب کی جانب دمدار ستارے کو دیکھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جب کبھی یہ ستارہ نمودار ہوتا ہے ضرور کوئی نہ کوئی عالمگیر حادثہ یا لڑائی ہوتی ہے۔ اس لئے اسکا طلوع عام طور پر منحوس تصور کیا جاتا ہے چنانچہ تمام لوگ اسکو دیکھکر مبہوت سے ہوگئے۔ اور سب طرف عجیب قسم کی خاموشی چھاگئی۔ میں نے ان سے کہا کہ ہاں، اسکو ہیلے صاحب کا دمدار ستارہ کہتے ہیں کیونکہ اسکو ہیلے صاحب نے دریافت کیا تھا یہ ستارہ بھی دوسرے ستاروں کی طرح گھومتا ہے مگر یہ اپنا دورہ چھتر سال میں ختم کرتا ہے یہ صرف دو تین دن تک نظر آتا ہے۔ پھر غائب ہوجائیگا اور پھر چھتر سال کے بعد تمہارے پوتوں کو نظر آئیگا۔ جب یہ پچھلی دفعہ نمودار ہوا تھا تو تمھارے بزرگوں کا خیال تھا کہ اسکی آمد جہاد کی نشانی ہے۔ بعض مُلّا یہی کہتے تھے کہ اب انگریزوں کی بادشاہت ختم ہوجائیگی اور جب کابل کی لڑائی ہوئی تھی تو وہ اسکو اسی ستارہ کی نشانی سمجھتے تھے مگر ہماری حکومت ابھی تک بدستور قائم ہے۔ خیر پچھلی باتوں کو جانے دو کیونکہ جب اُس دفعہ یہ ستارہ نمودار ہوا تھا تو تم میں سے کسی کو یاد نہ ہوگا۔ اتنے میں ایک بوڑھا بول اُٹھا کہ "ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں اسوقت دس بارہ برس کا ہونگا۔ میں ان دنوں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ پشاور پر سکھوں کی حکومت تھی۔ اور سردار ہری سنگھ نلوہ جمرود میں رہا کرتا تھا۔" اس بوڑھے کا نام سید نور تھا وہ دیر تک حاضرین مجلس کو پُرانے قصے سناتا رہا۔ میں بھی کچھ وقت تک اسکی کہانی سنتا رہا۔

دوسرے دن سید نور نے جرگہ میں ہماری بڑی مدد کی چونکہ اپنے قبیلے میں اسکا کافی رسوخ تھا، اسواسطے بہت سے پیچیدہ معاملات خاطر خواہ طریقے پر طے ہوگئے۔ وہ دوسرے دن صبح کو مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ ہم دونوں نے چائے پی اور بڑی دیر تک گذشتہ واقعات کے متعلق گفتگو کرتے رہے، اس نے دمدار ستارے کا ذکر چھیڑا۔ میں نے کہا کہ یہ کل تک بالکل غائب ہوجائیگا اور پھر چھتر سال کے بعد دکھائی دیگا۔

سیّد نور نے کہا "صاحب آپکو تو معلوم ہے کہ میری قوم کے آدمی دو دفعہ شاذونادر اسے دیکھ سکتے ہیں" مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کوئی افغان باہمی لڑائیوں سے بچکر بمشکل اتنی لمبی عمر کو پہنچ سکتا ہے۔ سید نور اپنی جگہ سے اُٹھا اور باہر جانے لگا، پھر وہیں کھڑا ہوگیا اور دیر تک اسی ستارے کا ذکر کرتا رہا، گویا وہ

کسی عزیز دوست سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا تھا۔ پھر اُسنے کہا: صاحب۔ اب رات ہو گئی ہے۔ آؤ اس ستارے کو آخری دفعہ دیکھ لیں۔ میں اسکے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میرے اردلی بھی ہمارے ساتھ باہر نکل آئے۔ کیونکہ انھیں سید نور پر مطلق اعتبار نہ تھا۔ ہم قلعہ سے باہر نکلکر ایک اونچے مقام پر چڑھ گئے جہاں سے یہ ستارہ بخوبی نظر آسکتا تھا۔ چند اور پٹھان اور انگریزی افسر بھی ہمیں دیکھکر ہمارے قریب آگئے۔ دور سے دریائے کابل کی وادی دھندلی روشنی میں نظر آرہی تھی۔ اس اثنار میں رات ہو گئی اور ہم سب نے آخری دفعہ ہیلے کا دمدار ستارہ دیکھا، پھر ہم دیر تک اس زمانے کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ جب وہ ۱۹۸۶ء میں پھر نمودار ہوگا۔ اسوقت ملک کا کیا حال ہوگا۔ کونسی قوم ترقی کریگی۔ اور کس قوم کو زوال ہوگا۔

ان دنوں سید نور کو مجھ سے کچھ انس ہو گیا تھا کیونکہ وہ مجھکو اپنا ہم خیال سمجھتا تھا گو میری عمر صرف تینتیس ۳۳ سال تھی اور وہ ساٹھ کے قریب تھا مگر اس تفاوت نے کوئی خاص فرق نہیں ڈالا تھا۔ وہ مجھے اپنا ہم عمر سمجھتا اور مجھ سے اپنی جوانی کے قصے اسطرح بیان کرتا تھا گویا میں اُسکا پرانا رفیق ہوں، ہم بڑی دیر تک مسٹر ایوٹ ایبل (جسکو پشاور کے لوگ ابتک ابوطبیلہ کے نام سے یاد کرتے ہیں) کا ذکر کرتے رہے، یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پشاور کا ظالم گورنر تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم نکلسن کے ساتھ غدر کے ایام میں دہلی گئے تھے۔ اُسنے کہا کہ میں تو جانا چاہتا تھا تاکہ دہلی کی لوٹ میں میرا بھی حصہ لیکوں مگر یہاں کچھ فساد ہو گیا تھا جسکی وجہ سے میں اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکا، میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا بات تھی تو اُس نے جواب دیا کہ صاحب ہم تو ابتد اسے ہی اسے مذاق سمجھتے رہے لطف یہ ہے کہ انگریزوں کو اب تک بھی اس راز کا پتہ نہ لگا لیکن تم اسے سُنکر محظوظ ہو گے۔ کیا میں تمھیں سناؤں، میں نے کہا کہ ضرور سُناؤ۔ اُسکی آنکھوں میں وحشت سی چھا گئی۔ اور ہاتھ پاؤں کسی نامعلوم جوش سے بیقرار ہو گئے۔ اس نے مندرجہ ذیل واقعہ سنایا جسکو پہلی دفعہ میں معرض تحریر میں لاتا ہوں میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ اُسنے کہا تھا وہ ضرور سچ ہوگا۔

"صاحب! تمھیں یاد ہے، جب امیر دوست محمد خاں کابل سے اس جگہ انگریزوں سے گفتگو کرنے کے لئے آیا تھا تو اُسنے پشاور کے حدود میں محض تکبر کی وجہ سے داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور انگریزوں نے اسکے قیام کے لئے کچھ گڑھی (پشاور سے جانب جمرود ۵ میل فاصلے پر ایک مقام ہے) پر ایک عالیشان خیمہ نصب کیا اور اسکے اردگرد سینکڑوں خیمے استادہ کئے جن میں انگریزی فوجیں رہتی تھیں کیا تمھیں وہ زمانہ یاد ہے"

"ہاں، مجھے خوب یاد ہے۔ امیر موصوف ۱۸۵۷ء میں یہاں آیا تھا۔ اسکے خیمے کے نشانات ابتک بھی اس موقع پر موجود ہیں۔"

"ان دنوں ہم نوجوانوں کی بہار تھی۔ کیونکہ رائفل بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی تھی مگر ہم موقع پاکر سپاہیوں کے خیموں سے چرا لایا کرتے تھے۔ ہم نے گھاگرا[1] پلٹن کے خیموں سے کئی رائفلیں چرائیں، کیونکہ وہ تازہ ولایت سے آئے تھے اور سپاہیوں کو ہمارے کمالات کا علم نہ تھا، اگر حسن خاں نے معاملہ بگاڑ نہ دیا ہوتا تو ہم اس سے بھی زیادہ بندوقیں چرا لیتے مگر وہ بہت دلیر اور کوتاہ اندیش تھا۔"

"کیا وہ مر چکا ہے۔ تم نے اسکے متعلق تو کبھی ذکر نہیں کیا۔ وہ کب مرا ہے؟"

"وہ مدت کا مر چکا ہے۔ ان دنوں انگریزی افسر درۂ خیبر کو دیکھنے کے بہت خواہاں ہوتے تھے کیونکہ وہ ایک خطرناک مقام تھا۔ اور اسکی ڈراؤنی پہاڑیوں میں انسان کا دل کانپ جاتا تھا اگرچہ اب وہ ایسا پُر امن ہوگیا ہے جسطرح کہ چھاؤنی کا بازار مگر ان ایام میں ہم بڑی سختی سے اسکی حفاظت کرتے تھے اور کسی نو وارد کو زندہ واپس نہ جانے دیتے تھے، ایک دن پانچ انگریزی افسر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر درۂ خیبر میں گھس آئے۔ میں، میرا بھائی حسن خاں اور دو اور آدمی انکی تاک میں چٹانوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، یہ چٹانیں صاحبزادہ عبد القیوم[2] کے کنوئیں کے نزدیک ہیں۔ وہ یک بیک رک گئے۔ کیونکہ وہ کافی دور تک درہ میں آچکے تھے۔ پھر آپس میں کچھ گفتگو کرکے اور آگے چلے گئے۔ ہم اپنی کمین گاہ میں انکے انتظار میں بیٹھے رہے۔ اس اثناء میں ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ صلاح ٹھہری کہ ان فرنگیوں کو بندوق کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے کیونکہ اس کیمپ کی بدولت ہم لوگ گھاس اور لکڑیاں بیچکر بہت منافعہ حاصل کر رہے ہیں، علاوہ ازیں ہم انکے خیموں سے بندوقیں بھی نکال لاتے ہیں، مگر چونکہ فرنگیوں کو درۂ خیبر میں داخل ہونیکا کوئی حق نہ تھا اسواسطے ہم نے ارادہ کیا کہ انکو ڈرانے کے لئے دو چار گولیاں ہوا میں چھوڑ دینگے تاکہ آئندہ کوئی فرنگی داخل ہونے کی جرأت نہ کرے مگر حسن خاں نے ہماری گفتگو میں کوئی حصّہ نہ لیا وہ چپ چاپ ہماری باتوں کو سنتا رہا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ فوجی افسر واپس آئے، چار آگے آگے آ رہے تھے اور ایک نہایت خوبصورت نوجوان افسر انکے پیچھے قدم بقدم آ رہا تھا۔ پہلے چار فرنگی تو گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا کر ہمارے پاس سے نکل گئے مگر وہ نوجوان افسر جب ہمارے سامنے سے گذرا تو اس نے حسن خاں کو دیکھا جسنے اپنی بندوق اسکی طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ حسن خاں نے بندوق چلا دی۔ وہ افسر زخمی ہوا، اور اپنے گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا، اسکا گھوڑا دوڑ کر باقی سواروں سے جا ملا جو

---

[1] اس پلٹن فوج کی وردی ایک خاص قسم کی ہوتی ہے جسکی وجہ سے عوام الناس اسکو گھاگرا پلٹن کہتے ہیں۔ [2] سر نواب عبد القیوم خان صاحب نے مسافروں کے واسطے درہ خیبر میں ایک کنواں کھدوایا تھا جو ابتک موجود ہے۔

گولی کی آواز سنکر کھڑے ہوگئے تھے جب ہم نے دو تین گولیاں چلائیں تو وہ سب بھاگ گئے۔ اس واقعہ کے بعد ہم بہت ہنسے۔ مجھے اب بھی وہ نظارہ یاد آتا ہے تو بڑا لطف آتا ہے۔ مُلّا لوگوں نے اس قتل کے عوض حسن خاں کو غازی کا خطاب دیا چونکہ انگریزوں نے اسکے بعد سختی شروع کردی تھی اور قاتل کا پتہ لگانے میں بیحد کوشش کی تھی اسواسطے ہم اپنے گھروں سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ اس اثنار میں ہم نے سُنا کہ دہلی کا غدر شروع ہوگیا ہے اور ہمارے علاقے سے کئی آدمی نکلسن کے ساتھ روانہ ہوگئے اور وہاں جاکر خوب لوٹ مار کی۔ جب ہندوستان میں دوبارہ امن قائم ہوگیا تو انگریزوں نے بھی گذشتہ واقعات بھلا دیئے اسلیئے ہم بھی پشاور میں آنے جانے لگے۔ کیوں صاحب! کیا یہ واقعہ بھی تمھیں یاد ہے۔ یہ تو بڑی مدت کا ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں مجھے خوب یاد ہے کیونکہ میں نے جنرل اسٹاف کے پُرانے ریکارڈ میں یہ واقعہ پڑھا تھا اسمیں لکھا تھا:-

"جنوری ۱۸۵۸ء میں جب امیر دوست محمد خاں سر جان لارنس سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا تو اُسنے جمرود کے قریب قیام کیا تھا۔ ان ایام میں فوجی افسروں کی ایک چھوٹی جماعت درۂ خیبر کے اندر داخل ہوگئی۔ جہاں قبائل کے لوگوں نے انپر گولیاں چلائیں۔ ان میں سے ایک افسر لفٹنٹ ہینڈ کو کاری زخم لگا۔ چنانچہ وہ اسی رات کو مر گیا"

میں نے افسر مذکور کی قبر بھی جمرود کے قبرستان میں دیکھی تھی۔ اس وحشیانہ قتل نے مجھے بہت غصہ دلایا مگر میں یہ دیکھکر حیران ہوا کہ سید نور اسکو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا تھا وہ اسکو ایک مضحکہ خیز واقعہ سمجھتا تھا جب میرا غصہ فرو ہوا تو میں نے اس سے دریافت کیا، پھر حسن خاں کدھر گیا؟ اسنے کہا کہ فرنگیوں نے اسکو پھانسی دیدی۔ میں نے پھر پوچھا تو کیا اسے اسی جرم کی بنا پر موت کی سزا دیگئی تھی، اس نے کہا کہ نہیں۔ وہ اس قتل میں تو گرفتار نہیں ہوا تھا بلکہ اس واقعہ کے بعد وہ بہت مدت تک زندہ رہا۔ مگر اسکے بعد وہ ایک اور معاملہ میں گرفتار ہوگیا تھا، وہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری نبات خاں کے خاندان کے ساتھ قدیمی عداوت چلی آتی تھی اُنھوں نے تھوڑے عرصے میں ہمارے چھ عزیز قتل کر دیئے تھے، صرف میرا باپ بچ گیا تھا جب حسن خاں جوان ہوا تو ہماری قسمت نے پلٹا کھایا کیونکہ اسے زیارت چکنور سے ایک تعویذ عطا ہوا تھا جسکی وجہ سے وہ کسی لڑائی میں مضروب نہ ہوتا تھا اور ہر دفعہ صحیح سلامت بچ جاتا تھا۔ اس نے ایک ہی دن میں نبات خاں کے تین لڑکوں کو گولی کا نشانہ بنایا اور نبات خاں ایسا گھبرایا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ چنانچہ اسکی کھیتی باڑی تباہ ہوگئی۔ مگر ہم باقاعدہ اپنی اراضی کو کاشت کرتے تھے اور بڑے آرام سے بسر کرتے تھے۔ پھر حسن خاں سے ایک غلطی سرزد ہوگئی، اس نے

کسی طرح نبات خاں کی لڑکی سے تعلق پیدا کر لیا وہ لڑکی حسن خاں پر فریفتہ تھی، چنانچہ وہ اپنے گھر سے بھاگ کر ہمارے مکان میں آگئی اور حسن خاں کے ساتھ نکاح کر لیا، چونکہ حسن خاں نے لڑکی کے باپ کو رواج کے مطابق کوئی معاوضہ نہ دیا تھا اور نبات خاں کی مرضی کے خلاف یہ تعلق قائم ہو گیا تھا، اسواسطے اسکو لڑکی کے چلے جانے کا سخت قلق ہوا، اور اسکی غیرت کو سخت ٹھیس لگی کیونکہ اسکے خاندان کی ناموس کو بٹہ لگ گیا تھا۔ ہمیں اب بالکل یقین ہو گیا تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی ہم سے انتقام ضرور لیگا چنانچہ ہم پہلے سے بھی ہوشیار رہنے لگے۔ اسکے پاس کافی روپیہ تھا۔ اسواسطے ہمیں ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ چنانچہ ہم اپنے ہمسایوں پر بھی بالکل اعتبار نہ کرتے تھے۔ آخر کار ہم نے ارادہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح نبات خاں کو موقع پا کر قتل کر دینا چاہیئے تاکہ اس سے بیفکر ہو جائیں مگر نبات خاں بڑا چالاک تھا، وہ حتی الوسع ہمارے سامنے کبھی باہر نہ نکلتا تھا، آخر کار ایکدفعہ ہم پشاور کی سیر کر رہے تھے تو ہم نے نبات خاں کو ایک دوکان پر بیٹھا ہوا دیکھا وہ کبھی کبھی پشاور جایا کرتا تھا مگر وہ ایسا ہوشیار تھا کہ ہمیں اسکا پتہ نہ لگتا تھا۔ ہم اسکو انگریزی علاقے میں مارنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ یہاں پولیس گرفتار کر لیتی ہے اور تکلیف دیتی ہے لیکن ناچار ہمیں اپنا حساب بیباق کرنا پڑا، اس روز میرے ساتھ حسن خاں بھی تھا۔ نبات خاں کے ساتھ چار آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ صراف کی دوکان پر روپوں کے بدلہ اشرفیاں لے رہا تھا۔ چونکہ اسکی پشت ہماری طرف تھی اسواسطے وہ ہمیں نہ دیکھ سکا مگر ہمیں شک ہو گیا کہ وہ کوئی شرارت کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کو اشرفیاں دے رہا تھا۔ شاید وہ انکو ہماری ایذا رسانی کے لئے تیار کر رہا تھا۔ ہم ایک کونے میں چھپ کر اسکی حرکات کو دیکھتے رہے۔ آخر کار نبات خاں اس جگہ سے اُٹھا اور اپنے ہمراہیوں کو لیکر یکہ توت دروازے سے باہر چلا گیا۔ وہاں سے ایک راستہ زیارت جہل گزہ کی طرف جاتا ہے جسکے ارد گرد درختوں کے جھنڈ ہیں۔ نبات خاں نے وہاں جا کر دعا کی کیونکہ عام لوگوں کو یقین ہے کہ جو کوئی وہاں دعا کرتا ہے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کس قسم کی دعا کر رہا تھا۔ اس اثنا میں شام ہو گئی اور نبات خاں اور اسکے ساتھی مغرب کی نماز میں مشغول ہو گئے۔ میں اسوقت بھی محسوس کرتا تھا کہ ہم نے اسکی لڑکی کے معاملے میں اُسے بیجا طور پر ذلیل کیا تھا، اگر ہم اسے معاوضہ ادا کر دیتے تو نہایت مناسب تھا۔ اسواسطے ہمیں خوف ہوا کہ کہیں اسکی دعا قبول نہ ہو جائے اور ہم نے صلاح کی کہ اسکا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے پیچھے سے آکر اسکی پشت پر چھرے سے حملہ کیا اسوقت وہ نماز میں مشغول تھا، میں نے یہ بڑا ظلم کیا تھا اور قیامت کے دن مجھے اس وحشیانہ قتل کا جواب دینا پڑیگا۔ خیر وہ تو مرنے کے بعد دیکھا جائیگا۔ مگر ہمیں اسی وقت اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ میں تو بھاگ نکلا مگر حسن خاں ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور نبات خاں

کے ہمراہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ اسکے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور وہ کالے پانی بھیجدیا گیا۔ جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آیا۔

"خیر اس بیچارے کی قسمت میں یہی سزا لکھی تھی۔ مگر تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ اسے پھانسی کی سزا ملی تھی"

"ہاں فرنگیوں نے اُسے وہاں پھانسی دیدی تھی"۔

سید نور نے میری طبیعت کو سخت مکدر کردیا تھا۔ اسکی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ میں سلسلۂ گفتگو کو بند کرنا چاہتا تھا مگر میرے دلمیں خیال گزرا کہ حسن خاں کے انجام کے متعلق اس سے پورے طور پر دریافت کروں چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ کالے پانی میں تو قیدیوں کو پھانسی دینے کے لئے نہیں بھیجا جاتا وہاں اسے کیوں پھانسی کی سزا دی گئی؟

"وہاں بھی اس سے ایک حرکت سرزد ہوگئی تھی، اس نے ایک بڑے انگریز افسر کو قتل کردیا تھا۔ حسن خاں درحقیقت غازی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کوئی فرنگی کو قتل کریگا وہ بڑے ثواب کا مستحق ہوگا، وہ تو غازی کی موت مرنے کے لئے پیدا ہوا تھا کیا ہی اچھا ہوتا اگر اسکی قبر خیبر میں ہوتی کیونکہ یہاں اسکی قبر پر شہیدوں کا سفید جھنڈا لہرایا کرتا اور لوگ دور دور سے اسکی زیارت کو آتے، وہ ایک شیر ببر تھا اور ہر وقت انگریزوں کے قتل کرنیکا موقع ڈھونڈھتا تھا چنانچہ جب کبھی اسے موقع ملا اسنے بلاخوف و خطر اپنا فرض ادا کیا"۔

"اس واقعہ کو کتنا عرصہ ہوا ہوگا؟"

"چالیس سال ہوگئے ہونگے کیونکہ اس زمانہ میں میرا لڑکا (عبداللہ) پیدا ہوا تھا جو اب چالیس سال کا ہوگا اس قتل کی وجہ سے تمام ملک میں ایک کہرام مچ گیا تھا کیونکہ بیان کیا جاتا تھا کہ مقتول تمام فرنگیوں کا سردار تھا"

میں خاموشی سے سید نور کو دیر تک گھورتا رہا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے تسبیح کے دانے گن رہا تھا اتنے میں کسی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ اس نے میرے اضطراب کی مطلق پروا نہ کی۔ خاموشی سے اٹھا اور جوتے پہنکر نماز پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف چلا گیا۔

میں نے اپنے دماغ میں اس افسوسناک سانحہ کے واقعات کو دہرایا۔ جس نے ۱۸۷۲ء میں تمام ملک میں ماتم برپا کردیا تھا۔ لارڈ میو (وائسرائے ہند) ان دنوں پورٹ بلیر دیکھنے کے لئے گیا تھا وہ جب پہاڑی سے اُتر کر ساحل کی طرف واپس آیا تو کسی پٹھان نے پیچھے سے آکر خنجر سے اسکا کام تمام کردیا،

سر ولیم ہنٹر نے اس واقعہ کو اسطرح بیان کیا ہے :-

"جب لارڈ میو پہاڑ سے اترنے لگے تو شام ہو چکی تھی، راستہ میں خدمتگار مشعلیں لئے ہوئے رہبری کرتے تھے۔ لارڈ موصوف ساحل کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں انکا جہاز لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ ساحل تک پہنچنے کے لئے جنگل سے گذرنا پڑتا تھا اور وہ جنگل ساحل کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ لارڈ میو کے آگے آگے دو مشعلچی جا رہے تھے باقی جماعت انکے پیچھے آ رہی تھی، وہ ساحل کے کنارے پہنچ چکے تھے اور اپنی کشتی میں سوار ہونے والے تھے کہ لوگوں نے کسی جانور کے تیز دوڑنے کی آواز سُنی جو شاید پتھروں کے پیچھے سے نکلا ہوگا۔ ایک دو آدمیوں نے ایک ہاتھ کی جھلک مشعل کی روشنی میں دیکھی جس میں ایک بڑا چاقو چمک رہا تھا۔ پرائیویٹ سکریٹری نے کسی شخص کے گرنے کی آواز سُنی اور جب وہ آگے بڑھا تو اس نے ایک شخص کو شیر کی طرح وائسرائے کی پشت پر سوار دیکھا۔ لوگوں نے اسکو فوراً پکڑ لیا اور اگر ایک انگریز افسر انکو نہ روکتا تو اسکو وہیں قتل کر دیا جاتا۔ مشعلیں بجھ چکی تھیں، وائسرائے پانی میں گر گئے تھے بالآخر وہ اُٹھے اور اپنی پیشانی سے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ پرائیویٹ سکریٹری انکی امداد کو فوراً پہونچے۔ وائسرائے نے ان سے کہا کہ کسی نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔ پھر بلند آواز میں لوگوں نے انھیں کہتے ہوئے سُنا کہ خیر کچھ مضائقہ نہیں میں شدید مضروب نہیں ہوا ہوں۔ اسی وقت ایک گاڑی میں انھیں بٹھایا گیا۔ انکی پشت سے خون جاری تھا اور لوگ اپنے رومالوں سے اسکو بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے پھر انکو کشتی میں سوار کرایا گیا، زخم پر پٹی باندھ دینے سے خون بند ہو گیا تھا۔ جب کشتی جہاز کے قریب پہنچی تو آٹھ بج چکے تھے۔ کشتی کی بتیاں بجھا دی گئیں تاکہ جہاز والوں کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کیا معاملہ ہوا ہے، لوگوں نے لارڈ میو کو اُٹھا کر ایک پلنگ پر لٹا دیا مگر اسوقت وہ مر چکے تھے، اس ہولناک حادثے سے جہاز کے تمام آدمی ایسے افسردہ ہو گئے کہ ہر طرف بالکل خاموشی چھا گئی، انکی پشت پر دو زخم کاری لگے تھے۔ جہاز کو ماتمی لباس پہنایا گیا گورنمنٹ کے اعلیٰ افسروں نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا کہ عارضی وائسرائے کے متعلق کیا انتظام کیا جائے۔ یہ پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا کہ لارڈ نیپئر (مدراس کا گورنر) کو وائسرائے بنایا جائیگا، چنانچہ چند گھنٹوں میں ایک جہاز وائسرائے کی کونسل کے ایک ممبر کو بنگال اور دوسرا جہاز سکریٹری اُمور خارجہ کو مدراس لے گیا تاکہ وہاں لارڈ نیپئر کو کلکتہ لے آئے جنکو عارضی طور پر وائسرائے کے فرائض ادا کرنے تھے۔ قاتل کو جہاز پر بلوایا گیا، اور جب اس سے دریافت کیا گیا کہ اس نے کیوں ایسا فعل کیا ہے۔ تو اُسنے جواب دیا کہ میں نے خدا کے حکم سے یہ کام کیا ہے۔ چنانچہ قاتل کے خلاف باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ متعدد صاحب نے اس سے اسکے خاندانی حالات دریافت کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اپنی زبان سے کچھ نہ کہا تھا

وہ مرتے دم تک مطلق نہ گھبرایا۔ وہ سرحد کا باشندہ اور نہایت طاقتور تھا۔ اسکے ہاتھ پاؤں بیڑیوں سے جکڑے ہوئے تھے مگر اس حالت میں بھی اس نے ایک انگریز سنتری سے سنگین چھین لی تھی وہ اپنے جرم سے بالکل تائب نہ ہوا۔ اسنے بڑی خوشی سے اپنی تصویر کھچوائی جو پولیس والوں نے اسکی شناخت کے لئے ہندوستان کے کونے کونے میں بھجوائی "۔ مگر مسٹر ولیم ہنٹر نے قاتل کا نام یا اسکے گاؤں کا پتہ کہیں نہیں لکھا۔

میں نے اس رات کے بعد سید نور کو پھر کبھی نہیں دیکھا، میرے دریافت کرنے پر میرے انڈین اسسٹنٹ نے کہا کہ میرے پٹھان دوستوں نے یہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ مجھ سے بھی وعدہ لیا گیا کہ میں اسے اپنے پاس نہ آنے دوں۔ کیونکہ وہ عجیب آدمی تھا، چند ہفتوں کے بعد وہ انفلوئنزا کا شکار ہوا۔ بیچارے نے بیماری کا سخت مقابلہ کیا مگر موت کے سامنے آخر سر جھکانا ہی پڑا۔ میں نے ایک دفعہ اسکی قبر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ مجھے دکھلائی گئی، لیکن قبر پر کوئی جھنڈا وغیرہ نہ تھا کیونکہ ملا لوگوں نے نجابت خاں کے قتل کو فراموش نہیں کیا تھا۔ اسنے چہل گزہ زیارت کی سخت بیحرمتی کی تھی کیونکہ نجابت خاں کو نماز پڑھتے وقت قتل کیا تھا۔ اسکی قبر ریلوے لائن کے پاس ہے۔

درۂ خیبر بھی عجیب علاقہ ہے۔ ریلوے لائن کے بننے سے اس میں کچھ خاص فرق نہیں ہوا آیندہ بھی اس چھوٹے سے اسٹیج پر بڑے بڑے ڈرامے ہونگے کیونکہ یہ دو زبردست ملکوں کے درمیان ایک راستہ ہے اور ممکن ہے کہ آیندہ بھی اس میں زبردست لڑائیاں ہوں۔

(ترجمہ)

رسید کتب

گوپال کرشن گوکھلے (انگریزی) از مسٹر ٹی۔ کے۔ شاہنی۔ مطبوعہ میسرز جیون لال اینڈ سنس ۳۹۲۔ کالبا دیوی روڈ۔ بمبئی۔

ادبی خطوط غالب ۔ مرتبہ مرزا محمد عسکری بی۔ اے۔ حکیم عبدالعزیز روڈ لکھنؤ۔
قیمت ۱۲ر

علی مرتضیٰؑ ۔ از سید محمد منظور علی رضوی۔ ایم۔ اے۔ ایل ٹی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ
قیمت ۱۲ر

وائسرائے کا اعلان

از بابو اننت پرشاد نگم بی-اے-ایل-ایل-بی

لڑکوں نے سورج کو بچوں کا کھلونا تصور کر لیا ہے اور جسوقت سے وائسرائے کا اعلان شائع ہوا ہے اُسوقت سے لوگ جامہ میں پھولے نہیں سماتے ہیں - ہمارے بھولے پن کا یہ حال ہے کہ ہمکو ہمیشہ سنگدل معشوقوں کے وعدے وفا کی بو سے معطر معلوم ہوتے ہیں - انکی ذراسی توجہ پر بیوفائی کی لمبی چوڑی داستان خواب وخیال ہوجاتی ہے انکی ذراسی مسکراہٹ ہمارے گہرے گہرے زخموں کیلئے فوراً مرہم کا کام کرجاتی ہے - مثال کے طور پر آپ ذرا ۱۹۱۷ء کے واقعات پر ایک نظر ثانی کرلیجئے کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ مسٹر مانٹیگو کی تعریف اور توصیف میں ہم نے دفتر کے دفتر رنگ ڈالے تھے - حکومت وقت کی ذراسی دلفریب ادا کے سامنے ہم نے بیرحمی اور سنگدلی کی طول طویل داستان بھلا دی تھی کیا ہماری انتہائی خوشی کے سامنے کوئی ایسی پیشین گوئی کی ہمت کرسکتا تھا کہ ہمکو پھر کبھی تیغ ستم کا سامنا کرنا پڑیگا مگر وصل کی راتیں تو ازل سے مختصر بنائی گئی ہیں - پلک بھی نہ لگنے پائی تھی کہ ستمگر نے پھر اپنا وار کیا - کہیں رولٹ ایکٹ کے ہوش ربا تماشے ہیں اور کہیں مارشل لا کے ہیبت ناک نظارے - اب نہ گڑگڑانا کام آتا ہے اور نہ خوشامد میں ناک رگڑنا، غرضکہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا" یہاں بحث اس بات کی نہیں ہے کہ آیا مسٹر مانٹیگو کا ضمیر صاف تھا یا نہیں اور وہ واقعی ہندوستان کے بہی خواہ تھے یا نہیں - مان لیجئے کہ وہ تھے - پھر بھی کیا نتیجہ ؟ ہم نے مانا کہ ۱۹۱۷ء کا اعلان انکی ذاتی کوشش اور عالی ہمتی کا نتیجہ تھا لیکن اسکو میدان عمل میں لانے کے لئے مسٹر مانٹیگو ہر جگہ میسر نہیں آسکتے تھے آخرکار وہ بالکم ہیلی نے اسمبلی کے پلیٹ فارم پر کھلم کھلا کہدیا کہ ذمہ دار حکومت کا مطلب اہل ہند سوراج غلط سمجھ رہے ہیں - ذمہ دار حکومت کا اطلاق محدود اختیارات کی حکومت پر بھی ہو سکتا ہے اور وہی ۱۹۱۷ء کے اعلان کا صحیح مفہوم تھا لوگ کہتے ہیں کہ یہ فعل سرمالکم ہیلی کا تھا - برطانوی گورنمنٹ نے کبھی ایسے کلمات استعمال نہیں کئے - ذرا خیال کرنیکی بات ہے کہ ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ ہند کے ہوم ممبر

کے منہ سے ایسے اہم الفاظ نکلیں اور سارے ہندوستان کے بلند پایہ لیڈران انتہائی غم وغصہ کا اظہار کریں اور اہل حکومت پانچ سال کے طویل زمانہ تک خاموش رہیں۔ کیا ایسی حالت میں بھی کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان کلمات میں اہل حکومت کی منظوری شامل تھی ۱۹۱۷ء کے اعلان کے مضمون کا منشا کچھ بھی ہو لیکن اسمیں شک کرنا بیکار ہے کہ اسکے بعد سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء تک حکومت کی پالیسی میں ہندوستان کے لئے ڈومینین کے رتبہ کا اصول شامل تھا۔ موجودہ اعلان کے بعد البتہ ہمکو ۱۹۱۷ء کے دلفریب الفاظ کی قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ آخرش وہی الفاظ تھے جنکا مطلب ہمکو سر مالکم ہیلی نے بتلایا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ ان بزرگوار کو انگریزی سمجھنے کی تمیز نہ تھی؛ اور وہی الفاظ ہیں جنکے بارے میں آج لارڈ ارون آپ سے فرماتے ہیں کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی رائے میں ۱۹۱۷ء کے اعلان کا منشاء تو یہ ہے کہ ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ نوآبادیات کا درجہ ہوگا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ جو منشاء ۱۹۱۷ء کے الفاظ کا اسوقت جناب وائسرائے ہند نے بتلایا ہے، اسمیں مدبران برطانیہ میں سے قریب قریب ہر شخص کو اتفاق ہے۔ موقعہ ومحل کی شکایت ضرور ہے لیکن اس مفہوم کی تردید صاف الفاظ میں کسی نے نہیں کی۔ یہ بھی غنیمت ہے لیکن اگر آپ حساب لگائیں کہ جب اہل حکومت کو بارہ برس لگتے ہیں ان گول الفاظ کے صحیح معنے بتلانے میں تو کتنی صدیاں لگیں گی جبکہ صحیح معنوں کا حقیقتاً استعمال ہندوستان پر ہوگا تو زمین پیر کے نیچے سے نکل جاتی ہے۔

ذرا اس معاملہ پر بھی غور کیجئے کہ کون کون سے قصے اور قضیے ہو چکے جب ۱۹۱۷ء کے اعلان کے سچے مفہوم پر روشنی ڈالی گئی۔ اسوقت نان کوآپریشن کے زمانے کی یاد تازہ کرنا فضول ہے، لیکن اسمیں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ سائمن کمیشن سے جو واقعات وابستہ ہیں انکا تعلق موجودہ اعلان سے ضرور ہے۔ ہمارے حقوق کا فیصلہ کرنے کیلئے ۱۹۱۹ء کے قانون کے مطابق جو کمیشن مقرر کیا گیا اسکی ذاتیات کے متعلق ہم نے شروع ہی سے صدائے احتجاج بلند کردی۔ اگر ناگوار نہو تو اس موقعہ پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں برطانوی گورنمنٹ کی غلطی تھی۔ اگر سات ممبروں میں سے دو بھی ہندوستان کی لبرل جماعت میں سے چن لئے جاتے تو شاید جسقدر مخالفت اس کمیشن کی ہوئی ہے اسکا دسواں حصہ بھی نہ ہوتی اور نتیجہ آخر میں وہی ہوتا جو اب ہوا ہے صرف ایک قلیل جماعت والوں کی علیحدہ رپورٹ بھی بطور ضمیمہ رپورٹ کمیشن شائع کر دیجاتی۔ خیر ہوا یہ کہ ہندوستان کی ہر ایک پارٹی نے جسکی کچھ بھی حیثیت ہندوستان میں تھی کمیشن کو بائیکاٹ کرنیکی ٹھان لی۔ ہڑتالیں منائی گئیں، سیاہ جھنڈوں سے خیر مقدم کیا گیا، اور "سائمن واپس جاؤ" کی صداؤں سے خوش آمدید کا راگ گایا گیا، غرضکہ ہم نے اس امر کے ظاہر

کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا کہ ہم میں بھی غیرت اور حمیت قومی ہے۔ ہاں اکثر مقامات پر کماروں ملاحوں اور چماروں نے سر جان سائمن اور انکی پارٹی کو ٹوٹکیوں اور بھجن منڈلیوں سے خوش کرنیکی کوشش کی اور کہیں پر مرجع حقوق اور فرقہ وارانہ نیابت کے طلب کرنیوالوں نے ممبران کمیشن کی گرتی ہوئی طبیعتوں کو روکا، لیکن مثل مشہور ہے کہیں اُوس کے چاٹے پیاس بجھتی ہے۔ ممبران کمیشن برطانیہ کے معزز ارکان میں سے ہیں کیا وہ نہیں سمجھتے کہ ایرے غیروں سے ہندوستان کی نمایندگی نہیں ہوسکتی۔ یہ بات تو دن کی روشنی کی طرح صاف ہوگئی کہ کمیشن اگر ہندستان کو سوراج بھی دیدے تب بھی وہ ہندستان میں بیقدری کی نگاہ سے دیکھا جائیگا۔ بہرحال اس بیرخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپسمیں مشورے ہونے لگے کہ کسی صورت سے ہندوستانیوں کا دل ہاتھ میں لینا چاہئے ورنہ آزادی کی دھن میں خدا جانے یہ کیا کر کے رہیں گے۔ جس طریقہ سے ہوسکے ہندستانی جذبات کی اُمنڈتی ہوئی موجوں کو فرو کرنا چاہیئے ورنہ آیندہ دسمبر[1] میں لاہور سے نان کوآپریشن کی آواز پھر بلند ہوگی۔ لارڈ ارون ہزاروں میل کا سفر کر کے ولایت تشریف لے گئے! اور وہاں کے بہترین پولٹیکل طبیبوں سے ہندستان کی موجودہ بیچینی اور گھبراہٹ کا نسخہ لکھوالائے۔

اس نسخہ کے فوری اثر میں کسکو کلام ہوسکتا ہے کیسا خمار پیدا ہوگیا۔ ابھی کل ہم اہل حکومت کو کھری کھری سنا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ لیبر گورنمنٹ کی سخاوت انگلستان اور سفید رنگ والوں ہی تک محدود ہے۔ جب ہندوستان کا نام آتا ہے تو لیبر۔ لبرل اور کنسرویٹو سب ایک ہیں۔ ہم کہتے تھے کہ گورنمنٹ سے عدم تعاون ہی ہماری تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ لیکن اس نسخہ کی پہلی خوراک پیتے ہی ہم کہاں سے کہاں پہونچ گئے۔ ساری بیہوشی رفع ہوگئی۔ اور اب ہم ایسی ہی ہوش کی باتیں کرنے لگے جیسی کہ اگست ۱۹۱۷ء کے بعد کر رہے تھے، اسوقت مسٹر مانٹیگو کے ثناخواں تھے، اسوقت ویجوڈ بین کی مدح میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ لارڈ ارون کے احسانات کا شمار کر رہے ہیں۔ طرہ یہ کہ پرہیز کے معاملہ میں بھی ہم اپنے آپ کو مستقل مزاج مریض ثابت کر رہے ہیں۔ شکایت کا حرف زبان تک نہیں لاتے کہ مبادا اپنے دماغ پر یا طبیب کے دل پر مضر اثر پڑے ہم اس خیال میں مست ہیں کہ جس دوا کا استعمال ہمیں کرایا جا رہا ہے وہ ہمیں صحت کامل عطا کریگی

شکر ہے کہ پارلیمنٹ کے مباحثہ نے بہت جلد ہماری آنکھیں کھولدیں۔ اعلان کے حسن و قبح پر جو بحث ہوئی ہے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اہل برطانیہ ہماری بڑھتی ہوئی اُمیدوں اور اُٹھتے ہوئے جذبات کی تاب نہ لاسکے، وہ ہمکو آزادی کے خیال میں بھی زندہ رہنے دینا نہیں چاہتے۔ لارڈ ریڈنگ سابق وائسرائے ہند نے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور اس امر پر اصرار کیا کہ یہ امر واضح کر دیا جائے

[1] یہ مضمون لاہور کانگرس سے پہلے لکھا گیا تھا

کہ اس اعلان پر نو آبادیات کا درجہ جلد حاصل کرنیکی اُمیدیں باندھنا اہل ہند کے لئے عبث ہے۔ لارڈ برکنہیڈ سابق وزیر ہند تو ہمیشہ سے ہمارے پیچھے پڑے ہی تھے اُنھوں نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ سول نافرمانی کی دھمکی پر گورنمنٹ کو ہرگز ہرگز نہ دبنا چاہئے تھا۔ ہمکو آزادی ہند کے ان دشمنوں سے کوئی شکایت نہیں مگر ہمکو لارڈ پامور کی تقریر پر رونا آتا ہے۔ آپ کا جواب ہاؤس آف لارڈس میں لیبر گورنمنٹ کی جانب سے جواب تھا اور آپ کا یہ فرمانا کہ موجودہ اعلان ان تمام شرائط سے مشروط ہے جو ۱۹۱۷ء کے اعلان کیساتھ ملحقہ زنجیر تھیں ان تمام حوصلہ افزا خیالات کا خاتمہ کرتا ہے جو یکم نومبر ۱۹۲۹ء سے اہل ہند کے دلوں میں پیدا ہو رہے تھے۔ ہم تو مسٹر لائڈ جارج کی صاف گوئی کے قائل ہیں آپنے گورنمنٹ کو متنبہ کر دیا کہ ہندوستان کی توقعات میں اسوقت اضافہ کرنا چند روز کے بعد انکے لئے بدترین یاس اور ہراس کا سامان مہیا کرنا ہے۔ ہندوستان کی پولٹیکل ترقی کی انتہائی منزل درجہ نو آبادیات ہو لیکن وہ زمانہ ابھی بہت دور ہے، اگر ابھی سے اس خیال کی نشو ونما ہندوستانیوں کے دلوں میں ہونے لگیگی تو ان مصیبتوں کا جواب دہ کون ہوگا جو اس غریب قوم پر نازل ہونا شروع ہو جائیں گی۔ درحقیقت ہمکو ان مایہ ناز ہستیوں کا شکر گزار ہونا چاہئے کیونکہ اُنھوں نے صاف الفاظ میں ہمکو بتلادیا کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے۔ لارڈ ریڈنگ کو ہندوستان کی پنج سالہ حکومت کا تجربہ ہے۔ یہ بات اور ہے کہ وہ آج ہم سے چھ ہزار میل کی دوری پر ہیں اور ہماری موجودہ حالت کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔ لارڈ برکنہیڈ بحیثیت سابق وزیر ہند کے ہندوستان کے لئے بہترین اصول حکومت کی واقفیت پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ آپ تجارت پیشہ قبول کر بیٹھے ہیں۔ مسٹر لائڈ جارج کو سلطنت کی فرمانروائی کا زمانہ اب بھی یاد ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اب انکے پیروان صداقت کی تعداد بہت کم ہے۔ ان ہر سہ بزرگان کے سامنے کسکے منھ میں دانت ہیں جو حکومت کے نازک مسائل کے متعلق زبان کھول سکے۔ آپ کہیں گے کہ مسٹر ویجوڈ بین نے دارالعوام میں بہت اچھی تقریر کی، مسٹر لائڈ جارج کو خاموش کر دیا، اور لارڈ برکنہیڈ کے گریبان میں ہاتھ ڈالدیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ویجوڈ بین کی تقریر میں حسن تدبیر کی بو آتی ہے۔ مسٹر لائڈ جارج کا سوال معمولی نہ تھا، آپ فرماتے ہیں کہ اس اعلان سے لیڈران ہند کے دلوں پر بیجا اثر پڑا ہے کیونکہ جس گول میز کانفرنس کا وعدہ اس اعلان میں کیا گیا ہے اسمیں بیٹھ کر وہ نو آبادیات کے طرز کا انتظام حکومت مرتب کرنیکی فکر میں ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ڈومینین سیلف گورنمنٹ اب انکو فوراً ملا چاہتا ہے۔ کیا گورنمنٹ ہندوستانیوں کے اس خیال سے متفق ہے؟ اس سوال کا جواب ہاں میں دینا غالباً لیبر گورنمنٹ کے لئے پیغام اجل ثابت ہوتا۔ برعکس اسکے نفی میں جواب دینے سے

ہندوستانیوں کا غم و غصہ تازہ ہو جاتا۔ دو مخالف اور متضاد فریقوں کو ایک ہی فقرے میں راضی رکھنا کتنا مشکل مسئلہ ہے۔ بہترین مقرر اور مدبر کی پہچان بھی ایسے ہی نازک موقعوں پر ہوتی ہے۔ بین صاحب فرماتے ہیں کہ اعلان جیسا ہے ویسا ہے۔ میں نہ اسمیں ایک لفظ اضافہ کرونگا اور نہ اسمیں سے ایک لفظ نکالونگا۔ غرضکہ ہمارے لائق وزیر ہند نے ہر شخص کو اپنے خیال کا خبط قائم رکھنے کی آزادی دی اور آخر تک یہ نہ بتلایا کہ آخر ہونا کیا ہے۔ اگر در اصل وہ اہل ہند کے خیالات سے متفق ہیں تو یہ کہئے کہ انکی تقریر میں پارلیمنٹ کی باد مخالف کے روکنے کا راز پنہاں ہے اور اگر واقعات اسکے خلاف ہیں تو انکی خاموشی محض ہندوستانیوں کی چند روزہ تسلی کی بنا پر ہے۔ ہاں آپکو اس بات پر خوش ہونیکا اختیار ہے کہ مسٹر ویجوڈ بین نے لارڈ برکن ہیڈ اور انکی پالیسی کو موجودہ سیاست کے دائرہ سے خارج کر دکھایا مگر اس امر سے انکار کرنا بیکار ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں وہ عناصر کافی طور سے موجود ہیں جو ہندوستان کی آزادی میں سدراہ ہوں گے اور اگر مسٹر ویجوڈ بین اور مسٹر میکڈانلڈ سوراج دینا پسند بھی کریں تو بھی انکا کام آسان نہو گا۔

ایسی حالت میں کیا ہمارا فرض ہے کہ ہم محض موجودہ وزارت انگلستان کی تعریف و تحسین میں اپنا قلم اور کاغذ صرف کریں یا جن اسباب سے پولیٹکل معاملات میں ہمیشہ کامیابی ہوا کرتی ہے انکو فراہم کریں اور برکنہیڈ پارٹی کو یہ ظاہر کردیں کہ جبتک سوراج حاصل نہو جائیگا ہم نہ چین سے سوئیں گے اور نہ سونے دینگے۔ موجودہ اعلان ہمارے لئے پولٹکل یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہے بلکہ در اصل امتحان کا پرچہ ہے اگر ہم نے اسکے سوالات کامیابی کے ساتھ حل کئے تو ہم سوراج کی ڈگری کے مستحق ہونگے ورنہ ڈھاک کے وہی تین پات، کہیں منسٹروں کے اختیارات میں ذرا سا اضافہ ہوجائیگا کہیں ممبران کونسل کی تعداد میں ذراسی توسیع کردی جائیگی۔ یہ کہدیا جائیگا کہ مذہبی اختلافات کی وجہ سے ہندوستان ابھی آزادی کے قابل نہیں ہے۔ اہل ہند ابھی فنون جنگ سے ناواقف ہیں بیرونی حملوں سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ مس میو کے الزامات آپکے سر پر موجود ہیں۔ غرضکہ دو تین سال کی توتو میں میں کے بعد پھر آپ سے کہا جائیگا کہ آئندہ دس سالہ کمیشن کا انتظار کیجئے۔

مشاہیر ملک

پنڈت جواہر لعل نہرو

از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی

انسانی عمر میں چالیس سال کی مدت بلحاظ پختگی، تجربہ اور اہلیت کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ ہماری رائے میں اصلی کام کرنے کا زمانہ عمر کے چالیس سال کے بعد ہی کا زمانہ ہے جو کم و بیش ساٹھ ستر سال کی عمر تک قائم رہتا ہے۔ لیکن بہر حال دنیا کے مقتدر ہستیوں میں اُن خوبیوں کا ظہور تو بہت پہلے ہی سے ہونے لگتا ہے جو آگے چلکر اُنکو مقتدر ہستیوں کے زمرہ میں شامل کر دیتی ہیں۔ آفتاب کو نصف النہار پر پہونچکر پوری تیزی سے چمکنے کے لئے اپنی ابتدائی منزل میں اُفق کے مدھم مگر دل لبھانے والی سُرخی کا ساتھ لئے رہنا بالکل قدرتی و لازمی ہے۔ آج یہی بات پنڈت جواہر لال نہرو کے بارہ میں کہی جا سکتی ہے۔ ایک قومی کارکن کی حیثیت سے اُنکا بعجلت ترقی کرتے ہوئے صرف چالیس سال کی عمر میں انڈین نیشنل کانگریس جیسی اہم ملکی جماعت کا ایسے نازک موقع پر صدر منتخب ہونا اِس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ موصوف ابھی ایسے کتنے ہی کار ہائے نمایاں انجام دیں گے جو ملکی بہتری کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ اُنکے نام کو ملکی تاریخ کے اوراق پر زرّیں حروف میں ثبت کر دینگے۔ یہ درست ہو کہ اس انتخاب میں زیادہ تر مہاتما گاندھی کا ہاتھ تھا۔ پھر بھی یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس طرف چند سالوں سے مہاتما جی نے جس فراست اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے قومی اتحاد کے لئے مسلسل کوشش کی ہے اُسنے آج اُنھیں بالعموم قوم کا معتمد الیہ بنا دیا ہے۔ مہاتما جی کو اس اعتماد کا پورا احساس ہے اور ساتھ ہی اُن ذمہ داریوں کا بھی جو آپکی ذات سے وابستہ ہیں۔ پس جملہ اُمور کو مدنظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے انتخاب صدر کے متعلق جو سفارش کی ہے وہ بہر صورت مستحسن اور قابلِ اطمینان کہی جانیکی مستحق ہے۔ ہم تو اتنا اور عرض کرینگے کہ یہ انتخاب مہاتما جی اور پنڈت جی کی باہمی عقیدت کا نتیجہ ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مہاتما جی جیسے دُنیا کے عظیم ترین شخص کی عقیدت کا اہل ہونا کوئی سہل بات نہیں ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ موصوف کی پرورش جس ناز و نعمت اور خبرداری کے ساتھ ہوئی ہوگی اُسکا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ آپ پنڈت موتی لال نہرو

کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ پنڈت جواہرلال جی کی تعلیم ابتدا ہی سے خود انگریز اُستادوں کی زیر نگرانی شروع ہوئی اور اسکی تکمیل انگلستان کے ہارو اسکول اور بالآخر کیمبرج یونیورسٹی میں ہوئی جہاں سے آپ ایم۔اے کی ڈگری لیکر نکلے۔ اور ۱۹۱۲ء میں بیرسٹری کی سند بھی حاصل کی۔ اِن مخالف حالات کے ہوتے ہوئے بھی اُن کے دل میں حُبّ الوطنی کے جذبات اسدرجہ بھرے ہوئے تھے کہ انگلستان کے زمانۂ قیام اور دورانِ تعلیم میں بھی مادرِ وطن کی خدمت اور آزادی کا خیال برابر رہا۔ اگرچہ اُسوقت تک اُنھوں نے سیاسیات میں کوئی عملی دلچسپی نہیں لی تھی اور نہ اُنھیں اسکا موقع ہی تھا۔ درحقیقت وہ تو انسانی عمر کا وہ مخصوص زمانہ تھا جب خیالات بنتے اور بگڑتے ہوئے عقائد کے سانچے میں ڈھل جانے کے لئے رو براہ تھے۔

۱۹۱۲ء میں پنڈت جی بیرسٹر ہوکر ہندوستان واپس آئے اور الہ آباد ہائیکورٹ میں اپنے پیشہ کا کام شروع کیا۔ مگر حق تو یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں قومی خدمت کی سچی اور نہ مٹنے والی لگن ہو اُسکی وابستگی کسی ایسے کام سے کب ہوسکتی ہے جو قومی فوائد کے سراسر منافی ہو؟ پنڈت جی نے اپنے اس قانونی کام کو چار وناچار ۱۹۲۰ء تک جاری رکھا اور تحریک ترک موالات کے شروع ہوتے ہی اُنھوں نے اُس سے قطعی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب تو اُمید نہیں کہ وہ اُسکی جانب پھر کبھی رجوع ہوں۔ اس معاملہ میں وہ اپنے پدر بزرگوار سے کسی قدر آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیر۔ ۱۹۲۰ء کے قبل مسز بسنٹ کے ۱۹۱۷ء کی ہوم رول کی تحریک میں بھی موصوف نے خاصہ کام کیا تھا اور اسکے بعد ۱۹۱۹ء میں موصوف نے اُن تباہ کن نتائج کی تحقیقات میں کانگریس کمیٹی کی کافی مدد کی تھی جو پنجاب میں مارشل لا کی بدولت ظہور پذیر ہوئے تھے۔ بعدہٗ اُسی سال صوبۂ اودھ کے مزارعین اپنی تکالیف ومصائب سے تنگ آکر اپنی نجات کے طالب ہوئے اور اُنمیں ایک عام بیچینی پھیل گئی۔ وہاں پنڈت جی نے جس بیباکانہ جفاکشی کے ساتھ کام کیا وہ واقعی اُنھیں کا حصہ تھی۔ بالآخر اودھ کے قانون لگان میں اصلاح ہوئی، اس اصلاح میں یقیناً موصوف کی مساعی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

تحریک ترک موالات نے تو پنڈت جی کی کایا پلٹ دی۔ مزاج کی بے تکلفانہ سادگی نے اُنکو اپنی وضع قطع میں بھی سادگی پیدا کرنیکی ترغیب دی۔ اُنھوں نے قانونی پیشہ کو ترک کرکے انگریزی فیشن کو بھی خیرباد کہا اور کھدر کے سادہ اور پاکیزہ پوشاک زیبِ تن کی۔ عیش وآرام کی زندگی سے تو وہ اسکے قبل ہی فراغت پاچکے تھے۔ اسطرح موصوف نے امیری سے فقیری اختیار کرکے ملک کے غریب باشندوں سے اپنی کامل ہمدردی ظاہر کی اور اپنے آپ کو اُنکی خدمت کا سراپا اہل قرار دیا۔ یہ ایثار بھی محض معمولی نہ تھا۔ جب کوئی شخص اپنے وقت پیدائش ہی سے کسی ایک ہی قسم کی زندگی بسر کرنیکا عادی ہوجاتا ہے تو اس میں کوئی تبدیلی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے خصوصاً جب وہ زندگی امیرانہ زندگی ہو۔ ترک موالات کے سلسلے میں اُنھوں نے بیرسٹری کے علاوہ

پھر کسی ایسے شعبہ سے بھی واسطہ نہیں رکھا جسمیں سرکاری اقتدار کا کچھ شائبہ ہو۔ چنانچہ جب گیا کانگریس میں کونسل والی قرارداد پیش ہوئی اور ازاں بعد سوراجیوں کو کانگریس سے کونسل میں جانیکی اجازت ملگئی اُسوقت بھی موصوف نے وہاں جانا خلاف اصول سمجھا اور ابتک اپنی اُسی رائے پر قائم ہیں۔ اس معاملہ میں بھی انکو اپنے پدر بزرگوار سے اختلاف ہے۔ یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ کون حق بجانب ہے مگر اس سے پنڈت جواہر لال جی کے اُصول پرستی اور مستقل مزاجی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

فی زمانہ دنیا میں ماتحت قوم کے لئے حب الوطنی بھی ایک گناہ ہے، پس ہر محب وطن کے لئے اس گناہ کا کفارہ بھی لابُدی ہے۔ پنڈت جی بھی اِس کُلیّہ سے مستثنےٰ نہیں رہے۔ تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں زیادہ سرگرمی سے کام کرنے پر اُنھیں دسمبر ۱۹۲۱ء میں ۶ ماہ کی سزائے قید دیگئی مگر تین ماہ بعد رہا کردیئے گئے۔ رہائی کے چند ہفتوں بعد وہ پھر الہ آباد میں گرفتار کئے گئے اور ایک سال نو ماہ کی سزا کا حکم ہوا، مگر صرف نو ماہ بعد ملک کے دیگر سیاسی قیدیوں کے ساتھ وہ بھی چھوڑدئے گئے۔ تیسری بار وہ ۱۹۲۳ء میں بمقام ریاست نابھا گرفتار ہوئے جہاں وہ اُس ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کا بچشم خود مشاہدہ کرنیکی غرض سے گئے تھے جو وہاں اُسوقت سرکار کی جانب سے اکالی سکھوں کے ساتھ کیا جارہا تھا۔ موصوف کو ریاست چھوڑ دینے کا حُکم دیاگیا اور عدول حُکمی کے پاداش میں چھ ماہ کی سزائے قید دی گئی۔ مزید براں کسی سازش کے الزام میں دو سال کی سزا اور ہوئی۔ مگر ان سزاؤں کے باوجود بھی وہ فوراً چھوڑ دئے گئے اور ہر دو سزائیں ہنوز معرضِ التوا میں پڑی ہوئی ہیں۔ پھر جب موصوف نے ۱۹۲۷ء میں مدراس کانگریس کے موقع پر کامل آزادی کی تجویز پیش کی تھی اُسوقت سے بھی اکثر اُنکی گرفتاری کے متعلق افواہیں اُڑ رہی ہیں مگر وہ بفضلہ ۱۹۲۳ء کے بعد سے ابتک آزاد ہیں اور انکو قومی کام انجام دینے کا موقع برابر ملتا جارہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء کے بعد وہ تحریک ہی بالکل سرد پڑگئی تھی جو قوم کے نوجوانوں سے قربانی کا زبردست مطالبہ کرکے جواب شافی حاصل کرچکی تھی اور جس نے ہندی سونے کی کافی مقدار کو اُس قربانی کی تیز آگ میں تپا تپاکر کُندن بنا دیا تھا۔

۱۹۲۶ء و ۱۹۲۷ء میں پنڈت جواہرلال جی اپنی اہلیہ محترمہ کی سخت علالت کے سبب اُنکے معالجہ کی غرض سے یورپ میں رہے مگر وہاں کے زمانہ قیام میں بھی وہ مادر وطن کی خدمت سے غافل نہیں ہوئے بلکہ ضروری اُمور کی برابر اشاعت کرتے رہے۔ فروری ۱۹۲۷ء میں موصوف انڈین نیشنل کانگریس کے نمایندہ کی حیثیت سے اُس جلسہ میں بھی شریک ہوئے جو "جہانگیریت" کے خلاف برسلز میں منعقد کیا گیا تھا اور جہانگیریت شکن مجلس کی انتظامیہ کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ وہاں سے ہی وہ نومبر ۱۹۲۷ء

میں جمہوریۂ روس کے دسویں سالگرہ کے جشن میں شریک ہونے کے لئے ماسکو تشریف لیگئے۔ وہاں جو باتیں اُنھوں نے دیکھیں اُنکی تشریح و تفصیل موصوف کے "سوویٹ رشیا[1]" نامی کتاب میں موجود ہے جو شائع ہو چکی ہے اور جسکا ہندی ترجمہ بھی شاید چھپ چکا ہے۔ روس کے سفر اور وہاں کے حالات کے عینی مشاہدہ سے وہ بیحد متاثر ہوئے اور اُنکے سوشلزم والے عقائد کو اس سے مزید تقویت پہنچی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے سفر سے لوٹتے ہی ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے سالانہ جلسہ مدراس میں اپنے خیالاتِ تازہ کی اشاعت کی اور ہند کے لئے کامل آزادی کا مطالبہ کیا۔ ازاں بعد ۱۹۲۸ء میں جماعت آزادی ہند کے بانیوں میں شامل ہوکر اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی سبیل نکالی۔

دراصل پنڈت جی کے سینہ میں ایک دردمند دل ہے اور اُنکو ملک کے غریب ترین باشندگان یعنی کسانوں اور مزدوروں سے قدرتی ہمدردی ہے۔ اُنکی خستہ حالی موصوف کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی ہے۔ وہ بے اختیار تڑپ جاتے ہیں اور اُنکی بحالی اور فارغ البالی کے اعلیٰ سے اعلیٰ وسائل سوچنے اور اُن وسائل کو عملی صورت دینے کی کوشش کرنے میں موصوف کو ذرا بھی تامل نہیں ہوتا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اگرچہ وہ ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کے اُصول کے موید ہیں پھر بھی اُنھوں نے حال ہی میں اس اعلان پر اپنے دستخط ثبت کئے ہیں جو ارکانِ قوم کی جانب سے حضور وائسرائے ہند کے ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء والے اعلان کے جواب میں بمقام دہلی شایع ہوا ہے، جسمیں ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء تک چند شرائط پوری ہو جانے پر نوآبادیوں جیسی حکومت کو قابل قبول مانا گیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہاں تک مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ ہر حالت میں جادۂ اعتدال سے انحراف کرنے ہی پر تُلے ہوئے ہیں اور اُنھیں میانہ روی بالکل ہی پسند نہیں ہے، خواہ وہ ملک کی مجموعی رائے کے لحاظ سے ہی کیوں نہو؟ اُنمیں قوتِ برداشت بھی کافی ودیعت کی گئی ہے جسکے ثبوت میں اُس ناگفتہ بہ واقعہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو ابھی پارسال سائمن کمیشن کے آنے کے موقع پر لکھنؤ میں ہوا، جہاں اُنھوں نے کانگریس کے موجودہ عدم تشدد والے اُصول کا لحاظ کرکے، سرِ عام زد و کوب کے شکار ہوکر بھی ذلت و تکلیف کو بخوشی برداشت کیا۔

بہرکیف پنڈت جی کے طرز عمل سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ انتہا پسند ہوکر بھی طبعاً بلحاظ موقع و محل اعتدال پسند واقع ہوئے ہیں۔ اُنکی شرافت، سنجیدگی، منکسر مزاجی، کشادہ دلی اور بلند خیالی اُنکے بشرہ سے نمایاں ہے، گو ابھی اُنکا شمار ہندوستان کے مسلمہ لیڈران میں نہو پھر بھی اُنمیں رہنمائی اوصاف کا فقدان نہیں، اسوقت ملک میں زیادہ تر دو خیالات کے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں، ایک وہ جو کامل آزادی کے خواہاں ہیں اور دوسرے وہ جو نوآبادیوں کے نظام حکومت پر قانع رہنا چاہتے ہیں۔ پنڈت جی موقع

[1] Soviet Russia

شناسی اور مصلحت پسندی کے اعتبار سے "گرم" ہو کر بھی "نرم" بننا جانتے ہیں، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جسکا بنظر حالات حاضرہ کانگریس کے پریسیڈنٹ میں ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ انکو ملک کے نوجوانوں سے پوری اُمید اور اُنکے کاموں سے خاص دلچسپی ہے۔ وہ الہ آباد کے جماعت نوجوانان کے پریسیڈنٹ بھی ہیں۔ حد اعتدال سے یکدم متجاوز ہونیکا مادّہ نوجوانوں میں قدرتاً ہوتا ہے جنھیں حد مناسب پر رکھنا ہوگا قبل اسکے کہ اُنکی سرگرمیاں ملک و قوم کے لئے مفید بنائی جاسکیں۔ اس امر کے لحاظ سے بھی پنڈت جی نہایت موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے، مگر اسمیں شک نہیں کہ اسوقت جو کام موصوف کے سپرد کیا گیا ہے اُسکو سرانجام دینا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ ۱۹۲۸ء کے کلکتہ کانگریس اور ۱۹۲۹ء کے لاہور کانگریس کے درمیانی وقفہ میں ذمہ حکومت کی جانب سے کچھ ایسے وعدوں اور ارادوں کا اظہار کیا گیا ہے جن سے قومی ارکان کے قلوب کم و بیش ضرور متاثر ہوئے ہیں اور اُنکے خیالات میں کچھ تغیّر پیدا ہوگیا ہے، جہاں ہند کے سیاسی فضا ہولے پاس کے تند جھونکوں سے یکسر غبار آلود ہو رہی تھی وہاں رشحاتِ اُمید کے ہاتھوں اب گرد کچھ بیٹھتی ہوئی نظر آتی ہے، اگرچہ ہوا کے تیزی میں تھوڑا ہی فرق ہوا ہے۔ بہرحال یہ موقع اپنی عجیب و غریب نزاکت کے اعتبار سے شاید کانگریس کے چہل سالہ تاریخ میں پہلا موقع ہے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ پنڈت جواہر لال جی سرکار و رعایا دونوں کے طبائع اور دونوں کے امکاناتِ عمل پر نظر رکھتے ہوئے اس موقعہ کو سنبھالنے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں؛ لیکن جس شخص نے تقریباً گزشتہ چھ سالوں میں کانگریس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنے حُسن کارگزاری کا (بالخصوص نہرو رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں) ثبوت دیا ہے اُس سے بحیثیت صدر کانگریس بھی قوم کی مُرادیں بر آنے کا قوی امکان ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۲۹ء

گلدستہ کشیدہ کاری

مرتبہ بیگم محمد حنیف صاحبہ حجم ۴۸ صفحات۔ قیمت قسم اول ۱۲ر قسم دوم ۸ر

اس گلدستہ میں مختلف بیل بوٹوں کے متعدد نمونے ہیں، جنکو دیکھکر حسب ہدایات مندرجہ گلدستہ بیل بوٹے بنانے میں آسانی ہوگی۔ لڑکیوں کے لئے یہ گلدستہ خاص طور پر مفید ثابت ہوگا، شائقین دی کشیدہ کاری ڈپو شملہ سے منگا سکتے ہیں۔

یادِ رفتگان

مہاراجہ چندر شمشیر جنگ بہادر رانا مرحوم

نیپال میں راجپوتوں کی حکومت ہی اور ابھی تک وہاں کا انتظام سلطنت ہندو راج نیتی کے مطابق ہوتا ہی حکومت کے تقریباً تمام اختیارات وزیر اعظم کے ہاتھ میں رہتے ہیں اور وہی مہاراجہ حکمران وقت کی طرف سے کل احکام جاری کرتے ہیں جن پر دستخط مہاراجہ نیپال کے ہوتے ہیں۔ آخری وزیر مہاراجہ چندر شمشیر جنگ بہادر رانا تھے جنکا ماہ گذشتہ میں انتقال ہوگیا ہے، انکے حالات زندگی سبق آموز ہیں، اس لئے ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں،

مہاراجہ چندر شمشیر جنگ بہادر مرحوم ۸ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے، وہ اپنے باپ کے پانچویں فرزند ارجمند تھے اور اپنے خاندان میں سب سے پہلے انھیں نے کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اُنکے چچا جنگ بہادر افواج نیپال کے کمانڈران چیف اور عملی طور پر وزیر اعظم تھے۔ ریاست نیپال میں دستور ہے کہ بادشاہ اپنے اختیارات سے کسی کو وزیر اعظم نہیں بنا سکتا بلکہ یہ عہدہ جدی ہے اور ایک وزیر اعظم کے مرنے کے بعد اُسکے خاندان کا بڑا رکن اسکا جانشین مقرر ہو جاتا ہے، چنانچہ ہنوز مہاراجہ مرحوم تعلیم سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ اُنکے والد کا انتقال ہوگیا اور مجبوراً تعلیم کا سلسلہ منقطع کرکے ان کو نیپال واپس جانا پڑا۔

والد کے انتقال کے بعد مہاراجہ شمشیر جنگ بہادر کی زندگی میں نمایاں تغیر پیدا ہوگیا، چونکہ اُنکے بڑے بھائی کا انتقال ہوچکا تھا اس لئے باپ کی وفات کے بعد وہ اوّل سینئر کمانڈران چیف مقرر کئے گئے بعد ازاں کئی سال تک وزیر خارجہ اور محکمۂ تعلیم کے افسر اعلیٰ رہے اور سنہ ۱۹۰۱ء میں مستقلاً افواج نیپال کے کمانڈران چیف مقرر ہوگئے۔ دوسرے سال ایک اندرونی انقلاب میں اُنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور ۲۶ جون سنہ ۱۹۰۲ء کو وزیر اعظم کے معزز و ممتاز عہدہ پر فائز ہوگئے اور آخر دم تک اپنے فرائض منصبی کو نہایت دانشمندی و دور اندیشی سے انجام دیتے رہے۔

ریاست نیپال کے وزیر اعظم کے اختیارات دوسرے ممالک کی طرح محدود نہیں ہوتے بلکہ اُمور ریاست

میں اسکے اختیارات بادشاہ سے سہ چند ہوتے ہیں۔ بادشاہ صرف شاہی اعلانات پر دستخط کرسکتا ہے۔ باقی داخلی و خارجی امور وزیر اعظم کی سپرد ہوتے ہیں اور وہ سیاہ و سفید کا واحد مالک و ذمہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ مہاراجہ مرحوم نے قلمدان وزارت سنبھالنے کے بعد تمام اندرونی و بیرونی مخالفانہ سرگرمیوں کو ٹھنڈا کردیا اور شاہی خاندان کے افراد میں جو اختلاف تھا اسکو بوجہ احسن دور کردیا اور عام طور پر انکا طرز حکومت پسند کیا گیا

مہاراجہ مرحوم نے نیپال کی بہبودی اور رعایائے نیپال کی سرسبزی کے واسطے بہت کچھ خدمات انجام دیں جن میں سے خصوصیت سے قابل ذکر غلامی اور رسم ستی کا انسداد ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرانے میں ریاست کا سینتیس لاکھ روپیہ صرف ہوا، آپ ہی کے عہد میں رسم ستی بھی قانوناً بند کی گئی اور پبلک کے فائدہ کی غرض سے ریاست کے مختلف حصوں میں اسکول، شفاخانے اور عدالتیں قائم کی گئیں۔ متعدد بڑی سڑکیں اور ایک چھوٹی سی ریلوے لائن بھی تعمیر کرائی جو کھٹمنڈو سے انگریزی علاقہ کو ملاتی ہے۔

نیپال کے وزیر اعظم کے لئے مہاراجہ کا خطاب تو خیر موروثی ہے، مہاراجہ مرحوم کو وزیر اعظم مقرر ہوتے وقت مارشل کا خطاب ملا، اور منجانب گورنمنٹ ہند جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا اور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی طرف سے جی۔ سی۔ بی کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں اپنے سفر انگلستان کے دوران میں بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کے مہمان رہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی نے آپکی خدمت میں ڈاکٹر آف سول لاکی آنریری ڈگری پیش کی۔ ۱۹۱۱ء میں دربار تاج پوشی کے موقع پر آپکو بطور شاہی مہمان دہلی میں مدعو کیا گیا اور اکیس توپوں کی سلامی دی گئی۔

حکومت ہند کے ساتھ آپ کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے۔ آپ نے وقتاً فوقتاً گورنمنٹ ہند کو قابل قدر امداد بھی دی۔ جب فیلڈ مارشل لارڈ کچنر نیپال گئے اور انھوں نے گورنمنٹ برطانیہ کی طرف آنریری میجر جنرل آف برٹش آرمی کا منصب جلیل آپکو پیش کیا تو مہاراجہ مرحوم نے لارڈ کچنر کو افواج نیپال کا آنریری جنرل مقرر کیا اور انگریزی فوج کے واسطے گورکھا سپاہی بھرتی کرنے میں امداد دی، جسکی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس موقع پر سولہ ہزار گورکھے بھرتی کئے گئے۔ غرض جنگ عظیم کے دوران میں مہاراجہ مرحوم نے برٹش گورنمنٹ کی ہر طرح سے مدد کی حتیٰ کہ اپنی طرف سے بھی کئی ہزار گورکھا سپاہی بھیجے۔ انھیں تعلقات کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۳ء میں گورنمنٹ ہند اور حکومت نیپال کے درمیان ایک جدید عہد نامہ ہوا جسمیں برٹش گورنمنٹ نے نیپال کی آزادی و خود مختاری تسلیم کی اور اسکے ساتھ ہی مہاراجہ شمشیر جنگ مرحوم کے حسن خدمات کا بھی اعتراف کیا۔ افسوس کہ تقریباً چھیاسٹھ سال کی عمر میں گزشتہ ماہ میں مہاراجہ شمشیر جنگ نے اس دار فانی سے جانب ملک بقا کوچ کیا۔ اگرچہ مہاراجہ اب دنیا میں موجود نہیں مگر ان کے کارہائے نمایاں مدت دراز تک زندہ رہیں گے اور لوگوں کے لئے درس بصیرت ثابت ہونگے۔



مہاراجہ سر چندر شمشیر جنگ بہادر مرحوم
وزیر اعظم نیپال
پیدائش سنہ ۱۸۶۳ء وفات سنہ ۱۹۲۹ء



موسیو کلینشیو مرحوم
سابق وزیر اعظم فرانس

کلیمنشو

موسیو کلیمنشو جنکا انتقال ۲۴ر نومبر ۱۹۲۹ء کو ہوا، فرانس کے مشہور و معروف مدبر تھے جنکا گزشتہ جنگ یورپ کے دوران میں تمام یورپ و امریکہ بلکہ تمام دنیا میں شہرہ تھا، آپ ستمبر ۱۸۴۱ء میں بمقام موئیرن ونڈی پیدا ہوئے تھے اور دارالخلافہ پیرس میں علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ فرانس کے زوال کے زمانہ میں ان کو کئی مرتبہ قید و بند کا بھی شکار ہونا پڑا تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح اس سے آزاد ہوکر امریکہ چلے گئے جہاں اُنھوں نے خوش نصیبی سے ایک متمول امریکن خاتون سے شادی کرلی۔

بعد چندے کلیمنشو اپنے وطن مالوف کو واپس آئے اور پیرس میں مانٹ مارٹی کے صدر مقرر ہوگئے اور چند ہی سال کے اندر اُنھوں نے سیاسی حلقوں میں اپنی قابلیت و مستقل مزاجی کا سکہ دلوں میں بٹھا دیا حتی کہ جب ۱۸۸۵ء میں وزارت فیری کو شکست حاصل ہوئی تو لوگوں نے اسکا اصلی باعث کلیمنشو ہی کو قرار دیا اور اسوقت سے عرف عام میں انکا لقب "شیر فرانس" اور "کابینہ شکن" ہوگیا۔ اسکے بعد کچھ مدت تک اُنھوں نے سیاسیات سے علٰحدگی اختیار کرلی مگر فرانسیسی کلیسا کے متعلق مباحثہ پیش آنے پر عام معاملات میں پھر دلچسپی لینے لگے۔ بالآخر ۱۹۰۶ء میں کلیمنشو حکومت فرانس کے وزیر داخلہ مقرر ہوئے اور اس دن سے لیکر آخر عمر تک انکی پوزیشن روز بروز مستحکم ہوتی گئی حتی کہ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو فرانس کے وزیر اعظم کے جلیل عہدہ پر فائز ہوگئے۔ اور ۱۶ر نومبر ۱۹۱۷ء کو جو جنگ عظیم میں ایک اہم تاریخ ہے، فرانس کے وزیر جنگ بھی ہوگئے۔ اسوقت انکی عمر چھہتّر سال تھی مگر پیرانہ سالی کے باوجود انکی ہمت جوان تھی' اُنھوں نے اپنی حسن تدبیر سے فرانس کی گرتی ہوئی پوزیشن کو سنبھال لیا، اور انگلستان سے اپنے ملک کے لئے بہترین تعلقات قائم کرلئے۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کے ساتھ بھی کلیمنشو کے ذاتی تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے' یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے مدبران کی طرف سے اچھے خیالات رکھتے تھے۔ مگر کلیمنشو اپنے وطن کے زبردست محب تھے، چنانچہ صلح کانفرنس کے موقع پر اُنھوں نے برابر فرانس کے مفاد کی حفاظت کی۔ اپنے ملک کے لئے وہ اس صلح سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی فکر میں تھے اسی سبب سے وہ ولسن کے چودہ اُصول کو علانیہ ناپسند کرتے تھے مسٹر لائڈ جارج اور دوسرے نمایندوں کی طرح وہ جرمنی سے ایک قابل عزت صلح کرنے کے موافق نہ تھے۔ درحقیقت وہ جنگ کے اسقدر قائل تھے کہ دیرپا امن و امان کی خواہش سے بھی بے پروا تھے۔ مارشل فوشش بھی اس معاملہ میں انکے ہمخیال ثابت ہوئے چنانچہ ان دونوں مدبروں نے ملکر ان تمام اعتراضات کو جو فرانس کے رویہ پر ہوئے تھے کامیابی سے رد کردیا۔

تکمیل صلحنامہ کے بعد فرانسیسی چیمبر میں اختلاف رائے ہونے پر کلیمنشو کی وزارت کا خاتمہ ہوگیا اور

وہ سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر سیر و سیاحت اور مطالعۂ کتب میں اپنا وقت صرف کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں وہ ہندوستان بھی آئے اور یہاں انگریز حکام کیطرف سے انکا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ انکی پرائیوٹ زندگی بہت دلچسپ تھی اور وہ اپنے دوستوں سے بہت آزادی کے ساتھ ملتے اور گفتگو کرتے تھے۔ بہر حال مرحوم ایک سچے محب وطن و قوم پرست تھے اور اپنے ملک کی بہبودی کے واسطے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے انکا زاویۂ نگاہ قدرتاً محدود تھا مگر اسمیں شک نہیں کہ وہ ایک ایسے شخص تھے جن کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی اور فرانس کے ہیرو کے نام سے انکا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔

تصانیف مسٹر یدہسٹر مسٹر یدہسٹر نے نوعمر طالب علموں کے مطالعہ کے لئے متعدد چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں۔ زبان صاف اور اسقدر آسان رکھی ہے کہ اُردو زبان سے معمولی طور پر واقف بچے ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے ہر کتاب کا سرورق کتاب کے ہیرو کی رنگین تصویر سے مزین ہے اور ہر کتاب میں واقعات کی مناسبت سے متعدد رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ صرف "بیر ابھیمنیو" میں تصویریں نہیں ہیں۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے بچوں کے دلوں میں صرف مطالعہ کا شوق ہی پیدا نہ ہوگا بلکہ بہت سے اخلاقی سبق بھی حاصل ہونگے۔ ذیل میں ان کتابوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) **بیر ارجن کی کہانی** اسمیں بہادر ارجن کے سوانح حیات۔ پیدائش۔ عہد طفولیت۔ دروپدی کا سوئمبر۔ ارجن اور بھیشم کی جنگ۔ فتح وغیرہ بہت خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۸ر

(۲) **مہارانا پرتاب سنگھ** اسمیں چتوڑ کے بہادر مہارانا پرتاب سنگھ کے حالات ہیں۔ شہنشاہ ہند اکبر سے مہارانا کی لڑائی وغیرہ کا ذکر ہے۔ قیمت ۶ر

(۳) **شہزادہ پرہلاد** یہ ایک ایشور پرست شہزادہ کا قصہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر ایشور بھگتی میں لگا رہے اور اُسپر پورا پورا بھروسہ رکھے تو دنیا کی کوئی مصیبت اُسے نہیں ستا سکتی۔ قیمت ۶ر

(۴) **نل اور دمینتی**۔ یہ راجہ نل اور دمینتی کا مشہور قصہ ہے جسکو مختصر طریقہ پر سادگی کیساتھ لکھا گیا ہے قیمت ۶ر

(۵) **بیر ابھیمنیو** اسمیں جنگ مہابھارت کے ہیرو بہادر ارجن کے بیٹے "بیر ابھیمنیو" کی زندگی کے حالات ہیں قیمت ۴ر

(۶) **پیارے نانک کی پیاری باتیں** اسمیں سکھوں کے گُرو باوا نانک کی زندگی کے حالات از ابتدا تا انتہا مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۸ر

(۷) **پھولوں کی کیاری**۔ یہ نو چھوٹے چھوٹے اخلاقی قصوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت ۸ر

یہ سب کتابیں پوری برادرس بک سیلرز۔ کچہری روڈ۔ لاہور سے ملسکتی ہیں۔

تنقید کتب

چمنستان شعراء مولفہ رائے لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی ضخامت تقریباً ۶۰۰ صفحات
مجلد قیمت صہ ملنے کا پتہ - انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

انجمن ترقی اُردو حیدر آباد قدیم نایاب کتابوں کو تلاش کر کے بعد صحت شائع کرنے میں کوشاں ہے اور ابتک متعدد نایاب کتابیں شایع کر چکی ہے - اسی سلسلہ کی ایک کڑی پیش نظر کتاب بھی ہے جو ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ہے جسکو دکن قدیم کے نوجوان رائے لچھمی نراین شفیق نے ۱۱۷۵ھ میں مرتب کیا تھا اگرچہ اس تذکرہ کی بنیاد میر تقی میر اور فتح علی گردیزی کے تذکروں پر ہے اور زیادہ تر حالات انھیں سے ماخوذ ہیں لیکن ان کے علاوہ اور شعرا کے حالات بھی جو کچھ معلوم ہو سکے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ مؤلف تذکرہ نے حتی الامکان تلاش و تحقیق حالات میں کوشش کی ہے اور ہر شاعر کے متعلق انصاف کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔ اسمیں ۲۱۳ شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام ہے۔

تذکرہ کے شروع میں مولوی عبدالحق بی۔ اے۔ سکرٹیری انجمن ترقی اُردو کا ایک دیباچہ ہے جسمیں مؤلف تذکرہ کے مختصر حالات ذوق شعر گوئی و سخن سنجی اور تذکرہ کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز ایسے شعرا کے حالات جن کا ذکر اسمیں موجود نہ تھا ایک اور تذکرہ "تحفۃ الشعرا" سے اخذ کر کے حاشیہ پر لکھدیئے ہیں۔ اس طرح حتی الامکان اس تذکرہ کو مکمل بنایا گیا ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی مطبوعات عموماً ٹائپ میں چھپتی ہیں اُردو زبان میں ٹائپ کا رواج اگرچہ مفید ہے اور علمی کتابوں میں جہاں تصاویر دئے جانے کی ضرورت لازمی ہوتی ہے آسانی کے ساتھ اسکی تکمیل ہو سکتی ہے مگر ٹائپ میں کتاب کی ضخامت دوچند ہو جاتی ہے اور لاگت بھی زیادہ آتی ہے، اس لحاظ سے اسکی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔ بہر حال اسکا حجم ۶۰۰ صفحات کا ہے اور اسکی قیمت صہ ہے قدیم شعرا کے

حالات وکلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ تذکرہ بہت کارآمد ہوگا۔ اہل ذوق کو اسکے مطالعہ سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔

ادبی خطوط غالب

مرتبہ مرزا محمد عسکری بی۔اے لکھنوی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸۔ ضخامت تقریباً ۳۵۰ صفحات قیمت ۶/۔ ملنے کا پتہ۔ مرتب صاحب۔ حکیم عبد العزیز روڈ۔ لکھنؤ

مرزا غالب کے زمانہ تک ہندوستان میں عموماً فارسی ہی میں خط وکتابت کی جاتی تھی۔ اور اہل علم اُردو میں خطوط لکھنا کسر شان سمجھتے تھے۔ مگر غالب کی جدت پسند طبیعت نے اس باب میں وہ انداز تکلم اختیار کیا کہ خود انکی زندگی ہی میں ان کے خطوط مقبول خاص وعام ہوگئے۔ درحقیقت جسطرح اُنھوں نے عام مذاق سخن سے علیحدہ ہوکر داد سخن سنجی دی اسی طرح نثر مراسلات نویسی میں وہ عام سطح سے بہت بلندی پر پہونچ گئے ہیں۔ انکے خطوط کے انداز تحریر نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ یہی خصوصیت ہے کہ آج تک اہل ذوق ان خطوط کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔ اُردوئے معلیٰ اور عود ہندی کہنے کو روزمرہ کے مراسلات کے مجموعے ہیں لیکن ان میں لطائف ادبی ونکات سخن کے سیکڑوں سدابہار چمن آراستہ ہیں۔ مرزا محمد عسکری صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ مرزا کی نظم سے جسقدر دلچسپی کا اظہار رہا ہے اسکے مقابلہ میں انکی نثر کی طرف بہت کم حضرات نے توجہ کی ہے حالانکہ نظم کی طرح مرزا کی نثر بھی غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لائق ہے۔ اسی خیال کو مد نظر رکھکر آپنے مجموعہائے خطوط غالب سے ایسے خطوط جنمیں غالب نے نکات سخن حل کئے ہیں یا اشعار کے معنی سمجھائے ہیں یا بعض متقدمین ومعاصر شعراء کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے انتخاب کرکے اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے۔ شروع میں ایک مفید وقابل قدر بسیط دیباچہ ہے جسمیں غالب کے انداز تحریر پر نہایت قابلیت کیساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں قابل مؤلف نے ان اصحاب کی جنکے نام خطوط ہیں مختصر سوانح عمری نہایت تحقیق وتفتیش اور عرق ریزی کیساتھ دیدی ہے۔ لطائف ادبی کے علاوہ معمولی نجی باتوں کو اس مجموعہ میں حذف کردیا گیا ہو اگرچہ غالب کے نجی خطوط بھی دلچسپ ہیں مگر اس چمنستان ادب سے سبزۂ بیگانہ کا خارج کردینا ہی مناسب تھا کیونکہ اگر ان خطوط سے غیر متعلق باتیں الگ نہ کردی جاتیں تو مطالعہ کے دوران میں نکات ادبی پر غور کرنیوالے کا دماغ دوسری طرف متوجہ ہوجاتا اور اس طرح اسکی لطف اندوزی میں کمی ہوجاتی۔

مرزا محمد عسکری صاحب نے جس محنت اور قابلیت سے یہ خطوط مرتب کئے ہیں وہ بہت قابل قدر ہے ہمکو امید ہے کہ قدردانان غالب ان جواہر پاروں کی قدر کرینگے اور اس ادبی گلدستہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے

بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب سال حال کی خاص تصانیف میں شمار ہونے کے قابل ہے اور ہم اسکے لائق مرتب کو اسکی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اسکی لکھائی چھپائی بھی عمدہ اور کاغذ دبیز استعمال کیا گیا ہے۔

عودِ ہندی

از مرزا غالب دہلوی مرحوم۔ دستی تقطیع۔ حجم ۳۰۰ صفحات سے زائد
پبلشر لالہ رام نراین لال بکسیلر الہ آباد۔

خطوط غالب میں اُردوئے معلیٰ اور عود ہندی دونوں مجموعے عام طور پر مشہور و مقبول ہیں اور انکے مزید تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم خوش ہیں کہ اُردوئے معلیٰ اور اُردو زبان کی بعض دوسری قدیم کتابوں کی طرح لالہ رام نراین لال بکسیلر الہ آباد نے عود ہندی کو بھی دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے اور غالب کے قدردانوں کے لئے یہ ایک عمدہ تحفہ ہے۔

فرہنگ امثال

ملنے کا پتہ۔ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروالہ۔ الہ آباد

اس چھوٹی خوبصورت سی کتاب میں سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے فارسی و عربی زبانوں کے وہ اشعار مصرعے اور فقرے جمع کئے ہیں جو اُردو میں بطور ضرب المثل مستعمل ہیں۔ ہر مثل کے لفظی معنی یا اسکا مطلب بیان کرنے کے بعد اسکا محل استعمال بھی بتایا ہے۔ اُردو خواں طلباء اس سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں قیمت ۱؎

جواہر اللغات فارسی

مؤلفہ منشی بشمبھر دیال۔ پاکٹ سائز۔ مجلد۔ قیمت ۱۲؎
ملنے کا پتہ:۔ مسٹر رام نراین لال بکسیلر الہ آباد۔

لالہ رام نراین لال صاحب بکسیلر الہ آباد طلبہ کے فائدہ کیواسطے قابلقدر کتابیں شائع کر رہے ہیں انگریزی زبان کی متعدد لغات کے علاوہ فارسی کی یہ چھوٹی سی لغت بھی مفید و کارآمد ہے۔ قابل مؤلف نے اسکو نہایت محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ فارسی کی ضخیم لغات کے مقابلہ میں طلبہ کے لئے یہ لغت اس لئے اور بھی کارآمد ہے کہ اسمیں فارسی الفاظ کے معنی اُردو میں بیان کئے گئے ہیں۔

آل انڈیا مشاعرہ

مرتبہ مولانا احسن مارہروی۔ قیمت ۱۲؍۔ ملنے کا پتہ۔ مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ

انجمن خیابان اُردو" انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی میں ہرسال ایک شاندار مشاعرہ کیا جاتا ہے جس میں ہندوستان کے مشاہیر شعراء کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے اور ان میں سے اکثر اصحاب شریک بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں جو سالانہ مشاعرہ ہوا تھا اسکی روداد اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ جسمیں مولانا حسرت موہانی، چودھری جگت موہن لال رواں وکیل اناؤ، حضرت ریاض خیرآبادی، جناب جگر مرادآبادی، مولانا احسن مارہروی۔ مولانا سیماب اکبرآبادی۔ جناب فانی بدایونی وغیرہ مشاہیر اہل سخن کے علاوہ دوسرے خوش فکر شعراء اور یونیورسٹی کے طلبہ کا کلام بھی ہے اُردو اور فارسی غزلیات کے علاوہ "جذبۂ قومی" اور "عزت نفس" کے مقررہ عنوانات پر متعدد دلچسپ نظمیں بھی ہیں۔ شروع میں مولانا احسن کا ایک مختصر مقدمہ ہے جسمیں خصوصیت سے اسکول اور کالجوں کے مشاعروں کی غرض وغایت اور ترتیب وتنظیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکے بعد ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا دلچسپ تبصرہ ہے۔ اسمیں مشاعرہ کی پوری کارروائی کا نقشہ ایسے دلکش انداز میں کھینچا ہے کہ واقعات کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ضمناً بعض ایسے رموز ونکات بھی آگئے ہیں جو بہر آئینہ سبق آموز ہیں۔

ظہور رحمت

از مولانا شاد عظیم آبادی مرحوم۔ چھوٹی تقطیع۔ ۱۴۰ صفحات۔ قیمت ۸؍۔
ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت رحمانی۔ مہندرو۔ پٹنہ

مولانا شاد عظیم آبادی مرحوم ایک مسلم الثبوت سخنور واہل قلم تھے۔ نظم ونثر میں آپنے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں سے صرف چند طبع ہوئیں، باقی ہنوز مسودات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ انھیں میں سے پیش نظر منظوم میلادنامہ ہے جسکی بابت حضرت شاد مرحوم کے صاحبزادہ لکھتے ہیں کہ مولانا حالی وسرسید کی فرمائش پر یہ میلادنامہ خود مصنف نے علی گڈھ میں پڑھا تھا اور داد سخنوری حاصل کی تھی۔

یہ میلادنامہ ایک مسدس ہے۔ شروع میں ایام جاہلیت میں عرب کی جو حالت تھی اُسکا ذکر کیا ہے پھر پیغمبر اسلام کی پیدائش۔ بعثت، آپ کی سیرت مبارک اور معراج کا تذکرہ ہے۔ ہر ذکر سے پہلے بطور ساقی نامہ چند بند ہیں جن سے حسن کلام اور بھی چمک اُٹھا ہے۔ پوری نظم سلاست وروانی اور اثر کا مرقع ہے۔ اہل اسلام کے لئے ایک عمدہ تحفہ اور مطالعہ کے لائق ہے۔

ہند کے جاں نثار از منشی سورج نراین ماتھر بی۔اے۔ایل۔ٹی۔ دستی تقطیع ۔ ۲۱۰ صفحات۔ مجلد قیمت ۱۰؍ ۔ ملنے کا پتہ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروال پبلشر الہ آباد

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں ہندوستان کے قدیم و جدید سربرآوردہ اشخاص کا ذکر ہے۔ رامائن۔ مہابھارت کے قصّے۔ چندر گپت۔ بکرماجیت۔ پرتھی راج وغیرہ راجاؤں کے حالات۔ محمود۔ بابر اکبر وغیرہ بادشاہوں کے سوانح حیات اور اُن کے درباریوں کا ذکر، راجہ رام موہن رائے۔ دادا بھائی نوروجی وغیرہ قومی کارکنوں کا تذکرہ، ملکہ وکٹوریہ آنجہانی اور شہنشاہ جارج پنجم کے حالات سادہ سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب پانچویں جماعت کے طالب علموں کے مطالعہ کے لئے مرتب کی گئی ہے اس لئے ہر بیان کے آخر میں اُسکے متعلق چند سوالات بھی دیئے ہیں۔ اُمید ہے کہ طالب علموں کو اسکے مطالعہ سے بہت فائدہ پہنچے گا۔

فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور کی مطبوعات

فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور کے مالک مولوی فیروز الدین نے ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے بعض شاہان و رہنمایان ہند کے مختصر حالات کا ایک دلچسپ سلسلہ شائع کیا ہے۔ طلباء کو عام اخلاقی اُصُول سمجھانے کے لئے اس کارخانے نے قصّہ کے پیرایہ میں مختصر مضامین کا ایک دوسرا سلسلہ بھی شائع کیا ہے۔ اسوقت ان دونوں سلسلوں کی مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے سامنے ہیں جن کے سرسری مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹے بچوں کے لئے یہ کتابیں مفید ہیں۔

ظہیر الدین بابر اسمیں سلطنت مغلیہ کے بانی شاہ بابر کے ابتدائی حالات زندگی۔ ہندوستان پر حملہ اور فتوحات، سلطنت کا قیام اور اخلاق و عادات کا مختصر ذکر ہے۔ قیمت ۴؍

اکبر اعظم شہنشاہ ہند اکبر کے ذاتی حالات کے علاوہ اس کے دربار کے عام حالات، نظم و نسق سلطنت اور بعض امرائے دربار کے حالات بھی اسمیں ہیں۔ قیمت ۴؍

نادر شاہ اسمیں نادر شاہ کے سوانح حیات، ہندوستان پر حملہ اور اسکے اخلاق و عادات کا ذکر ہے۔ قیمت ۴؍

لیڈران ہند یہ بعض مشاہیر رہنمایان ہند مثلاً مولانا حالی۔ سر سید۔ مہاتما گاندھی۔ سوامی دیانند سرستی،

وغیرہ کے مختصر حالات اور انکے قومی کاموں کا مرقع ہے۔ قیمت ۸ر

دبستان اخلاق (تین حصے) یہ اخلاقی مضامین کا ایک سلسلہ ہے جسمیں عام اخلاقی اُصول قصّوں کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور مناسب موقع متعدد تصاویر سے اسکو دلچسپ بنایا گیا ہے۔ قیمت ہر سہ حصہ علی الترتیب ۴ر ۲۔ ۵ر ۳۔ ۶ر ۲ پائی ہے

ان تمام کتابوں کی زبان نہایت سلیس و سادہ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بچوں ہی کی زبان ہے معمولی اُردو خواں طلبہ ان کو آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔

---

(۱) دی تھری اسکول فیلوز 1. The Three Sohool Fellows.

(۲) ہارون الرشید اینڈ ہز کورٹ 2. Harunur Rashid & his Court

(۳) شارٹ اسٹوریز اباؤٹ عمر دی سکینڈ خلیفہ 3. Short Stories about Omar.

یہ تینوں کتابیں انگریزی زبان میں میکملن کمپنی نے بچوں کے لئے شائع کی ہیں، انمیں دلچسپ وسبق آموز کہانیاں ہیں جو نہایت آسان زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مزید دلچسپی کے لئے انمیں جا بجا تصویریں بھی درج ہیں تینوں کتابوں کا ٹائپ بڑا اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔

تیسری کتاب دوسرے درجے کے لڑکوں کیلئے ہے، حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کی زندگی کے کئی نصیحت آمیز واقعات قصے کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ حجم صفحات ۶۶ قیمت ۴ر

نمبر ۲ کے مصنف جناب ماسوانی ایم۔ اے ہیں انہوں نے یہ کتاب تیسرے درجے کے طلباء کے لئے لکھی ہے اسکی زبان تیسری کتاب سے کچھ مشکل ہے، اسمیں مصنف نے خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ شاہزادگی و خلافت کے مختلف قصے بیان کئے ہیں جو چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے بہت مفید ہیں، اس کا حجم صفحات ۸۰ قیمت ۴ر

۱ کے مصنف بھی جناب ماسوانی ہیں، یہ کتاب چوتھے درجے کے طلباء کے لئے مقصود ہے اور مذکورہ بالا کتاب سے کسیقدر مشکل ہے اسمیں نظام الملک، حسن بن صباح اور عمر خیام، تین دوستوں کے قصے درج ہیں۔ حجم صفحات ۴۲ قیمت ۴ر

آزادی

(از مسٹر شیام موہن لال جگر بریلوی - بی - اے)

تو کیا شے ہے اے آزادی — تیرے غم نے آفت ڈھا دی
دیکھی نہیں ہے صورت تیری — پھر بھی ہے یہ حالت میری
تیرے نام کا شیدائی ہوں — تیری دید کا سودائی ہوں
غم سے جگر ہے پارہ پارہ — دل ہے بیتاب نظارہ
آنکھ سے سیل اشک رواں ہے — ہر دم لب پر آہ و فغاں ہے
نام ترا جب میں سنتا ہوں — بیتابانہ سر دھنتا ہوں
اپنی کہانی کس کو سناؤں — کس کو داغ سینہ دکھاؤں
کوئی میرا یار نہیں ہے — ہمدرد و غمخوار نہیں ہے
آنکھ کھلی صیاد کے گھر میں — دہر قفس ہے میری نظر میں
آہ بہار چمن کیا جانوں — میں لطف گلشن کیا جانوں
یاد بھی مجھ کو اب نہیں آتا — تھا بھی نشیمن یا کہ نہیں تھا
نشو و نما ہونے نہیں پائی — پیدا ہوتے ہی موت سی آئی
غنچۂ خاطر کھل نہ سکا اُف — سعی کا ساماں مل نہ سکا اُف
مجھ کو ملے تھے جتنے جو ہر — رہ گئے دل کے دل میں دبکر
جب ذوق پرواز دیا تھا — یارب کیوں پابند کیا تھا
گر یہ پر پرواز نہ ہوتا — تو پرواز کو میں کیوں روتا
زہر ہوا ہے رنج اسیری — حد سے گزری بے توقیری
کوئی نہ پوچھے میں اب کیا ہوں — اُف زندہ درگور ہوا ہوں
خون ہوا ہے دل سینے میں — اب کیا رکھا ہے جینے میں

اک اک پل بھاری ہے جینا — جینا خونِ جگر ہے پینا
عالم میں بیکار سی شے ہوں — خُم میں گویا دردِ مے ہوں
میرا وجود ہے بارِ ہستی، — جیتا رہنا عار ہے ہستی
رونا میرا ننگِ دیدہ ہے — دستِ دعا ہے دستِ بریدہ
جوشِ عشق فریبِ دل ہے — میرا عہد وفا باطل ہے
نقشِ سجدہ داغ جبیں ہے — میری عبادت دشمنِ دیں ہے
عشق ہے حیرت کا طالب — ذوقِ عمل وسعت کا طالب
جو آزاد ہیں شاد وہی ہیں — شاد وہی آباد وہی ہیں
عاشق وہ ہیں عامل وہ ہیں — ہر پہلو سے کامل وہ ہیں
عیش اُنکا آرام اُنکا ہے — ہستی اُن کی نام اُنکا ہے
مالک اس دنیا کے وہ ہیں — بندے اپنے خدا کے وہ ہیں
اے آزادی تو کیا شے ہے — میں تو زندانی ہوں ہے ہے
تیرا راز جنھوں نے جانا — کہتے ہیں وہ عاقل و دانا
تو عالم کی روح رواں ہے — بزمِ فنا کی شمع جاں ہے
جب تو نے صورت دکھلائی — شمس و قمر میں گردش آئی،
رودِ آب رواں ہے تجھ سے — موجِ بادِ دواں ہے تجھ سے
تجھ سے نشو و نما ہے بن میں — جوشِ گل صحن گلشن میں
سازوں میں آواز ہے تجھ سے — چڑیوں میں پرواز ہے تجھ سے
تجھ سے خون تن میں روانی — تجھ سے دل میں جوشِ جوانی
دام میں پروانہ گر ہوتا — شمع سے واصل کیونکر ہوتا
گر دیندار آزاد نہ ہوتے — دیر و حرم آباد نہ ہوتے
عشق و دین و مذہب تجھ سے — دُنیا عقبےٰ ہے سب تجھ سے
کہتے ہیں لیکن یہ بھی مُبصّر — کرتی ہے گمراہ تو اکثر
زہر بھی ہے کچھ جام میں تیرے — دھوکا بھی ہے نام میں تیرے
مطلق آزادی تو جنوں ہے — عقل کا کھونا کارِ زبوں ہے

یہ مانا آزاد ہے عالم
لیکن دیکھیں غور سے گر ہم

پابند آئینِ قدرت
ہیں سارے اجزائے فطرت

انجم و ماہ و مہرِ اعظم
ہیں پابندِ جذبِ باہم

جذبِ باہم ربطِ جہاں ہے
نظمِ عالم کا ساماں ہے

جو ہے کشش اس نظمِ جہاں میں
ہے اخلاق وہی انساں میں

اس آزادی کو رد تا ہوں
جب میں بہت بیکل ہوتا ہوں

گلشن میں آزاد رہوں میں
بے خوفِ صیاد رہوں میں

پابند اخلاق و محبت
ہو میرا ہر جزو طبیعت

عشقِ گلشن روحِ رواں ہو
کارِ وفا ایمانِ جاں ہو

ولہٗ

محرومیوں کا کس لئے شکوا کرے کوئی
کیا فرض ہے کسی کی تمنا کرے کوئی

سامانِ مرگ پہلے مہیا کرے کوئی
اُسوقت زندگی کی تمنا کرے کوئی

کیوں فکرِ چارہ ساز ہے کیوں سعیٔ اندمال
سینے میں پہلے زخم تو پیدا کرے کوئی

جس کے لئے پیا ہے یہ زہرِ آبِ حیات
نامہرباں وہی ہو تو پھر کیا کرے کوئی

ہے ضبطِ غم میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
راہِ وفا اب اور ہی پیدا کرے کوئی

آخر ہے امتحانِ وفا کی بھی حد کہیں
تا چند موت کی نہ تمنا کرے کوئی

مانا کہ نالۂ غمِ اُلفت گناہ ہے
جب دل میں تابِ ضبط نہو کیا کرے کوئی

ہر سانس دے رہی ہے خبر انقلاب کی
کیا ایسی زندگی پہ بھروسا کرے کوئی

آنکھوں سے اپنی خون بہائینگے ہم جگر
کیوں ہم سے ذکرِ ساغرِ صہبا کرے کوئی

آرزوئے صادق

(از منشی بشیشر پرشاد صاحب منوّر لکھنوی)

نہ کام آئے کسی کے اگر حیات مری اگر ہو ننگ خلائق جہاں میں ذات مری
اگر مجھے روش ارتقا پسند نہ ہو مرے وجود کا معیار اگر بلند نہ ہو
مرا اُصول جو دنیا میں شاندار نہ ہو مرا سلوک جو دنیا کو سازگار نہ ہو
مرے عمل میں جو صدق و صفا کا نام نہ ہو جو میری ذات میں وسعت کا اہتمام نہ ہو
زبان و دل میں ہو باہم مطابقت نہ اگر ہو قول و فعل میں میرے موافقت نہ اگر
جو کام لے نہ سکوں میں کبھی محبت سے مفاد غیر پہ جاں دے سکوں نہ ہمت سے
اگر نہ ہو دل وحدت شناس سینہ میں جو نور حق کا نہ ہو انعکاس سینہ میں
جو میری عمر گزرتی ہو خود پرستی میں گرا رہا ہوں اگر روح کو میں پستی میں

متاع حیات ہو برباد میری ہستی کی
گھٹا دے شوق سے میعاد میری ہستی کی

جو ماہ و سال بچیں گھٹ کے اسطرح فاضل جو اس حساب سے باقی ہو کچھ تجھے حاصل
وہ اُس وجود کی میعاد میں بڑھا دینا وہ اُس حیات کی توسیع میں لگا دینا
جو سوئے ملک عدم مائل عزیمت ہو مگر قیام کی جس کے بڑی ضرورت ہو
ہزار کام بگڑتے ہوں جسکے مرنے سے ہو ایک حشر بپا جسکے کوچ کرنے سے
علوئے مقصد ہستی ہو منتہا جسکا ہو قدر گوہر جاں سے دل آشنا جسکا،
بہائے جوہر ایثار سے جو واقف ہو کشاد روح کے معیار سے جو واقف ہو
ہو قول جسکا مقدس عمل ہو جسکا پاک ہو نا تمامیٔ مقصد سے جسکا سینہ چاک
اجل پہ جسکی اجل دل ہی دلمیں پچھتائے سر اپنا ہر کہ و مہ کوہ غم سے ٹکرائے

بقا سے جسکی ہو وابستہ سینکڑوں کا وجود
فنا سے جسکی ہوں آثار زندگی نابود

ہمارا شاعر

از جناب انیس احمد شرقی (کانپور)

مانا کہ نقش سادہ یکسر مرا بیاں ہے
عبرت کا اک مرقع لیکن یہ داستاں ہے

دنیا بدل چکی ہے، شاعر مگر ہمارا
اگلی روایتوں کا اب تک نگاہباں ہے

ہے عشق یا ہوس تک محدود اسکی دنیا
یا شکوۂ بتاں ہے یا جور آسماں ہے

ڈستی ہے اسکو اکثر زلف سیہ کی ناگن
تیر نگاہِ جاناں دلدوز و جانستاں ہے

شیریں و کوہکن کا زندہ ہے نام اس سے
لیلیٰ و قیس کا یہ اب تک فسانہ خواں ہے

پروانہ - شمع - بلبل - گل سرو اور قمری
ان سب کا رازداں ہے ان سب کا ہمزباں ہے

روشن ہیں اسکے دلمیں آتشکدے ہزاروں
یہ آسماں اسی کی آہوں کا تو دھواں ہے

آنکھوں سے اسکی خوں کے دریا اُبل رہے ہیں
آتش زن دو عالم آہ شرر فشاں ہے

اسکے سوا نہیں کچھ دن رات کے مشاغل
اختر شماریاں ہیں یا نالہ و فغاں ہے

اظہار عشق بھی ہے شکوہ بھی ہے بتوں کا
کیا خوب عاشقی ہے، کیا خوب داستاں ہے

شمشیر اُنکی چتون ناوک نگاہ اُن کی
دل صید ہو رہا ہے یہ مرگ ناگہاں ہے

ہنگام نزع کوئی بالیں پر آگیا ہے،
اب عشق اور اجل کی قوت کا امتحاں ہے

جینا محال لیکن مرنا محال تر ہے
اک کشمکش میں جان بیمار ناتواں ہے

وہ بیوفا ستمگر میت پہ بھی نہ آیا
لرزاں ہے قبر، برپا ہنگامۂ فغاں ہے

مرقد سے بولتا ہے یہ بعدِ مرگ اکثر،
اُلفت کی یہ علامت، چاہت کا یہ نشاں ہے

میدان حشر کا ہے، یہ آخری ہے منظر،
گویا کہ ختم اِس جا، دنیا کی داستاں ہے

ترتیب لفظ و معنی بے ربط، بندشیں سُست
دعویٰ مگر یہی ہے "شُستہ یہی زباں ہے"

اک دوسرے سے کہنا "واللہ کیا کہا ہے"
کہنا ہی اِس کا کیا ہے، توبہ ہے الاماں ہے

بد ذوقیوں کی آخر کچھ حد و انتہا بھی،
اے فطرتِ حقیقی تو کس لئے نہاں ہے

اس شاعری سے آخر کیا فائدہ ہے شرقی
سچ پوچھئے تو یکسر اوقات کا زیاں ہے

اے کاش کوئی اتنا ان گمرہوں سے کہدے
شاعر جو واقعی ہے فطرت کا رازداں ہے

لطفِ سخن

پروفیسر ناشاد کھوسلہ ایم۔اے۔

ل کو فروغ ہے اگر مائل انکسار ہو
سر کو فراز ہے تبھی قدموں پہ جب نثار ہو

ل ہو فدائے جستجو جان ہو وقفِ آرزو
ہستی کا مدعا یہی صدقۂ شوقِ یار ہو

شق میں حسن ہو نہاں حسن میں عشق ہو نہاں
پھولوں میں جسطرح نہاں حسن رخ بہار ہو

شنہ لبوں کے سامنے ساغرِ دل تو پیش کر
بزم جہاں میں اے بشر ساقیٔ غمگسار ہو

شق کی آرزو یہی حسن کی آبرو یہی
تیرِ نگاہِ ناز سے سینہ اگر نگار ہو

شوق وہی ہو رات دن دلمیں وہی ہو آرزو
صبح سے شام تک وہی چشم کو انتظار ہو

ہرتا جو دم ہے عشق کا پہلے خودی کو لے مٹا
یار پہ اپنے پھر فدا شوق سے بار بار ہو

یرا ہے دامنِ مراد مقصد زندگی یہی
پاس وجنوں کے ہاتھ سے شوق میں تار تار ہو

نخلِ مراد دہر میں ہوتا ہے بارور تبھی
کشتِ اُمیدِ دل اگر خون سے لالہ زار ہو

لطفِ وصالِ یار کیا اسکو نصیب ہو بھلا
کوچۂ عشق میں ہوا جو نہ ذلیل وخوار ہو

شق کو ناز ہے یہی وصل کا راز ہے یہی
مٹ کے رہِ نیاز میں خاکِ درِ نگار ہو

حضرت فرّخ بنارسی

سی کا بیخودی میں زینتِ آغوش ہو جانا
کمال محویت ہے بے نیاز ہوش ہو جانا

مآلِ ذوقِ نظارہ تحیر کے سوا کیا تھا
نقاب رخ اُدھر اُٹھنا ادھر بے ہوش ہو جانا

پہنچنے کو ہے ہم تک دور بزمِ ناز ساقی میں
ذرا تند اور بھی اے بادۂ سرجوش ہو جانا

اسی کو اصطلاح عشق میں عرفان کہتے ہیں
خودی کا ترک ہونا بےخودی کا جوش ہو جانا

ہم نظارہ ذوقِ دید کو پیغام مستی ہے
نگاہ ناز کا صد میکدہ بردوش ہو جانا

ال خودنما کا دعوتِ ذوق طلب دینا
دو عالم کا سمٹ کر حلقۂ آغوش ہو جانا

وہ میرا شکوۂ بیداد کرنا اُنسے محشر میں — وہ انکا سر جھکا کر شرم سے خاموش ہو جانا
جمال یار خود بیتاب ذوق گرم جوشی ہے — مجھے اے دل مگر آتا نہیں آغوش ہو جانا
خمار آموز غفلت ہے سرور بادۂ ہستی
اجل کیا چیز ہے فرط تمنا کا ہوش ہو جانا

جناب ممتاز علی آہ

کرم کر گئی اک نگاہ محبت، — بتا دی خضر بنکے راہ محبت
مرے حال پر کوئی رونے لگا کیوں — کہ مجھ سے ہوا ہے گناہ محبت
ستمگر زمانہ اب اپنی خبر لے — مجھے مل گئی ہے پناہ محبت
یہاں حسن کو ہوتے رہتے ہیں سجدے — دل آہ ہے خانقاہ محبت

ازل ہی سے ہوں میں خراب محبت — مزہ دیگئی ہے شراب محبت
ادھر عشق مجبور اُدھر حسن ظالم — کہوں کیا ملا کیا جواب محبت
کہیں راز دل آنہ جائے لبوں تک — بہت جوش پر ہے شباب محبت
دل و جان و ایماں رہے وقف دنیا — وہاں دونگا کیا میں حساب محبت
یہ ہلچل جو رہتی ہے دونوں جہاں میں — ہر اک شے میں ہے اضطراب محبت
نگاہ عنایت جو کی ہو کے نادم، — ہوا داغ دل آفتاب محبت
محبت کہاں تم کہاں آہ صاحب
کہیں دیکھتے ہو گے خواب محبت

جناب ساغر (دیال باغ)

جھومتے مست ہیں بیٹھے ہوئے میخانوں میں — ساقیا دیکھکے صورت تری پیمانوں میں
نہ رہا قیس نہ لیلی نہ محبت وہ رہی — ذکر ہی ذکر فقط رہ گیا افسانوں میں
ڈھونڈئیے جاکے کہاں کیجئے سجدہ کیونکر — جبکہ ملتا نہیں اللہ مسلمانوں میں

انتخاب آل انڈیا مشاعرہ (کانپور)

غربت میں ہمنفس ہے کوئی نہ ہمزباں ہے — کنج قفس ہے میں ہوں اور یاد آشیاں ہے
مشکل ہے خود مجھی کو اپنی مزاج دانی — پستی میں دل زمیں ہے رفعت میں آسماں ہے
مانند شمع محفل سوز جگر ہے لب پر — میری زبان دل ہے دل ہی مری زباں ہے

صفی لکھنوی

عاشق مزاجیوں میں راحت مجھے کہاں ہے — پھولوں کا ہمنشیں ہوں کانٹوں میں آشیاں ہے
اے شمع تو کہے جا سب سرگزشت میری — یہ کون جانتا ہے کس کی یہ داستاں ہے
ملزم نہ حسن اُنکا ثابت نہ عشق میرا — ہر تیر بے کماں ہے ہر زخم بے نشاں ہے

ناطق لکھنوی

کیا درد دل چھپاؤں ہر موئے تن زباں ہے — خاموشیوں کی دنیا آمادۂ فغاں ہے
ناواقف طریقت الزام دے رہے ہیں — لے قوتِ تحمل یہ وقت امتحاں ہے

بہار لکھنوی

تو کسکی جستجو میں گم گشتہ کارواں ہے — بھولے ہوئے مسافر منزل تری کہاں ہے
کب تک پڑا رہیگا اے کافر محبت — دیر و حرم سے آگے اُس بُت کا آستاں ہے

بیخود اٹاوی

مرنے کے حوصلے بھی لیتی گئی جوانی — مرنا تو پھر مسلّم لیکن مزا کہاں ہے
اک راز ہے شہادت حق کے فدائیوں کی — فطرت ہی ممتحن تھی فطرت ہی نوحہ خواں ہے

رعنا لکھنوی

تیرے فراق کا ہے اک نام زندگی بھی — جو سانس آرہی ہے منجملۂ فغاں ہے
ہستی میں اور عدم میں کچھ فرق ہے تو اتنا — اک ہے تری کہانی اک میری داستاں ہے

سراج لکھنوی

دے بھی دیا کسی نے کر تو کیا تعجب — جب دل سکون جاں تھا اب دل بلائے جاں ہے
دنیا کی سو بلائیں آئیں مجھے غرض کیا — میری بہار ہستی پروردۂ خزاں ہے

وصل بلگرامی

لارڈ ارون کا اعلان
اور چند واقعات

لارڈ ارون کا اعلان اپنی تاریخ اشاعت سے لیکر آجتک ہندوستانی مدبروں میں ایک بحث طلب مسئلہ بنا ہوا ہے۔ شروع نومبر میں جس کشادہ دلی سے ملک میں اسکا خیر مقدم ہوا، اسکی نظیر سالہا سال کے اندر نہیں ملسکتی لیکن یہ گرمجوشی عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ پارلیمنٹری مباحثات خصوصاً دارالامراء برطانیہ کی تقریروں نے ہندوستانیوں کے جوش کو بہت کم کر دیا ہے اور ملک کی ایک بہت بڑی جماعت اسکو بھی ایک دھوکہ کی کارروائی یا ابلہ فریبی کی چال سمجھنے لگی ہے۔ اسی پرچے میں ایک فاضل مضمون نگار نے اس اعلان کے متعلق لیڈران کے رویہ کی نکتہ چینی کی ہے۔ یہ مضمون کانگریس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے لیکن کانگریس کے نقطۂ خیال کا پورا عکس اسمیں موجود ہے ہماری رائے میں کانگریس نے اسکے متعلق غلط رہنمائی کی ہے در حقیقت اسکے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کیلئے ہمکو گرمجوشی اور بداعتقادی دونوں سے علیحدہ ہوکر گردوپیش کے حالات اور واقعات کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ بات ہر اہل ملک کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ پارلیمنٹ کی موجودگی میں اعلیٰ ترین برطانوی حکام بھی پارلیمنٹری ایکٹ اور رزولیوشن کو رد کرنیکا اختیار نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ حقیقت بھی ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ اسوقت پارلیمنٹ میں کسی پارٹی کی قطعی کثرت موجود نہیں ہے۔ چنانچہ موجودہ مزدور گورنمنٹ کی زندگی مخالف پارٹیوں کے رحم و ہمدردی پر منحصر ہے، آج اگر اسکے حریف و مخالف گروہ یعنی لبرل اور کنسرویٹو طبقہ کے ممبران پارلیمنٹ متفقہ طور پر موجودہ گورنمنٹ کے خلاف ہوجائیں تو مسٹر رامزے میکڈانلڈ اور اُنکے رفقاء کو مستعفی ہونیکے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ رہے۔

ہندوستانی قوم پرستوں کو اسوقت چند مشکلات سے بھی سامنا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم ان نفاق باہمی سے قطع نظر کرکے جو ازل سے ہماری بدقسمتی کا باعث ہے ہم صرف ان سیاسی دشواریوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو کم از کم اسوقت ہندوستانی مطالبات کے منظوری میں سنگ راہ ہیں، سائمن کمیشن کی تقرری کے وقت انگلستان میں کنسرویٹو پارٹی کی حکومت تھی، مسٹر بالڈون وزیر اعظم اور لارڈ برکنہیڈ وزیر ہند تھے۔ ان حضرات نے ہی قابل اعتراض کمیشن کی تقرری کے وقت آیندہ پیشبندی کے طور پر انگلستان کے تینوں پولٹیکل پارٹیوں سے باہمی مشورہ کر لیا تھا۔ تاکہ ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت کے متعلق پارلیمنٹ میں پارٹی لائن پر کوئی مخالفت

نہ ہوسکے۔ اِسطرح سائمن کمیشن میں مزدور پارٹی کی بھی جو آجکل برسر حکومت ہے شرکت ہے، اور ضابطہ کی حیثیت سے موجودہ وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ اس کمیشن کی تقرری کے اُسیطرح ذمہدار ہیں جسطرح مسٹر بالڈون جنھوں نے اسے مقرر کیا تھا۔ اس اثنا میں ہندوستان نے تو سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا اور انگلستان میں وزارت میں تبدیلی ہوگئی اور موجودہ وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ ہیں جو پہلے ہی سے مشہور خیر خواہ ہندوستان ہیں، اس ملک کا دورہ کر چکے ہیں۔ اور ہندوستانی مدبروں سے بذاتی طور پر واقف ہیں۔ ہمارے حالات کا عینی مشاہدہ اور کانگرس سے علانیہ اظہار ہمدردی کر چکے ہیں بلکہ ایک دفعہ کانگریس کی صدارت کے لئے بھی نامزد ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ وائسرائے لارڈ اروِن بالقابہ کنسرویٹو جماعت کے ایک معزز ترین رکن اور مسٹر بالڈون کے ذاتی دوست ہیں۔ انکی دیانت اور قابلیت دونوں کا اہل انگلستان پر سکہ بیٹھا ہوا ہے، اپنی پارٹی میں جو عزت انھیں حاصل ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے، مزاج سے بھی لارڈ اروِن ہمدرد خلائق واقع ہوئے ہیں۔ سائمن کمیشن کے سلسلے میں انھیں ملک کے اصلی جذبات کا پتہ مل گیا ہے اور وہ موجودہ حالت کو ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے قابل اطمینان نہیں سمجھ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود بہ نفس نفیس انگلستان تشریف لے گئے اور وزراء سلطنت اور دیگر رہنمایان انگلستان سے تبادلۂ خیالات کرکے چند تجاویز طے کرکے واپس آگئے ہیں۔ ان تجاویز کو آپنے اپنے اعلان میں مفصل بیان کیا ہے جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے گورنمنٹ ہند اور وزراء سلطنت نے اس بات کو صاف و صریح طور پر واضح کر دیا ہے کہ ۱۹۱۷ء کے اعلان اور ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان میں بالآخر برطانوی نو آبادیوں کے طرز کی حکومت خود اختیاری قائم ہوگی جسمیں تمام ملکی معاملات میں ہندوستان کو اپنے مرضی بموجب عمل کرنیکی قطعی آزادی ہوگی اور انگلستان اور ہندوستان دونوں کی قانونی حیثیت برابر اور مساویانہ رہیگی۔ اس صاف بیان کی اس وجہ سے اور بھی ضرورت تھی کہ ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے سر مالکم ہیلی نے (جو اُسوقت ہوم ممبر تھے) لیجسلیٹو اسمبلی میں ذمہ دار حکومت اور نو آبادیوں کے طرز حکومت میں فرق بتلایا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ انگلستان کا وعدہ اس ملک کو صرف ذمہ دار حکومت دینے کا ہے نہ کہ برطانوی نو آبادیوں کے طرز کی حکومت خود اختیاری دینے کا، اب اس بیان کی تردید خود برٹش گورنمنٹ کے اعلیٰ ترین حکام نے کر دی ہے۔ پارلیمنٹ میں بعض مدبرین اسکے متعلق چاہے کچھ کہیں لیکن یہ اعلان اپنی جگہ پر قائم ہے اور رہیگا۔

دوسری بات جو اعلان سے حاصل ہوئی یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے آئندہ نظام حکومت کے متعلق خود اہل ہند کے قائمقاموں سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا مصمم وعدہ کر لیا ہے موجودہ وزیر اعظم، سائمن کمیشن کو برخاست نہیں کر سکتے۔ وہ خود اسکی تقرری میں شریک ہو چکے ہیں مگر لارڈ اروِن کی بدولت وہ اپنی غلطی اور

حقیقت حال دونوں سے بخوبی واقف ہوگئے ہیں اور اب ہندوستانی مطالبات کو حتی الامکان پورا کرنا چاہتے ہیں۔ آپنے اپنے حسن تدبیر سے سائمن کمیشن کو برخاست کئے بغیر اسکی تقرری کی اہم غلطی کی جو تلافی کرسکتے تھے کردی ہے۔ ہندوستانیوں کو ابھی تک اس سے پہلے حکومت برطانیہ سے مساویانہ حیثیت سے اپنے ملکی نظام سلطنت کے متعلق بحث و مباحثہ کا کوئی موقعہ نہیں ملا۔ آج گورنمنٹ برطانیہ نے ہندوستان سے سمجھوتہ کرنیکا ارادہ ظاہر کیا ہے اور آیندہ کے متعلق دل کھولکر بالمشافہ بات چیت کرنیکا موقعہ مل رہا ہے۔ کیا اس واقعہ پر ہمکو تہ دل سے خوش نہ ہونا چاہیئے۔ کیا یہ دعوت ہماری قوم پرستوں کی جدوجہد کے کامیابی کا ثبوت نہیں ہے۔ گو اسکا مشورہ سرجان سائمن ہی نے دیا ہو مگر اس اعلان سے سائمن کمیشن بالکل پس پشت پڑگیا۔

مجوزہ کانفرنس میں قائمقامان ملک کو سائمن کمیشن کی رپورٹ کو قطعی رد کرنیکا پورا اختیار ہوگا۔ انھیں اختیار ہوگا کہ جس اسکیم پر خود باہمی طور پر متفق ہوجائیں اسی کو برطانوی مدبروں کے روبرو پیش کریں اور اسکے سوائے کسی اور اسکیم کو منظور نہ کریں۔ برٹش وزرا نے اس معاملے میں انپر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے، بلکہ قائمقامان ہندوستان اگر چاہیں تو مطلق آزادی کا مطالبہ بھی اس کانفرنس میں پیش کرسکتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اسکی منظوری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہاں برطانوی نوآبادیوں کے طرز کی حکومت خود اختیاری دینے سے اب وزراء سلطنت کسی طرح انکار نہیں کرسکتے ہیں۔ وہ اس اعلان سے خود ایک بہت بڑی حد تک پابند ہوگئے ہیں۔ غرض گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ برطانیہ دونوں اس اعلان سے بندھ سے گئے ہیں یعنی کنسرویٹو وائسرائے اور لیبر پارٹی دونوں نوآبادیوں کے طرز کی حکومت کے مطالبہ میں ہمارے ہم نوا ہوگئے ہیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ وائسرائے کو اپنی پارٹی میں کیا پوزیشن حاصل ہے۔ اسکے لئے فقط اسقدر کہنا کافی ہونا چاہیئے کہ مسٹر بالڈون سابق وزیر اعظم اور موجودہ لیڈر کنسرویٹو پارٹی نے حال ہی میں پارلیمنٹری مباحثے کے دوران میں اس بات کو علی الاعلان کہا ہے کہ جس دن کنسرویٹو پارٹی لارڈ اروِن کا ساتھ چھوڑدیگی اُسی دن وہ اس پارٹی سے کوئی واسطہ نہ رکھیں گے۔

مسٹر بالڈون کی جو خط و کتابت موجودہ وزیر اعظم سے ہوئی ہے اس سے ہندوستانیوں کو بہت غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اس سے صرف کنسرویٹو پارٹی کے بعض ضدی ممبران کا رفع شک کرنا منظور تھا جو انھیں اس اعلان کی بدولت وائسرائے اور وزیر ہند سے پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں دونوں متفقہ طور پر پارلیمنٹ کو پس پشت ڈالکر کوئی خاص تبدیلی یہاں کے نظام سلطنت میں نہ کر بیٹھیں۔ لیکن اسوقت وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کا اتفاق رائے ہمارے لئے قران السعدین سے کم نہیں ہے۔ وزارت ہندوستان کے مسئلہ میں وزیر ہند سے متفق ہے اور وائسرائے کو ہمارے ملکی جذبات سے ہمدردی ہے۔ یہ ہمدردی ہمارے مطالبات کا کسقدر ساتھ دیسکے گی ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اتنا ضرور ہر شخص کو معلوم ہوجانا چاہیئے کہ لارڈ اروِن اور مسٹر ویجوڈ بن سے زیادہ پرجوش

ہمدرد ہمکو انگلستان کے ذمہ وار حلقوں میں اسوقت میسر نہیں ہیں ۱۸ دسمبر کے مباحثہ میں مسٹر بین نے ہمارے ملکی مباحثات سے اپنی دلی ہمدردی کا مزید ثبوت دیا ہے۔ البتہ وہ (اور انگلستان کی کوئی آئینی قوت) پارلیمنٹ کے اختیارات وحقوق میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کرسکتے ہیں اور ہندوستانی مدبروں اور برٹش وزراء سلطنت کے درمیان جو سمجھوتہ باہمی ہو پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر اسپر کوئی عملدرآمد نہیں ہوسکتا ہے۔ موجودہ حکام زیادہ سے زیادہ یہ وعدہ کرسکتے ہیں کہ جو سمجھوتہ باہمی ہوگا اسکو وہ پارلیمنٹ میں منظوری کیلئے بجنسہ پیش کرینگے اور یہ امید کیجاسکتی ہے کہ چند ممبران کی مخالفت کے باوجود پارلیمنٹ اس فیصلے کو منظور کریگی اور اسطرح نوآبادیوں کے طرز کی حکومت خود اختیاری ملنے میں زیادہ وقت نہ ہوگی اور انگلستان کے ساتھ ہمارے تعلقات حاکم ومحکوم ہونے کے بجائے افریقہ۔ کناڈا۔ آئرلینڈ وغیرہ کی طرح مساویانہ ہوجائیں گے۔ اس سے زیادہ ہمکو اس اعلان سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر غور کیجئے تو اس پُرامن طریقہ سے یہ موقع ملجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے پچھلے سال تک خود کانگریس کا مطالبہ بھی یہی مطالبہ تھا۔ کانگریس سوارج پارٹی نے اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر بارہا گول میز کانفرنس کا مطالبہ کیا۔ اب جب انگلستان نے اس مطالبہ کو منظور کرلیا ہے تو ہمارے مدبران کس منھ سے اسکو رد کرسکتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ۲۳ دسمبر کو مہاتما گاندھی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ سرتیج بہادر سپرو۔ مسٹر جناح اور مسٹر پٹیل سے اور وائسرائے سے کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن آنا سب کو معلوم ہے کہ مہاتما جی او نہرو صاحب کے خلاف سرتیج بہادر۔ مسٹر جناح اور مسٹر پٹیل اب بھی مجوزہ کانفرنس کے حامی ہیں، گاندھی جی کا یہ خیال بیان کیا جاتا ہے کہ اسوقت وہ ملک کی عام رائے کو اسقدر قوی نہیں سمجھتے ہیں جسکی وجہ سے گورنمنٹ ہمارے مطالبات کو چپ چاپ مان لینے پر مجبور ہو۔ اور وہ کانفرنس میں اُسوقت جانا چاہتے ہیں جب اہل ملک کو اسقدر قوت حاصل ہوجائے، اگر واقعی ایسا ہے تو اسمیں کچھ وقت درکار ہوگا۔ اور جہانتک ہم سمجھ سکتے ہیں یہ حالت جلد صرف دوہی طریقے سے پیدا ہوسکتی ہے یا تو ہندوستان انگلستان سے پورے طور پر عدم تعاون کرنیکا تہیہ کرکے حکومت کا کاروبار بالکل بند کردے یا میدان کارزار میں انگریزوں کو علانیہ اور قطعی شکست ہوجائے۔ ان دونوں باتوں کا زمانہ قریب میں کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے۔ تشدد سے تو مہاتما گاندھی کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اب ہا مخالفت مجہول کا معاملہ سو اسوقت اسکا کوئی خاص اسکیم سامنے نہیں ہے اور سنہ ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون کا کافی تجربہ ہوچکا ہے، اور جب اسکول۔ عدالت اور کونسل تینوں کا بائیکاٹ گورنمنٹ وقت کو معطل نہ کرسکا تو اب صرف کونسل کے بائیکاٹ سے کیا ہونا ہے خصوصًا جبکہ اہل رائے اصحاب میں اس بارہمیں اسقدر اختلاف رائے ہے اور بجا طور پر ہے ہم سمجھتے ہیں کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو ہمکو منظور کرلینا چاہیئے۔ اور جہانتک ممکن ہو ہند کے ملکی مسئلہ کو مصالحت باہمی سے طے کرنا چاہیئے۔ نوآبادیوں کے طرز کی حکومت میں ہمارے حقوق کا پورا تحفظ ہوجائے گا۔ اس سے ہمارے ملک کی قوت بھی قائم ہوجائیگی۔ صلح کی تمام راہیں ختم کرلینا چاہیئے اور اسوقت جب برٹش گورنمنٹ نے صلح کی گفتگو شروع کرنیکا خیال ظاہر کیا ہے تو اسکو رد نہ کرنا چاہیئے۔ وائسرائے کا اعلان

مسلمان ... [illegible]

علمی خبریں اور نوٹ

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کی سرپرستی میں جو علمی و ادبی کانفرنس دسمبر میں ہونیوالی تھی وہ اب ۱۱۔جنوری کو بمقام الہ آباد ہوگی، پروگرام حسب ذیل ہے:-

۱۔ عام جلسہ - ۱۱ جنوری ۳۰ء ۴ بجے سے ۶ بجے شام تک ہوگا۔

۲۔ شعبۂ اُردو اور ہندی کی بحث مباحثے ۱۲ جنوری ۳۰ء ۸ بجے صبح سے ۱۱ بجے دن تک اور ۲ بجے دن سے ۶ بجے شام تک ہونگے۔

۳۔ لیکچرز - ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ جنوری ۳۰ء کو ۶ بجے شام سے خاص خاص لکچر ہونگے۔

ہندوستانی اکیڈمی کی جانب سے مفید و کار آمد کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی بالقابہ کی معرکۃ الآرا کتاب "قرون وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی و اقتصادی حالات" اور اُردو کی ضروریات کے متعلق سید ضامن علی صاحب ایم۔اے، اُردو لکچرار الہ آباد یونیورسٹی کی رپورٹ شایع ہو چکی ہیں اور متعدد دوسری کتابیں مثلاً مغلوں سے پہلے عرب و ہندوستان کے تعلقات۔ مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر - ہندی شاعری۔ ترقی زراعت وغیرہ زیر طبع ہیں اور اُمید ہے کہ بہت جلد تیار ہو جائیں گی۔

منشی پریم چند بی۔اے کے دلچسپ مختصر افسانے اور مستقل ناول ہندوستان میں اسقدر مشہور و مقبول ہو چکے ہیں کہ اب ان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ حال میں آپکے دو اور جدید ناول "گوشۂ عافیت" اور "نرملا" بھی لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ چالیس چھوٹے چھوٹے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "پریم چالیسا" کے نام سے زیر طبع ہے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد (دکن) ہندوستان کے اُن چند علمی ادبی اداروں میں سے ہے جو ہمارے ادب کی ترویج و اشاعت میں معتد بہ حصّہ لے رہے ہیں۔ اسوقت تک کتبۂ مذکور کی جانب سے متعدد مفید و دلچسپ کتابیں مثلاً روح تنقید۔ جواہر کلیات نظیر۔ دکنی لغت۔ دکن میں اُردو۔ آثار الکرام وغیرہ شایع ہوکر ملک میں عام طور پر مقبول ہوچکی ہیں۔ اسی سلسلہ میں اُردو شہ پارے کے نام سے ایک مستقل تالیف تیار ہورہی ہے، جو تین جلدوں میں ہوگی۔ یہ اُردو کی ابتدائی تاریخ۔ اس دور کے مصنفوں کے حالات و کارنامے۔ قدیم غیر مانوس اور متروک الفاظ کی فرہنگ وغیرہ پر مشتمل ہوگی۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اُردو زبان کی تدریجی ترقی پر کافی روشنی پڑیگی اور یقیناً اُردو ادب کی ایک بہترین خدمت متصور ہوگی۔

آل انڈیا ہندی پرچارنی سبھا کے گزشتہ اجلاس میسور کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری نے ہندوستانی زبان کی ترقی و اصلاح کے متعلق بعض مفید و موثر تجاویز پیش کیں اور اس امر پر بھی خصوصیت سے زور دیا کہ ہندوستانیوں کو ذات پات کی تفریق اور مذہبی تعصب کو ترک کرکے ہندوستانی زبان کی تشکیل و ترویج میں متحدہ طور پر کوشش کرنی چاہئے۔ جدید علوم و فنون سے ہندوستانیوں کو روشناس کرانے اور ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے واسطے زبان میں جسقدر نئے الفاظ شامل کئے جائیں وہ کم ہیں۔ یہ الفاظ خواہ سنسکرت کے ہوں یا عربی کے مگر انکو اضافہ کرنے میں نیک نیتی سے کام لیا جائے۔ طرز تحریر کے متعلق آپکی رائے ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنا اپنا رسم الخط جاری رکھنے اور اسکو ترقی دینے کا حق حاصل ہے اور حامیان ہندی کی یہ خواہش کہ مسلمان فارسی رسم الخط کو ترک کرکے ہندی طرز تحریر اختیار کریں، نامناسب ہے نقصان وہ ہے مسلمانوں کے مذہبی روایات اور علوم و فنون اسی رسم الخط میں موجود ہیں۔ اُن سے ہندی رسم الخط اختیار کرنے کو کہنا گویا ان کو اپنے مذہبی و قومی علوم و فنون سے محروم ہوجانے کی ترغیب دینا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہندو اور مسلمان رسم الخط کی بحث کو بالائے طاق رکھکر صرف ایک عام ہندوستانی زبان بنانے کی سعی کریں اور دونوں قومیں ایک دوسرے کا رسم الخط سیکھیں تاکہ ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن اور علم و ادب سے واقف ہونے میں آسانی ہو اور آپس میں جو نفاق موجود ہے وہ اتفاق سے بدل جائے۔

انڈین پریس الہ آباد میں انگریزی۔ بنگالی۔ ہندی کے علاوہ اُردو زبان کا بھی ایک مستقل شعبہ قائم ہے جو وقتاً فوقتاً مفید کتابیں شایع کرتا رہتا ہے۔ حال ہی میں مندرجہ ذیل تین کتابیں شایع ہوئی ہیں جو طلباء کے

یں۔ ان کتابوں کی زبان سادہ ہے اور معمولی اُردو جاننے والے بچے انکو بخوبی پڑھ سکتے ہیں

(۱) داستانِ عجم۔ مولوی سید حامد علی صاحب حامد نے "شاہ نامۂ فردوسی" سے اخذ کر کے منوچہر، رستم اور افراسیاب کے قصّے عام فہم عبارت میں ترتیب دیئے ہیں۔

(۲) تحفۂ جاپان۔ از حضرت اصغر گونڈوی۔ قصّہ کے پیرایہ میں جاپان کے متعلق تمام ضروری باتیں اسمیں جمع کر دی گئی ہیں۔ جاپان کے تیوہار۔ کھیل۔ تعلیم۔ اخبارات۔ کریکٹر وغیرہ پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۱۰/

(۳) تحفۂ مصر و حبش۔ یہ بھی حضرت اصغر ہی کی تالیف ہے۔ مصر و حبش کی قدیم و جدید حالت۔ وہاں کے باشندوں کے عادات و خصائل۔ پیداوار وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں قیمت ۱۰/

یہ تینوں نو عمر بچوں کے مطالعہ کے لائق ہیں۔ ہر کتاب کا سرورق رنگین و خوشنما ہے۔ ہر کتاب میں متعدد تصاویر بھی ہیں جن سے ان کے ظاہری حسن میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ہر بچے کو ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقع دیا جانا چاہیئے۔

حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار لکھنؤ کی زیر ادارت ایک جدید رسالہ "جن" نامی جاری ہوا ہے اسکا مقصد "روحانیات" کی اصلیت و حقیقت کی جستجو کرنا اور عوام کو اُس سے آگاہ کرنا ہے۔ پہلا پرچہ اسوقت ہمارے سامنے ہے جسکے دیکھنے سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ آیندہ چلکر یہ رسالہ اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے میں ضرور مفید ہوگا۔

اس نمبر کیساتھ رسالہ زمانہ کی زندگی کا ستائیسواں سال ختم ہوتا ہے۔ آیندہ نمبر سے نئی جلد کا آغاز ہوگا، اگر تائید غیبی اور قدر شناسان رسالہ کی حوصلہ افزائی شاملِ حال رہی تو ہمکو اُمید ہے کہ آیندہ سال ہم ناظرین زمانہ کی ضیافت طبع کیلئے مزید سامان بہم پہونچا سکینگے۔ اسوقت رسالہ کی آمدنی سے اسکے مصارف بمشکل پورے ہو رہے ہیں۔ مزید دلچسپیوں کے اضافے میں مزید مصارف کی ضرورت ہے جو توسیع اشاعت کے محتاج ہیں، اس لئے ہم اپنے قدردان ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے دوست احباب سے بھی زمانہ کی خریداری کی سفارش کریں، تھوڑی سی کوشش میں ہر قدردان رسالہ کے ایک ایک دو دو خریدار دے سکتے ہیں جسکا اثر رسالہ کے محاسن ظاہری و باطنی پر نہایت ہی اچھا پڑیگا،

خدا کرے زمانہ و ناظرین کو سال نو مبارک ہو

حضرت مسیح اور ایک گنہگار عورت یہ تصویر حضرت مسیح کی زندگی کے ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہودیوں کے قانون میں بدکاری کی

سزائے سنگساری تھی تصویر میں جو عورت زمین پر سر جھکائے نادم و پشیمان ہو رہی ہے وہ اس قانون کی زد میں آگئی ہے چنانچہ لوگ اُسے معبد کے صحن تک گھسیٹ لائے ہیں۔ اُسکی پشت پر حکومت وقت کا سپاہی بلم لئے ہوئے کھڑا ہے اور چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر لیا ہے، ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہے ابھی لوگ اس سنگساری اس حشر لینے کو آمادہ و تیار ہیں۔ ایک دوسری عورت جو اتفاقاً ادھر آنکلی ہے اس گنہگار مجرمہ کو دیکھکر اور نفرت سے منہ پھیر کر جلدی سے مجمع سے باہر جا رہی ہے اور اپنے ساتھ اپنے معصوم بچے کو بھی ہاتھ پکڑے وہاں سے لیجانا چاہتی ہے جسکی طبیعت وہاں سے جانیکو نہیں چاہتی ہے۔ مجرم کو معبد کے دروازہ پر لانے سے یہودیوں کا ایک دوسرا مقصد حضرت مسیحؑ کو ذلیل کرنا بھی تھا اگر مسیحؑ اس بیکس عورت کی طرفداری کرتے تو یہودیوں کو یہ کہنے کا موقع ملجاتا کہ مسیحؑ گناہ کی طرفداری کرتے ہیں ورنہ اُنپر شقاوت و سنگدلی کا الزام تو وارد ہی ہوتا، لیکن نتیجہ اُنکی اُمیدوں کے خلاف ہوا۔ تصویر میں حضرت مسیحؑ عورت کے قریب مجمع کے بیچ میں کھڑے ہیں۔ داہنے بائیں ربی لوگ استادہ ہیں۔ جو شخص دنیا میں بالکل بے روزگار و بے گناہ ہو وہی اس مجرمہ کو سنگسار کرے۔ حضرت مسیحؑ کے اس ارشاد نے تمام مجمع کو آن واحد میں منتشر کر دیا۔

یہ تصویر ایک مشہور یورپین مصور کا شاہکار ہے۔ مجرمہ کی صورت و قباحت۔ سپاہی کی رعونت۔ حضرت مسیحؑ کا پُر سکون جلال، داہنے جانب کھڑے ہوئے ربی کی خشمگیں آنکھیں۔ ان سب پہلوؤں کو چابکدست مصور نے کس خوبی و کامیابی سے دکھایا ہے۔ ایک دوسری عورت اور اُسکے بچہ کو اس سین میں داخل کر کے واقف حقیقت مصور نے اپنے کمال فن کی تکمیل کر دی ہے۔

اطلاع ضروری

جن صاحبوں کی خریداری ماہ جنوری سے شروع ہوتی ہے انکا حساب اس نمبر کیساتھ ختم ہوگیا اور آیندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے لہذا گذارش ہے کہ ایسے سب اصحاب اس نمبر کے پہنچنے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر زمانہ کا سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماویں ورنہ جنوری ۱۹۲۹ء کا پرچہ سالانہ قیمت کیلئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ وی۔پی۔ ارسال ہوگا۔ بذریعہ منی آرڈر زمانہ کی قیمت ۵ روپیہ بھیجی جاسکتی ہے لیکن قیمت طلب ویلیو پی ایبل پیکٹ میں ناظرین کو چار آنہ بابت رجسٹری و فیس منی آرڈر دینا ہونگے۔

منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ اور جہانتک ممکن ہو اپنا نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں جن صاحبوں کو آیندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو وہ براہ کرم فوراً اطلاع دیدیں تاکہ آیندہ اُنکی خدمت میں رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب (وی۔پی۔) پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر ہذا مزید نقصان سے محفوظ رہے جنوری ۱۹۳۰ء کا پرچہ ایک ہفتہ میں شایع ہو جائے گا

منیجر زمانہ